ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

کی بہترین تحریریں

مرتب: سید قاسم محمود



بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی سیدنا محمد النبی

الامی وعلی الہ وصحبہ وبارک وسلم

افضل الصلوٰۃ ۹۱

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

کی

بہترین تحریریں

مرتب: سیّد قاسم محمود

بیکن بُکس



• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030
• گلگشت کالونی، ملتان فون: 061-6520790-6520791
E-mail: info@beaconbooks.com.pk
Web: www.beaconbooks.com.pk

اشاعت : 2013ء

عبدالجبار نے

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور

سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور

سے شائع کی۔

قیمت : -/450 روپے

ISBN : 969 - 534 - 018 - 0

روحِ انتخاب

حصہ اوّل

تذکار حمید اللہؒ

صفحہ نمبر

حصہ دوم

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی تحریروں کا انتخاب

صفحہ نمبر

حصہ اوّل

تذکار حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ

پیش لفظ

یہ ٹھیک ترپن سال پہلے کی بات ہے۔ 1951ء کے اوائل کا قصہ ہے۔ مجھے یاد ہے ذرا ذرا۔ ڈاکٹر بشارت علی نے مجھ سے کہا: "ڈاکٹر حمیداللہ یورپ واپس جارہے ہیں۔ میں اُن کو الوداع کہنے کے لیے دو تین روز کے لیے کراچی جارہا ہوں۔ تم دفتر کے بعد روزانہ گھر آ کر سویا کرو، اور میرے آنے تک لاسکی کے تمام اقتباسات نقل کرلو"۔

ڈاکٹر حمیداللہ اور ڈاکٹر بشارت علی دونوں جامعۂ عثمانیہ کی مادرِ علمی کی آغوش میں پلے ہوئے، ایسی دو صاف اور پاکیزہ ہستیاں ہیں، جن کی عظمت کا چاند مستقبل میں طلوع ہوگا۔ ابھی اُن کے نام اور کام اُن کی خاموش طبیعت کے پیچھے پردۂ اخفا میں ہیں۔ حمیداللہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق کی راہوں میں گم ہو گئے اور بشارت علی قرآنی عمرانیات کی گتھیاں سلجھانے بیٹھ گئے۔ جن دنوں کی میں بات کررہا ہوں، ڈاکٹر بشارت علی قریشی حکومت پنجاب کی قائم کردہ "مجلس زبانِ دفتری" میں تین سینئر مترجمین میں سے ایک تھے اور میں چھ جونیئر مترجمین میں سے ایک۔ ڈاکٹر بشارت لاہور کی ایک نئی بستی سمن آباد میں نئے نئے تعمیر شدہ این ٹائپ کوارٹروں میں سے ایک میں، تنہا زندگی بسر کررہے تھے۔ مغربی عمرانیات داں ایچ جے لاسکی کی کتاب "گریمر آف پالیٹکس" کا مطالعہ کرتے وقت انہوں نے جگہ جگہ بعض عبارتیں نشان زد کردی تھیں، جن کی نقل کی ذمہ داری میری تھی۔ میں ایک طالب علم بلکہ شاگرد کی طرح کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے کوارٹر پہنچتا۔ اُن سے عمرانیات کا درس بھی لیتا اور اُن کے لیے تنور وغیرہ سے دال روٹی بھی لاتا اور اقتباس وغیرہ نقل کردیتا۔

اُن چھوٹی چھوٹی نشستوں میں کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر حمیداللہ کا ذکر ضرور نکل آتا۔ وہ حصولِ آزادی سے پہلے بھی تکمیلِ تعلیم کی غرض سے فرانس میں تھے اور اُسی زمانے میں ڈاکٹر بشارت علی بھی وظیفے پر جرمنی میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے۔ دونوں "عثمنِ" ہم عمر، ہم عصر، ہم مشرب، ہم مزاج تھے۔ علم کی طلب کے سوا انہوں نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا

تھا۔ پہننے کو سادہ لباس، سر پر ٹوپی، کھانے کو چپاتی اور ہلکا سا شوربہ۔ سونے کو مجری بستر۔ اور اردگرد، اوپر نیچے موضوع سے متعلق کتابیں، اور کتابیں ہی کتابیں۔

اُن دنوں ڈاکٹر حمید اللہ وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی فرمائش پر چند مہینوں کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ تقریب یہ تھی کہ 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں وزیر اعظم نے "قراردادِ مقاصد" پیش کی تھی، جس میں کہا گیا کہ تمام کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے، اور اُس نے جمہور کی وساطت سے، مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی دیا ہے جو کہ ایک مقدس فریضہ ہے، اس لیے پاکستان کی یہ اسمبلی فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خودمختار پاکستان کے لیے ایک آئین مرتب کرے۔ اسمبلی میں "قراردادِ مقاصد" کی منظوری کے ساتھ ہی مولوی تمیز الدین کی زیرِ صدارت 24 ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی، جس کو "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی کے ماتحت "تعلیمات اسلامیہ بورڈ" قائم کیا گیا۔ یہ بورڈ اسلامی قانون سے گہری واقفیت رکھنے والے جید علماء و فضلاء پر مشتمل تھا، اور اس میں قدیم اور جدید خیالات رکھنے والے علماء شامل تھے۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، پروفیسر عبدالخالق، مفتی جعفر حسین اور مولانا ظفر احمد انصاری کے ساتھ ساتھ پیرس سے خصوصی فرمائش سے آئے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ بھی شامل تھے۔ اس بورڈ کا کام یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور دیگر ذیلی کمیٹیوں کی طرف سے پیش کردہ رپورٹوں کا جائزہ تعلیماتِ اسلامیہ کی روشنی میں لے کر اپنی رائے دے۔

ڈاکٹر بشارت علی کی خواہش تھی کہ جب ڈاکٹر حمید اللہ کو دیا ہوا کام ختم ہو جائے اور وہ واپس یورپ جانے لگیں تو واپسی سے پہلے چند روز کے لیے لاہور بھی تشریف لائیں اور اُن کے حجرے میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ اس مسئلے پر دونوں ڈاکٹروں کے درمیان لاہور تا کراچی، تین تین پیسے والے پوسٹ کارڈوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا جن کے قاریٔ اوّل ہونے کا شرف اِس ناچیز کو اس درجہ حاصل ہوا کہ دونوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حروف کے نقوش ذہن کی سطح پر، صاف صاف ترشے ہوئے، آج تک زندگی افروز تمازت کا سامان کیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر بشارت علی کراچی سے واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ حمید اللہ واپس فرانس چلے گئے ہیں۔ وہ خاصے افسردہ تھے۔ انہیں پاکستانی حکام دستور سازی میں سنجیدہ نظر نہیں

آئے اور یہاں مزید رہنا بے مصرف معلوم ہوا۔ وقت کا ضیاع انہیں گوارا نہ تھا۔ اگلے برس ڈاکٹر بشارت علی بھی لاہور کو داغِ مفارقت دے کر مستقل کراچی چلے گئے۔ وہاں کراچی یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور انہیں شعبۂ عمرانیات کا صدر مامور کیا گیا تھا۔ اس طرح میں ایک عالم کے سایے پر آئے ہوئے دوسرے عالم کے سائے سے بھی ایسا محروم ہوا کہ پھر زندگی بھر مجھے ایسا علمی قرآن السعدین نصیب نہ ہو سکا۔ بے شک ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے میری ملاقات نہ تھی۔ میرا ربط ضبط نہ تھا۔ خط و کتابت نہ تھی، لیکن نوجوان ذہن تھا۔ ڈاکٹر بشارت علی کی زبانی اُن کی باتیں سن سن کر اُن کی عقیدت میں مبتلا ہو جانا ایک طالب علم کے لیے ناگزیر تھا۔

1980ء میں مارشل لاء چہارم کا ستم رسیدہ ہو کر میں نقلِ مکانی پر مجبور ہوا اور کئی سال تک میں ڈاکٹر بشارت علی کی خدمت میں حاضر ہونے کی آرزو تو کرتا رہا، لیکن روزگار نے قدم نہ اٹھنے دیئے۔ کراچی یونیورسٹی سے صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور کہیں ایف بی ایریا میں کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ 1988ء میں جا کر اُن کا اتا پتا معلوم ہوا، میں حاضر ہوا۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو پاکستان میں علم کی بے قدری اور "دشمن" رفقائے کار کی علم دوستی کا ذکر ضرور چھڑتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے پوسٹ کارڈ اب بھی اُن کے نام آتے تھے۔ یہ اُن کو بتاتے رہتے تھے کہ خود کیا کر رہے ہیں۔ ابنِ سینا، ابنِ رُشد، ابنِ تیمیہ، ابنِ خلدون، فارابی اور امام غزالی کی شخصیت اور افکار پر تصانیف کے مسوّدے تیار ہو چکے تھے، خصوصاً قرآنی عمرانیات پر، دوسرے مذاہب اور اقوام کی عمرانیات سے تقابلی موازنے کے ساتھ، کوئی ایک من وزن کے مسوّدات اُس بڑے صندوق میں اوپر تلے رکھے ہوئے تھے جو اُنہیں بیوی کے جہیز میں ملا تھا۔ یہ صندوق اثاث بھرا ہوا تھا اور اب کسی نئے مسوّدے کی گنجائش نہ تھی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مجھے اِس انبار کو سبقاً سبقاً، کتاب بہ کتاب، چھاپنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ خیال آیا کہ شاید ڈاکٹر صاحب میرے ادارے "شاہکار" کو اپنے کام کے لائق ناشر نہیں سمجھتے، اس لیے میں نے کراچی کے بعض بڑے ناشروں، بالخصوص اُردو اکیڈمی سندھ کے مالک علاء الدین خالد صاحب کو آمادہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا

موقف یہ تھا کہ جب تک زندہ ہوں، میرے بچے قریب رہیں گے۔ یہ میری وفات کے بعد شائع ہوں گے۔ یہ سب مسودے ادھورے ہیں۔ میرے پاس رہتے ہیں تو اِن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ نئے نئے خیال شامل ہوتے رہتے ہیں۔ نوک پلک سنورتی رہتی ہے۔ چھپنے کے بعد یہ میرے نہیں رہیں گے۔ دوسروں کے ہو جائیں گے۔ مسوّدے کو بہتر سے بہتر، معتبر سے معتبر، زیادہ سے زیادہ مکمل بنانے کی یہ خواہش اور کوشش بالکل ویسی ہی تھی جیسی بعد میں معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس مرض کے عاشق تھے۔

ڈاکٹر بشارت علی کے مسودات کو اشاعت و طباعت کے مرحلے میں لے آنے کی خواہش کا اظہار میں نے ہفت روزہ ''تکبیر'' کے مدیر مولانا محمد صلاح الدین سے کیا، تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا: ''یہ ایک بشارت علی کا معاملہ نہیں۔ ہمارے کئی بڑے آدمیوں کے مسوّدے اسی طرح خاک میں رُل رہے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تصانیف کو دیکھئے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ اب تک موصوف کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ جتنی چھپ چکی ہیں، اُن کے کئی کئی ناشر ہیں۔ کوئی یکجائی نظر نہیں آتی۔ میں انہیں خط لکھتا رہتا ہوں۔ پیرس سے اُن کا جواب بھی آتا ہے، لیکن اصل بات ٹال جاتے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت اگرچہ فی الحال ''تکبیر'' کے پروگرام میں شامل نہیں ہے، لیکن مقاصد میں ضرور شامل ہے۔ اگر حمید اللہ اور بشارت علی جیسے عظمأ کی تصانیف چھاپنے کی اجازت مل جائے تو اسے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے''۔

ایک روز میں مولانا صلاح الدین کو ڈاکٹر بشارت علی کے پاس لے گیا۔ یہ غالباً 1992ء کی بات ہے۔ انہوں نے بڑے صندوق میں اسلامی موضوعات و شخصیات پر مسوّدوں کا انبار دیکھا تو سخت قلق ہوا۔ اُن کی علالت کہ علیل کو قبر کے کنارے تک لے آئی تھی، مریضِ علوم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ہم کوئی دو گھنٹے ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ مولانا صلاح الدین ڈاکٹر حمید اللہ کے عقیدت مند تھے، اس لئے اصرار کے ساتھ بار بار اُن کا ذکر درمیان میں آجاتا۔ مجھے اندازہ تک نہ ہوا کہ مولانا کے استفسارات کے پیچھے، اُن کا ذہن ایک انٹرویو کا تانا بانا بُن رہا ہے۔ اگلے ہی ہفتے ''تکبیر'' میں ڈاکٹر بشارت علی کا انتہائی زوردار، پُراثر، پُردرد، طویل انٹرویو چھپا تھا جس میں ڈاکٹر حمید اللہ کا ذکر بھی کچھ ایسے ہی سوز و درد سے پیوند کیا گیا تھا۔ مولانا نے ایک ہی سانس میں دونوں بزرگوں کی

فضیلت وعلمیت کا یکساں ذکر کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان کو اُس کا فرض یاد دلایا تھا۔

1993ء میں ڈاکٹر بشارت علی کا انتقال ہوا۔ ''تکبیر'' میں اُن کی رحلت پر جو شذرہ لکھا گیا، اُس میں بھی ڈاکٹر حمید اللہ کا ذکر خیر ہوا۔ اُس وقت محمد نواز شریف ملک کے وزیر اعظم تھے۔ مولانا صلاح الدین انہیں ترغیب دے رہے تھے کہ جب وہ فرانس کے دورے پر جائیں تو وہاں پیرس میں اقامت گزیں، ایک مہاجر درویش ڈاکٹر حمید اللہ سے ضرور ملاقات کریں اور انہیں ضعیف العمری میں پاکستان میں مستقل اقامت کی تحریک کریں۔ حسنِ اتفاق سے بیرونی دورے میں مولانا صلاح الدین بھی وزیر اعظم کے ہمراہ تھے۔ (ڈاکٹر حمید اللہ سے ملاقات کا احوال اُنہوں نے ''تکبیر'' میں ایک خصوصی مضمون کی شکل میں لکھا جو کتاب ہذا میں شامل ہے)۔

فرانس سے واپسی پر، میں مولانا صلاح الدین سے ملا۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں نے ڈاکٹر بشارت علی قریشی کی وفات کی خبر اُن کے ''دشمن'' دوست ڈاکٹر حمید اللہ کو سنائی تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کئی منٹ تک گفتگو کو سلسلہ پکڑنے سے قاصر رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے وزیر اعظم کی یہ درخواست قبول کر لی ہے کہ یہاں مستقل قیام تو ناممکن ہے، البتہ چند روز کے لیے پاکستان بطور مہمان آئیں گے۔ میں نے مولانا صاحب سے درخواست کی کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب کراچی تشریف لائیں تو مجھے قدم بوسی کا موقع ضرور دیں یا دلوائیں۔

ڈاکٹر صاحب کراچی آئے۔ اُن کے اعزاز میں فاران کلب میں خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا صاحب کا فون آیا کہ تم بھی پہنچ جاؤ۔ میں نے کہا، تخلیے میں پانچ منٹ کے لیے ملاقات چاہیے۔ کہنے لگے، اِس کا وعدہ نہیں کرتا۔ بہت سے امیدوار ہیں۔ یہ آپ کی ہمت اور قسمت پر منحصر ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے۔ عاشقوں کا ایسا ہجوم تھا کہ پروانہ وار شمعِ علم پر گر رہے تھے۔ میری ہمت نے جواب دے دیا۔ لیکن قسمت نے ہاتھ پکڑا اور چپکے سے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا، جیسے مُرید بے تابانہ بیعت کے وقت اپنے مرشد کے ہاتھ میں دیا کرتے ہیں۔ میرے قلب میں جذبات کا طوفان اور

ذہن میں بے شمار سوالوں کی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وقت زیرو پوائنٹ پر تھما ہوا تھا۔ سیکنڈ کی سوئی اگلے ہی لمحے کسی اور طاقتور کا ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے پیچھے دھکیل سکتی تھی۔ بدبداکر ایک سوال میری زبان سے نکلا: ''آپ کی تخلیقات کا کاپی رائٹ کس کے پاس ہے۔ ہر کتاب کا ناشر الگ ہے اور وہ اس کے کاپی رائٹ کا مالک ہونے کا مدعی ہے۔''

فرمایا: ''میری تصانیف کا کاپی رائٹ اس کے پڑھنے والوں کو حاصل ہے۔ میں کوئی رائلٹی کسی پبلشر سے نہیں لیتا، الحمدللہ، نہ مجھے اس کی حاجت ہے۔ پبلشر سے میں صرف ایک بات کی توقع رکھتا ہوں کہ وہ پروف مجھ سے پڑھوائے۔ جب بھی نیا ایڈیشن چھاپے، مجھ سے اصلاح کرائے۔ ترامیم اور تصحیحات کا انبار نئے ایڈیشن تک میرے پاس جمع ہو جاتا ہے۔ میرے مسوّدے میں عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ بکثرت ہوتے ہیں۔ اُن کی املا بالکل صحیح حروف میں نہ ہو تو مجھے سخت کوفت ہوتی ہے، لیکن ناشرین، میرا مطلب ہے، پاکستان کے ناشرین افسوس، خالص کاروباری لوگ ہیں، صحتِ عبارت پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ جب کسی اور زبان میں چھپ کر کتاب میرے ہاتھ میں آتی ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے، اور جب پاکستان سے کتاب چھپ کر مجھے ملتی ہے تو میں کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہوں''۔

ایک منٹ کے اِس سوال و جواب کے بعد وقت نے پھر کبھی موقع نہ دیا کہ میں شخصاً حاضر خدمت ہوتا۔ مولانا محمد صلاح الدین کی شہادت کے بعد اور حکیم محمد سعید کی شہادت سے ذرا پہلے، میں اہلِ خانہ سمیت نقل مکانی کر کے پھر لاہور اپنے اہل خاندان کے پاس آ گیا، اور یہاں سے پھر ''شاہکار'' کا نقشہ جمانا چاہا تو 2001ء کے اوائل میں ''شاہکار میگزین'' کا اجرا کرتے وقت تین بڑے مسلم زعمائے علم کے نام پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا عزم کیا۔ علامہ محمد اسد، ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر بشارت علی قریشی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے نام اور کام کے متعلق اُن کے چند وابستگانِ خاص سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مثلاً ڈاکٹر محمود احمد غازی، شاہ بلیغ الدین، جناب محمد عالم مختار حق وغیرہم۔ ڈاکٹر محمود غازی تو اُس وقت وزارتِ مذہبی امور کا قلم دان سنبھالے ہوئے تھے، لیکن اپنی بے محابا مصروفیات کے باوجود انہوں نے محض ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی مودبانہ

پاسداری سے میری حوصلہ افزائی کی اور لکھا کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے اور وہ ہر ممکن قلمی اعانت فرمائیں گے۔ انہوں نے اپنے نام آئے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف کے مکاتیب، حواشی لکھ کر، عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا موجودہ اتا پتا پوچھا تو فرمایا، وہ امریکا میں اپنی ایک عزیزہ کے ہاں ایسی حالت میں ہیں کہ خط کا جواب تو درکنار، خط پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے اُن سے خط و کتابت کا کوئی فائدہ نہیں۔

شاہ بلیغ الدین بہ سلسلۂ تبلیغ و دعوۃ امریکا میں جا بیٹھ رہے اور مکاتیب میں تاخیر ہونے لگی۔ البتہ جناب محمد عالم مختار حق نے حق ادا کر دیا۔ اپنے تمام تحقیقی و ذاتی کام چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کے خطوط نکالے اور اُن پر اپنے حواشی لکھے اور صبح و شام مظہر سلیم مجوکہ صاحب کو فون کرنے لگے کہ آؤ اور ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب لے جاؤ۔ مجوکہ صاحب دراصل "محمد حمید اللہ نمبر" کی عملی مدیر تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تمام مطبوعہ تصانیف کی فہرست بنا کر دستیاب کتب میرے سپرد کر دی تھیں۔ ابھی یہ کام جاری تھا کہ "شاہکار میگزین" کو کسی کی نظر لگ گئی اور وہ شیر خوارگی ہی میں فوت ہو گیا۔

20 / دسمبر 2002ء کو ملتان سے مظہر سلیم مجوکہ نے فون کیا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب قضائے قدرت سے رحلت کر گئے ہیں۔ وہ کام جو 2001ء میں شروع ہوا تھا، وہ فوری طور پر تیار کر دیں، "ہیکن بکس" بڑے اشتیاق سے اُسے شائع کرنے کے لیے تیار ہے۔ اُس وقت مجوکہ صاحب "ہیکن بکس" کی لاہور برانچ کے تازہ تازہ منیجر مقرر ہوئے تھے۔

ہم دونوں نے مل کر یہ سوچ رکھا تھا کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور نے پوری زندگی (پاکستانی معیار کے مطابق) تخلیے میں گذاری تھی اور کوئی بھی اُن کے بہت زیادہ قریب ہونے کا ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُن کے شخصی حالات و کوائف کا بھرپور جائزہ لے سکے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر اُن کے حالات پر سوانحی مضامین لکھوائے جائیں تو وہ ایک دوسرے کی نقل اور تکرار ہوں گے، اس لیے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی اپنی تحریروں کا انتخاب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اُن کی تصانیف کے دلدادہ اب تک علم دوست رہے تھے، جن کی تعداد بہت کم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے انہیں عام قارئین تک پہنچانے کی سبیل پیدا کی جائے۔

٭ ناچیز کی رائے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی سینکڑوں تصانیف، تحقیقات اور مقالات کا لُبِ لباب ''خطباتِ بہاول پور'' میں پیش کر دیا تھا۔ ''خطباتِ بہاول پور'' کا علمی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ''خطباتِ مدراس'' اور علامہ اقبال کے ''خطبات تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ'' سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ میں نے عام قارئین کے لیے، جو اسلامیات کی طرف رُخ کم ہی کرتے ہیں، ''خطبات بہاول پور'' کی تلخیص اِس ترکیب سے کی کہ مشکل اور اَدق تحقیقی موضوعات کو ایک طرف رکھا اور سادہ اور عام فہم موضوعات کو اپنے لیے نکال لیا۔ نیز اس امر کا خاص خیال رکھا کہ کسی ایک خیال یا بات کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ کتاب ہذا میں شامل بارہ مضامین ''خطباتِ بہاول پور'' پر مبنی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا عظیم الشان مقالہ ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'' پہلی بار ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کی اشاعت جولائی 1939ء میں چھپا تھا۔ یہ مقالہ بعد ازاں بار بار چھپا اور اُن کی کتاب ''عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظامِ حکمرانی'' میں شامل ہے۔ دراصل یہ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم دستاویز ''میثاقِ مدینہ'' پر ایک بے مثال علمی و تحقیقی تحریر ہے۔ کتاب ہذا میں اُن کا یہ مقالہ بھی بطورِ خاص شامل ہے اور ''ادبی دنیا'' کے شمارہ جولائی 1939ء سے براہ راست منقول ہے۔

ڈاکٹر صاحب جب بھی پاکستان تشریف لاتے تھے تو وہ عام طور پر بڑے شہروں میں دو دو چار چار روز کے لیے قیام کرتے تھے۔ اُن کے اعزاز میں خصوصی نشست کا اہتمام ضرور ہوتا تھا جس میں علماء و فضلا، ادیب، صحافی، دانشور اور طلبہ ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے اور اُن کی باتیں، جنہیں لیکچر کہیے یا خطبہ، سننے کے بعد اپنے ذہن کی گتھیاں صاف کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے تھے۔ ہم نے یہاں ایسے استفسارات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات کا انتخاب بھی پیش کر دیا ہے۔

اُن کی خاصے کی چیز اُن کے خطوط یادگار ہیں۔ ہمیشہ پوسٹ کارڈ لکھتے تھے۔ کہنے والی کام کی بات پر انتہائی مختصر جملہ لکھتے۔ دو چار جملوں میں بات ختم کر کے دُعا دیتے ہوئے، آگے بڑھ جاتے۔ خط کی عبارت ختم نہ ہوتی تھی، آخری جملہ زندگی کی طرح ایک تسلسل کی داستان لیے ہوئے ہوتا۔ محسوس ہوتا، جیسے کہہ رہے ہوں، میرے آئندہ خط کا انتظار کرو۔

ہمارے پاکستان میں ایک درویش صفت، خاموش طبع محقق رہتا ہے، محمد عالم مختار حق۔ اُن کے نام مولانا غلام رسول مہر کے خطوط آتے تھے۔ آج کل وہ اُن پر حواشی لکھ رہے ہیں۔ مجموعہ بنے گا۔ لاہور میں ایک نادرۂ روزگار شخص مولوی شمس الدین (تاجر کتب) رہا کرتا تھا جو جوانی میں راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ اُس کی کتابوں کی دکان اُس وقت کا علمی مرکز تھی اور شہر لاہور کے ہی نہیں، بلکہ ملکوں ملکوں کے ادیب، دانشور اور عالم فاضل کشاں کشاں اُس کے پاس نادر و نایاب کتب کی جستجو میں آیا کرتے تھے۔ لوگوں نے اُسے فراموش کر دیا، لیکن محمد عالم مختار حق نے نہیں بھلایا۔ وہ مولوی صاحب پر اُس کے واقف احباب سے ملاقاتیں کر کے، ایک مستقل کتاب تصنیف کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی انہیں گاہے گاہے خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اِن خطوط پر محمد عالم صاحب نے جو حواشی لکھے ہیں، وہ اپنی جگہ ادب پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختصر مختصر جملوں سے باتیں اور یادیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے وزارت کا نظم و نسق اس لیے ترک کیا تھا کہ اپنے اصل مقام دینِ حق کی دعوت و تحقیق و اشاعت پر جلد پہنچیں۔ یہاں آئے تو پہلے سے بھی زیادہ مشغولیت اور انہماک ہو گیا۔ ہم نے انہیں وعدہ یاد دلایا کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے خطوط پر حواشی لکھ کر عنایت کیجیے۔ فرمایا، ضرور بضرور۔ فی الحال اُن کے ''ممتاز ترین محقق'' ہونے کے احقاق میں یہ مضمون پڑھیے۔ آگے چلیں گے ذرا دم لے کر۔ ہم نے کہا، غنیمت ہے۔ مضمون پڑھا تو دل نے کہا خوب ہے۔ غنیمت سے کہیں زیادہ، ایک تحفہ، ایک ہدیۂ تبریک، ایک خراجِ عقیدت!

''تکبیر'' کے مدیر شہید، مولانا محمد صلاح الدین نے 1994ء کے اوائل میں پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ کی ملاقات کے بعد جو یادگاری مضمون قلم بند کیا تھا، وہ یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمات پر تحریر شدہ بہترین مضامین میں اس کا شمار ہوتا رہے گا۔

شاہ بلیغ الدین نے ابھی تک ڈاکٹر صاحب پر کوئی تازہ مضمون نہیں لکھا۔ وفات پر ایک مختصر سا تاثر اخبارات میں نظر آیا ہے۔ البتہ انہوں نے اپنے ایک سابقہ مضمون کی نشاندہی کی ہے جو دونوں اس کتاب میں اُن کے شکریے کے ساتھ شامل ہے۔

"بیکن بکس" کے دونوں احباب جناب عبدالجبار اور برادرم مظہر سلیم مجوکہ نے جس اشتیاق کے ساتھ یہ کتاب مرتب کرائی ہے، اللہ کرے، اُسی اشتیاق اور حسنِ ذوق کے ساتھ اسے شائع کر کے ملک کے طول و عرض میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم سے عقیدت اور محبت رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کی رسائی ممکن ہو۔

سیّد قاسم محمود
یکم مئی 2003ء

محققِ عصر، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

سوانحی خاکہ

مُرَتبہ: رشید شکیب

نام : محمد حمید اللہؒ

تاریخِ پیدائش : ۱۹ر فروری ۱۹۰۸ء

مقام پیدائش : کٹل منڈی

(حیدر آباد شہر کا قدیم محلہ)

تاریخ وفات : ۱۷ر دسمبر ۲۰۰۲ء

پردادا کا نام : محمد غوث

(المتوفی ۱۲۴۶ھ)

(لارڈ کرزن نے شمس العلماء کا خطاب دیا اور مدراس کا قاضی مقرر کیا)

دادا کا نام : محمد صبغتہ اللہ قاضی بدرالدولہ

پیدائش ۱۷۹۲ء وفات ۱۸۶۳ء

دادا کے بھائی کا نام : عبدالوہاب

(۲) محمد حبیب اللہ۔ یہ مدراس کے قاضی تھے، عالمِ دین اور ولی صفت بزرگ تھے۔

والد کا نام : ابو محمد خلیل اللہ (مددگار معتمد مال گزاری حیدر آباد)

والدہ کا نام : بی بی سلطان

نانا کا نام : نواب قاسم جنگ (صدر محاسب ریاست کرناٹک)

بہنوں کے نام : (۱) امتہ العزیز بیگم (۲) امتہ الوہاب بیگم

(۳) امتہ رقیہ بیگم (۴) امتہ الصمد بیگم

(۵) اسماء بیگم

بھائیوں کے نام : (۱) محمد صبغتہ اللہ (نائب ناظم بندوبست)

(۲) محمد حبیب اللہ (مددگار ناظم بندوبست)

(۳) محمد غلام احمد (۴) حبیب الرحمٰن

ایک بھائی محمد غلام احمد اور امتہ رقیہ کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔

تعلیم : ۱۔ مولوی کامل۔ مدرسہ دارالعلوم اور جامعہ نظامیہ (درس نظامی)

۲۔ ایم اے۔ (۱۹۳۰ء) جامعہ عثمانیہ

۳۔ ایل ایل بی۔ (۱۹۳۰ء) جامعہ عثمانیہ

۴۔ اسکالر۔ نیا قائم کردہ۔ شعبہ تحقیقات کے پہلے محقق "قانون بین الممالک"

۵۔ ڈی فل (۱۹۳۳ء بون یونیورسٹی (جرمنی)

۶۔ ڈی لٹ (۱۹۳۵ء) سوربون یونیورسٹی (پیرس، فرانس)

۷۔ پی ایچ ڈی ۱۹۳۵ء سوربون یونیورسٹی (پیرس، فرانس)

ملازمت : ۱۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۸ء تک شعبہ دینیات اور قانون میں درس تدریس دیتے رہے۔

۲۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۸ء تک سینٹر ڈی لا ریسرچ سائنٹیفک پیرس میں تحقیق کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ترکی، جرمنی اور اسلامی ممالک کی بہت سی یونیورسٹیوں میں لیکچرز دیتے رہے۔

۳۔ ۱۹۷۸ء کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر مامور رہے اور تحقیق اور درس تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

چند کتابوں کے نام
(تصنیف، تالیف، تراجم)

۱۔ القرآن حکیم (فرانسیسی میں ترجمہ کیا) پندرہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن پریس سے ۱۹۵۹ء میں چھپا۔

۲۔ مصحف قرآن عثمانیؓ (سمرقند کے نسخے سے فوٹو کاپی کروا کر، جدید عربی خط میں نقطوں اعرابوں کے ساتھ مرتب کر کے فلاڈلفیا (امریکہ) سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

۳۔ القرآن فی کل لسان۔ (۱۲۰ زبانوں میں قرآنی تراجم کی ببلوگرافی کے ساتھ سورۃ فاتحہ بطور نمونہ شائع کیا تھا۔

۴۔ محمدؐ رسول اللہ (پہلے فرانسیسی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کے بارے میں (دو جلدوں میں کتاب لکھی۔ انگریزی میں ترجمہ پیرس کے سینٹرل کلچرل سے شائع کیا۔ ۱۹۷۵ء میں حیدر آباد سے اردو ایڈیشن چھپا۔ ترکی میں بھی ترجمہ ہوا۔

۵۔ سیرۃ طیبہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے لیکچر (اُن لیکچرز کا مجموعہ جو کہ طالب علموں کو دیا کرتے تھے) ۱۹۸۷ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئے۔

۶۔ سیرۃ طیبہ کا پیغام، عصر حاضر کے نام۔ (اس تقریر کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے جو کہ الحمراء ہال لاہور ۱۹۹۲ء میں کی تھی۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جوانی (مختصر سا رسالہ ہے جو پہلے سکندر آباد دکن سے شائع ہوا۔ پھر کراچی سے حسام الدین غوری صاحب نے شائع کیا۔

۸۔ صحیفہ ہمام بن منبہ (الصحیفۃ الصحیحہ) حدیث کا قدیم ترین مجموعہ اور تاریخ و تدوینِ حدیث) ۱۹۷۹ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا۔ (عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے)۔

۹۔ قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں۔ طبع حیدر آباد ۱۹۳۶ء

۱۰۔ قانون بین الممالک (پروفیسر نیس کی کتاب کا فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ)
۱۱۔ قانون بین الممالک (محمد امام محمد شیبانی کی عربی میں لکھی ہوئی کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ) یونیسکو کی مدد سے چار جلدوں میں شائع کیا)
۱۲۔ قانون شہادت ۱۹۴۴ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔
۱۳۔ اسلامی قانون تصادم (پروفیسر منکرس کرواہی کی فرانسیسی تصنیف کا اردو ترجمہ)
۱۴۔ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی (طبع سادس کراچی ۱۹۸۳ء)
۱۵۔ اسلامی ریاست عہد رسالت کے طرز عمل سے اشتہاد، لاہور سے شائع ہوئی۔
۱۶۔ الوثائق السیہ الہدالعبو ی والخلافۃِ راشدہ (فرانسیسی میں ۱۹۳۵ء میں تالیف کی گئی) اردو ترجمہ ۱۹۶۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔
۱۷۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام تعلیم - ۱۳۶۱ ہجری میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔
۱۸۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام حکمرانی - پہلا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ میں کراچی سے چھپا۔
۱۹۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی - ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔
۲۰۔ ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میدان جنگ'' کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔
۲۱۔ عربی حبشی تعلقات - نو دستیاب شدہ مکتوب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنام نجاشی۔
۲۲۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خارجہ تعلقات (انگریزی)
۲۳۔ مسلمانوں کا طرزِ حکومت - ۱۹۷۷ء میں ساتواں ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔
۲۴۔ اسلام کا تعارف - (انگریزی) پہلا ایڈیشن پیرس سے چھپا۔ پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔
۲۵۔ اسلام کے بیرونی ممالک سے تعلقات - (انگریزی)
۲۶۔ اسلام کے بنیادی مسائل کا حل (انگریزی)
۲۷۔ روزہ کیوں؟ پہلا ایڈیشن جرمنی میں چھپا۔ کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔
۲۸۔ خطبات گارساں دتاسی۔

۲۹۔ اسلام اور عیسائیت (انگریزی)

۳۰۔ اسلام اور اشتراکیت (انگریزی)

۳۱۔ اسلام کا عمومی تصور (انگریزی)

۳۲۔ کتاب النبات (ابو حنیفہ دینوری کی درختوں کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا) پہلی جلد قاہرہ سے چھپی دوسری جلد ہمدرد کراچی نے ۱۹۹۳ء میں شائع کی۔

۳۳۔ نزھۃ المشتاق (جغرافیہ ان الدرسی کی علم جغرافیہ پر نایاب تصنیف)

۳۴۔ کتاب الاصل (علم فقہ پر امام محمد الشیانی کو مرتب کر کے حیدر آباد سے شائع کروایا۔

۳۵۔ اسلامی قانون اور نظریہ پر دستوری ارتقاء (ڈی بی مکیڈ انلڈ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)

۳۶۔ خطباتِ بہاولپور (تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ انگریزی میں ترجمہ ہوا)

۳۷۔ نیلگری (ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ حیدر آباد سے چھپی تھی)۔

ڈاکٹر حمیداللہ:

نام اور کام

مرحوم اسکالر کی خدمات
اور اُن سے ایک تاریخی ملاقات کا تذکرہ

محمد صلاح الدین شہید

کسی اعلیٰ نصب العین یا مشن کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دینے کی بات محاورتاً تو سنی تھی، لیکن اس کا کوئی عملی نمونہ دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ نامور زعماء اور اکابرین کی زندگی کا کچھ نہ کچھ وقت اہل خانہ، اعزاء، دوست احباب اور مختلف نوعیت کی معاشرتی تقریبات کی نذر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں ایسا ہونا ناگزیر ہے، لیکن پیرس کے حالیہ سفر میں اسلام کے ایک ایسے خادم کو دیکھنے کا موقع ملا اور اس سے دو تین ملاقاتیں کرنے کا شرف حاصل ہوا، جس کی زندگی مختصر نیند اور ضروری حاجات کے سوا پوری کی پوری اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ اس میں نہ بیوی بچوں کا کوئی دخل ہے، نہ کسی ملازم اور رفیق کی کوئی گنجائش اور نہ عزاء اور دوست احباب یا تقریبات کا کوئی جھمیلا، حتیٰ کہ ٹیلی فون تک کا کوئی جھنجھٹ نہیں ہے۔ وقت کا ہر لمحہ اشاعت اسلام اور تبلیغ اسلام کیلئے وقف ہے اور اس میں ایسا انہماک و تسلسل ہے کہ دم لینے کی مہلت نہیں۔ بس یہ فکر دامن گیر ہے کہ 84

سال کی عمر ہو چکی ہے، کہیں فرشتۂ اجل نے آ دبوچا، اپنے رب کا سامنا ہوا اور اس نے یہ پوچھا کہ میں نے جو نعمتِ دین تجھے عطا کی تھی، اسے دوسروں تک پہنچانے کے لئے تم نے کیا کیا، تو میں وہاں کیا منہ دکھاؤں گا؟ ندامت و شرمندگی سے بچنے کے لئے کچھ تو زادِ راہ ساتھ لے لوں۔ باقی سہارا اس کے عفوو درگزر اور عطاو بخشش سے مل جائے گا۔

یہ شخصیت ہے عالمِ اسلام کے معروف و منفرد محقق، مصنف، مترجم، مفسر اور مبلغ پروفیسر محمد حمید اللہ کی، جو اپنے عظیم کام ہی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے طرز زندگی کی بے مثال خصوصیات کے باعث، مسلم دنیا کے اہل علم و فضل اور فرانس اور فرانسیسی زبان سے وابستہ افریقی ممالک میں انتہائی قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وزیر اعظم محمد نواز شریف نے جب مجھ سے پہلی بار اپنے دورۂ فرانس کا ذکر کیا، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہاں ایک نامور عالم اور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ضرور ملئے جو پاکستان میں آئین سازی کے ابتدائی مراحل میں گرانقدر خدمات انجام دے چکے ہیں اور مغربی دنیا میں اس ملک کا نام روشن کرنے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ وزیر اعظم نے اسی وقت متعلقہ حکام کو ہدایت کی کہ پیرس میں سفارت خانہ کو پیغام دے دیا جائے کہ میرے پروگرام میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ملاقات کو بھی شامل کیا جائے۔ بعد ازاں وزیر اعظم کے ساتھ جانے والے صحافیوں میں، جب مجھے شمولیت کی اطلاع ملی، تو پیرس کو تفصیل سے دیکھنے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے علاوہ سب سے زیادہ خوشی اس خیال سے ہوئی کہ یہ سفر مجھے ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ملاقات کرنے اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب سے کراچی میں اس وقت ایک مختصر ملاقات ہوئی تھی، جب وہ جنرل ضیاء الحق شہید کی دعوت پر پاکستان آئے تھے اور بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی میں اپنے یادگار خطبات کا سلسلہ مکمل کر کے پیرس واپس جا رہے تھے۔ ان سے میری مراسلت بھی رہی، لیکن کبھی ان سے تفصیلی ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے اپنے زمانہ طالب علمی اور خصوصاً جامعہ کراچی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کی تیاری کے دوران ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے بہت استفادہ کیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے تبحرِ علم کے علاوہ جس چیز نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا تھا وہ یہ تھی کہ متعلم اور معلم دونوں حیثیتوں سے ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی جرمنی

اور فرانس میں گزری ہے، لیکن ان کی فکر اور تحریر پر مغربی فکر اور تہذیب کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر نہیں آتا اور وہ دیوبند یا ندوہ جیسی کسی دینی درسگاہ کے فاضل استاد کا سا اسلوب نگارش رکھتے ہیں، جس میں اساسیاتِ دین پر گہرے اعتقاد کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ وہ جدید ترین دنیا کے شہری، اس کے علوم کے شناسا اور اس کے انتہائی ترقی یافتہ باشندوں کے مسلمہ استاد ہیں، مگر اپنی فکر اور تحریر کے لحاظ سے وہ متقدمین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی کو چند ہفتوں کے لئے مغرب کی ہوا لگ جائے تو وہ اپنے دیس میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے، لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی اسلامی فکر اور مشرقی تہذیب یورپ میں 60 سال کی رہائش کے باوجود ذرا متاثر نہ ہوئی بلکہ اس نے الٹا اہل یورپ کو متاثر کیا اور ہزاروں افراد کو اسلام کی آغوش میں پہنچا دیا۔ مغربی تہذیب علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر حمید اللہ کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکی۔

پیرس میں ہم منگل 14 جنوری کو ساڑھے آٹھ بجے شب پہنچے اور ایفل ٹاور کے نزدیک کنکورڈ کے علاقے میں واقع ہوٹل کریوں (Crillon) میں جہاں وزیراعظم کے ساتھ ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا، اپنے کمروں تک پہنچتے پہنچتے 10 بج گئے۔ اس دن 12 گھنٹے طویل سفر کے بعد آرام کے سوا کوئی دوسری مصروفیت نہ تھی۔ اگلے روز ہم سرکاری مصروفیات میں شرکت سے فارغ تھے، اس لئے سب نے اپنے اپنے ذوق وطلب کے مطابق پروگرام مرتب کئے۔ میں نے ناشتہ کے فوراً بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ملاقات کی سبیل نکالی۔ اپنے ارادہ کا ذکر چند دوستوں سے کیا تو روزنامہ عبرت حیدرآباد کے ایڈیٹر قاضی اسد عابد اور روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کے ایڈیٹر جناب قیصر بٹ نے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم ایک کار میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پہنچے جو پیرس کے مرکزی علاقے میں ایک چار منزلہ قدیم عمارت میں واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب چوتھی منزل پر رہتے ہیں۔ اس عمارت میں لفٹ نہیں ہے، لکڑی کا زینہ ہے اور ڈاکٹر صاحب اس پیرانہ سالی میں دن میں کئی بار اس زینے سے اترتے چڑھتے ہیں۔ انہوں نے اس عمارت میں زمانہ طالب علمی گزارا اور اب اسی میں ایک چھوٹے سے کمرے میں 1948ء سے مقیم ہیں۔ ہم تقریباً ساڑھے دس بجے صبح وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کا کمرہ بند دیکھ کر مایوس لوٹے، مگر عمارت

کے صدر دروازے پر ڈاکٹر صاحب آتے ہوئے مل گئے، انہوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ میں علی الصبح نماز کے بعد لائبریری چلا جاتا ہوں، وہیں سے واپس آ رہا ہوں۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم سب سے آگے نکل گئے اور ہم ان کا ساتھ نہ دے سکے، سب کے سانس پھولے ہوئے اور قدم بھاری تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تیسری منزل پر پہنچ کر بتایا کہ اوپر میرے کمرے کی مرمت ہو رہی ہے اس لئے عارضی طور پر یہاں رہ رہا ہوں۔ انہوں نے کمرہ کھولا تو ہمیں یوں محسوس ہوا کہ کتابوں کے کسی گودام میں آ گئے ہیں۔ ایک بوسیدہ صوفہ، فائلوں اور کتابوں سے لدی ایک پرانی میز، ایک جانب چھوٹی سی چارپائی اور اسٹیل کی تین چھوٹی کرسیاں، کتابوں کے بڑے بڑے بکسوں اور کریٹوں کے درمیان جمی ہوئی بلکہ پھنسی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھنے سے قبل انہیں کتابوں اور فائلوں کے بوجھ سے آزاد کرنا ضروری تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دیر تک ہماری آمد پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے رہے۔ شفقت، محبت، انکساری، عاجزی، تواضع اور اپنی بے سروسامانی کے سبب ہماری تکلیف وزحمت پر تاسف کے جذبات سے ان کا چہرہ معمور تھا۔ ابتدائی تعارفی گفتگو، کچھ پرانی یادوں کی تجدید اور اپنی چار کتابوں کی پیشکش کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوال و جواب کے سلسلہ کا آغاز ہوا تو انہوں نے بتایا کہ میں 1948ء سے یہاں مقیم ہوں۔ پاکستان یہیں سے گیا تھا اور وہاں مولانا سید سلیمان ندوی، متعدد علماء اور مولانا ظفر احمد انصاری کے ساتھ مل کر پاکستان کے آئین کے لئے بنیادی نکات، علماء کے 22 نکات اور نظامِ تعلیم کے خاکہ کی تیاری میں شریک رہا اور پھر پیرس واپس چلا آیا۔ انہیں میری زبانی مولانا ظفر احمد انصاری کے انتقال کی خبر ملی تو گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ مولانا کی ملی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مغفرت کے لئے دعا کی۔ ڈاکٹر بشارت علی کے انتقال پر بھی انہوں نے افسوس اور صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی۔ انہوں نے بتایا کہ وزارتِ تعلیم کے تحت یہاں اورینٹل اسٹڈیز ریسرچ سینٹر قائم ہے جس میں ایسے صاحبانِ علم کو رکھا جاتا ہے جو مختلف وجوہ کی بناء پر اپنے وطن سے ہجرت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں 25 سال اس سے وابستہ رہ کر اب ریٹائر ہو چکا ہوں اور اس کے وظیفہ پر میری گزر بسر ہو رہی ہے۔ میں نے جرمنی میں بون یونیورسٹی سے 1933ء میں اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ڈی فل کی

ڈگری لی۔ اگلے سال سوربورن یونیورسٹی پیرس سے عہد نبویؐ کی ڈپلومیسی کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا، بعدازاں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پڑھانے لگا۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد میں پیرس چلا آیا اور یہاں تحقیقاتی ادارے سے وابستہ ہو گیا۔ اب میں کسی بھی ملک کا شہری نہیں ہوں، مستقل مہاجر ہوں، میری مہاجریت کی ایک سند حکومت فرانس نے جاری کر دی تھی، وہی میرا پاسپورٹ ہے، اسی پر بیرونی سفر کرتا ہوں، یوں میری شہریت آفاقی ہے۔ اپنے علمی کام سے متعلق ایک سوال پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میرا پہلا مضمون 8 جولائی 1928ء ہفت روزہ ''نونہال'' لاہور میں ''مدارس کی سیر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس موقع پر انہوں نے ایک پرانی کاپی دکھائی جس میں تاریخی ترتیب کے ساتھ ان کے مضامین اور کتابوں کی فہرست موجود ہے۔ مختلف بین الاقوامی جرائد اور مختلف زبانوں میں ان کے شائع شدہ مقالات کی تعداد 921 ہے، وہ ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے بعض مضامین اور کتابوں کا ترجمہ چینی اور جاپانی سمیت متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ فرانسیسی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ اس کے 19 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر ایڈیشن 10 سے 20 ہزار کی تعداد میں طبع ہوا ہے۔ اور آج کل وہ 20 ویں ایڈیشن کا پروف پڑھنے میں مصروف ہیں۔ فرانسیسی میں سیرت نبویؐ بھی دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ حال میں ان کی مرتب کردہ کتاب السیر الکبیر کی چار جلدیں ترکی زبان میں شائع ہوئی ہیں جو انہوں نے ہمیں دکھائیں۔ ان کا موضوع اسلام کا بین الاقوامی قانون ہے۔ اردو زبان میں عہد نبویؐ کے میدان جنگ، عہد نبویؐ کا نظامِ حکمرانی، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، اسلامی اصولِ قانون اور نظریۂ دستور کا ارتقاء، امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی، عہد نبویؐ کا نظام تعلیم، سیاسی وثیقہ جات از عہد نبویؐ تا خلافت راشدہ ان کی بلند پایہ تحقیقی کتب ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ٹیپو سلطان اور اردو کی ترقی، یورپ میں ادبی نشاۃ ثانیہ، سلطنتِ مسقط وعمان، مشرق میں انقلاب کے لئے روسی تدابیر، سرورکائناتؐ کی حکومت جیسے عنوانات سے متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک انقرہ کی ارض یوم یونیورسٹی میں لیکچر دیتے رہے ہیں اور اس کے لئے ہر ہفتے پیرس سے انقرہ جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو 8 زبانوں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی،

ترکی اور اطالوی پر عبور حاصل ہے اور ان سب زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ وہ طویل عرصہ تک فرانسیسی زبان کے ایک ماہنامہ جریدے ''فرانس اسلام'' کے مدیر بھی رہے اور ایک تنظیم "جمعية الصداقة الاسلاميه" کے خازن بھی ہیں۔

اس سوال پر کہ آپ نے پیرس ہی کو اپنی مستقل رہائش کے لئے کیوں منتخب کیا؟ ڈاکٹر حمید اللہ نے بتایا کہ ایک تو ایسا تحقیقی ادارہ کہیں اور نہیں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں، دوسرے یہاں 80 لاکھ اور ایک کروڑ کتابوں پر مشتمل ایسی متعدد عظیم الشان لائبریریاں موجود ہیں، جن کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ یہاں ایک ایک موضوع پر مثلاً عالمِ عرب پر خصوصی لائبریریاں موجود ہیں، جن میں موضوع سے متعلق ہر زبان کی کتابیں یکجا مل جاتی ہیں۔ لائبریری السنہ الشرقیہ میں 30 لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ یہاں کا ماحول بھی نسبتاً زیادہ پُرسکون اور علمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ فرانس میں اگر چہ اسلام دشمنی کا جذبہ بہت شدید ہے اور الجزائر میں جو کچھ ہوا، وہ اس کا واضح ثبوت ہے لیکن اس کے باوجود صرف پیرس میں اب تک ایک لاکھ فرانسیسی مسلمان ہو چکے ہیں، یہاں ایک سو سے زیادہ مساجد موجود ہیں، اسلام قبول کرنے والے فرانسیسیوں کا یومیہ اوسط 8 تا 10 ہے، ان میں خواتین کی بڑی تعداد بھی شامل ہے۔ ایک خاتون کا خط آج ہی ملا ہے جس نے اسلام قبول کرنے کی درخواست کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر چہ میرے قریب بھی ایک مسجد موجود ہے، لیکن اس پاکیزہ اور مقدس مقام تک جانے کی میں اپنے اندر ہمت نہیں پاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خط ہمیں بھی دکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کل یہاں کسی ایک موضوع سے متعلق عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے نقطہ نظر کے اظہار کا پروگرام چل رہا ہے جس میں اسلام کے نقطہ نظر کی ترجمانی کے لئے میرا انتخاب کیا گیا ہے۔ موجودہ موضوع حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ تحقیق کے دوران نئے گوشے میرے سامنے آئے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کی رامائن اور یونانیوں کے مشہور شاعر ہومر (Homer) کی نظم اوڈیسی حضرت ابراہیمؑ کے دور کی تصانیف ہیں اور ان کی واقعہ نگاری پر حضرت ابرہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے واقعہ کا اثر موجود ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ مسلمان جو واقعہ حضرت اسماعیلؑ سے منسوب کرتے ہیں وہ دراصل حضرت اسحاقؑ سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے ان کی کتابوں سے اور تاریخی ترتیب کے لحاظ سے

ثابت کیا ہے کہ قرآن کا بیان کردہ واقعہ ہی درست ہے۔ اس پر یہودی علماء نے مجھ سے علیحدگی میں کہا کہ ہم تمہاری تحقیق کو صحیح تسلیم کرلیں تو ہمارا تو سارا مذہب ہی باطل قرار پائے گا اور کھیل بکھیڑا ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا کام تحقیق ہے، ثبوت پیش کر دیئے ہیں، ماننا نہ ماننا آپ کا کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں آج کل ایک ایسی جگہ مسجد کی تعمیر میں مصروف ہوں جہاں فرانسیسی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے لیکن ان کے لئے مسجد نہیں تھی۔ ایک عمارت خرید لی گئی ہے۔ پانچ لاکھ فرانک ادا کئے جا چکے ہیں، اتنی ہی رقم مزید مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔

ہمیں شدت سے احساس تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی بہت قیمتی شے یعنی وقت ضائع کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں، چنانچہ ہم نے اجازت چاہی اور گزارش کی کہ کوئی کلمۂ نصیحت عطا فرمایئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال انکساری کے ساتھ کہا ''استغفر اللہ! میں اور کلمۂ نصیحت'' آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی کوئی تواضع نہ کرنے پر پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔''

اس گفتگو کے دوران قاضی اسد عابد صاحب نے اپنا کیمرہ نکال لیا اور ڈاکٹر صاحب سے ایک تصویر کی اجازت چاہی۔ انہوں نے فوراً اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور کہا ''میں ناجائز کام کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں'' میں نے قاضی اسد عابد صاحب کو کیمرہ بند کر لینے کا اشارہ دیا اور تصویر پر اصرار نہیں کیا۔ یہ مضمون اسی لئے ڈاکٹر صاحب کی تصویر سے خالی ہے۔ رخصت ہوتے وقت ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ مجھے ابھی تک وزیراعظم سے ملاقات کے صحیح وقت کی اطلاع نہیں ہو سکی، میں نے عرض کیا کہ آپ کے ہاں ٹیلی فون نہ ہونے کی وجہ سے تاخیر ہوئی ہوگی۔ میں کسی کو بھیج کر آپ کو اس کی اطلاع دیتا ہوں۔ ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر صاحب کو سفارتخانہ کے ایک افسر نے یہ اطلاع بہم پہنچا دی۔

ہم واپسی پر راستے میں دیر تک اس مرد قلندر کے علم و فضل، اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے اس کی بے مثل خدمات اور اس کی سادگی، خوش خلقی اور عاجزی و انکساری پر اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے رہے۔

جمعرات 16 جنوری کو صبح ساڑھے دس بجے وزیراعظم سے ڈاکٹر حمید اللہ کی

ملاقات تھی۔ ان کے لئے گاڑی کا انتظام تھا، مگر انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں روزانہ میٹرو (زیرزمین ٹرین) سے سفر کرتا ہوں، اس کے ذریعے آ جاؤں گا، کوئی صاحب زحمت نہ فرمائیں۔ وہ مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گئے، فرانسیسی وزیر دفاع سے وزیراعظم کی ملاقات 11 بجے طے تھی۔ پہلے سے جاری ملاقات میں کچھ زیادہ دیر ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب کی باری آنے پر وزیر دفاع تشریف لے آئے۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ آدھے گھنٹہ انتظار فرمالیں، میں آپ سے بہت اطمینان کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے ذرا بھی بدمزگی کا اظہار نہ کیا اور کہا کہ میں گھنٹوں انتظار کے لئے تیار ہوں، آپ کی دوسری مصروفیات زیادہ اہم ہیں، وہ میرے ساتھ تقریباً پون گھنٹہ بیٹھے رہے اور دوسرے متعدد اصحاب ان سے گفتگو کا فیض اٹھاتے رہے۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقات کے لئے پانچ افراد کا پینل مقرر کیا تھا، جن میں راقم بھی شامل تھا، لیکن میرے اور سینیٹر فتح محمد خاں کے سوا اس میں باقی تین ارکان میں سے کوئی شریک نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی تعارف میرے ذمہ تھا، وزیراعظم ان کی خدمت اور شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ نفاذ اسلام کے سلسلہ میں اپنی ذاتی تجویز اور مشوروں سے نوازیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا کہ "میں یہاں بہت دور بیٹھا ہوں، پاکستان کے حالات سے زیادہ واقف نہیں، آپ کو کیا مشورہ دوں؟ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ پر توکل رکھیے اپنا کام اسی کے بھروسے پر کرتے جائیے، وہ ساری رکاوٹیں دور کرتا اور آسانیاں پیدا کرتا چلا جائے گا۔" وزیراعظم نے اب تک کے کام اور مجوزہ آئینی ترمیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے عزائم سے باخبر کیا، تو انہوں نے غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا اور ان کی کامیابیوں کے لئے دعا کی۔ وزیراعظم نے جب پوچھا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ تو ڈاکٹر صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت بے نیازی کے ساتھ جواب دیا "خدا کا فضل ہے، میں کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا"۔ اس موقع پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو یاد دلایا کہ آپ کسی مسجد کی تعمیر کے لئے فنڈ کی کمی کا ذکر کر رہے تھے، اس کی کچھ تفصیل وزیراعظم کو بتائیے، انہوں نے کچھ تامل کیا تو میں نے ہی اس کی تفصیل پیش کی،

وزیراعظم نے فرمایا کہ پانچ لاکھ فرانک، ایک لاکھ ڈالر کے برابر بنتے ہیں، یہ پوری رقم حکومت پاکستان کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو ادا کر دی جائے گی اور پاکستان کے لئے یہ بڑی سعادت کی بات ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر وزیراعظم کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے کہا کہ میں وہاں آ کر کیا خدمت کر سکوں گا۔ یہاں ہمہ وقت تحریری کام اور نو مسلم فرانسیسیوں کی تعلیم و تربیت پر لگا رہتا ہوں۔ یہ کام میری غیر حاضری سے متاثر ہوگا۔ وزیراعظم نے کہا آپ کی آمد ہمارے لئے باعث برکت ہوگی اور پوری قوم آپ کو اپنے درمیان پا کر خوشی محسوس کرے گی۔ ایک ہفتہ ہی کے لئے زحمت فرمالیجئے۔ آپ میرے مہمان ہوں گے۔ مجھے اپنی سہولت کے مطابق اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع فرما دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور بعد ازاں میرے نام ایک خط میں بتایا کہ میں رمضان کے بعد اور انگریزی مہینے کے آغاز پر آ سکتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ لکھا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہوں نے وزیراعظم کے نام خط اردو میں خود ٹائپ کیا، وہ انگریزی، اردو اور فرانسیسی خود ہی ٹائپ کرتے ہیں اور اکثر مسودہ کے بغیر براہ راست ٹائپ رائٹر پر عبارت تیار کرتے ہیں۔

وزیراعظم نے ڈاکٹر صاحب کے حالات سن کر یہ بھی پیش کش کی کہ آپ کے لئے حکومت کی طرف سے ایک ملازم فراہم کر دیا جائے گا جو گھر اور باہر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹا سکے گا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے اس سے محفوظ ہی رکھیئے۔ وہ میرا وقت خراب کرے گا جسے میں اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق صرف کرتا ہوں۔ وزیراعظم نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے اس پر بھی غور کرنے کا وعدہ کیا۔ ٹی وی کے کیمرہ مین داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور وزیراعظم سے کہا کہ مجھے اس سے محفوظ رکھیئے۔ وزیراعظم کے اشارے پر تمام کیمرہ مین باہر نکل گئے۔ اس لئے یہ ملاقات ٹی وی پر پیش نہ کی جا سکی۔

جمعہ کو اپنی روانگی سے قبل میں ایک بار پھر الوداعی ملاقات کے لئے ڈاکٹر صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اپنے ایک شاگرد کے ساتھ نماز مغرب ادا کر رہے تھے اور خود امام تھے۔ ان کی قرأت کی آواز دروازہ سے باہر صاف سنائی دے رہی تھی۔ اختتام نماز

تک میں دروازے کے باہر منتظر کھڑا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے نماز سے قبل بجلی بجھا دی اور نماز ختم کرتے ہی بلب پھر روشن کر دیئے۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ شیشوں سے باہر ارد گرد کے لوگ نماز پڑھتے نہ دیکھیں کیونکہ اس سے ظاہر داری اور غائشی عبادت کا پہلو نکلتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ آپ کا خط وزیر اعظم کو پہنچا دیا گیا ہے۔ انہوں نے بڑی دعائیں دیں اور مسجد کا مسئلہ حل ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ میں چونکہ اس بار تنہا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا مراکشی شاگرد اردو سے ناواقف، اس لئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے ایک نازک سوال کر ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب آپ زندگی بھر قرآن وسنت کا درس دیتے رہے اور اس پر عمل بھی کرتے رہے، مگر آپ نے ایک سنت پر عمل نہیں کیا یعنی سنت نکاح، اس کا کیا جواز ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے ایک لحہ کا توقف کئے بغیر کہا کہ ''میں سخت گناہ گار ہوں، مجھے خود اس کا احساس ہے اور اب بڑھاپے میں تو اس کوتاہی کا بہت شدت سے احساس ہے، اللہ مجھے معاف فرمائے۔ آپ بھی میری اس کوتاہی پر معافی اور مغفرت کی دعا کیجئے۔ اس عمر میں اس کوتاہی کا ازالہ کرنا بھی چاہوں تو اب اس کا امکان کہاں؟'' یہ کہہ کر مزید کھلے اور اصل سبب بتایا کہ ہمارے ہاں یہ کام والدین کے ذمہ ہوتا ہے۔ میں چونکہ ایک طرف وطن سے دُور یہاں تنہا رہا اور دوسری طرف والدین سے بھی محروم تھا، اس لئے خاندان میں کسی کو خیال نہ آیا۔ میں تعلیم وتحقیق میں اس درجہ منہمک اور مستغرق رہا کہ اس طرف توجہ ہی نہ گئی، بس یوں ہی وقت گزرتا گیا۔ یہ کوتاہی عمداً نہیں ہوئی، سہواً حالات نے اس کے اسباب پیدا کر دیئے۔ میں نے دوسرا سوال تصویر سے اس درجہ گریز کے بارے میں کیا تو ڈاکٹر صاحب نے وہی جواب دیا کہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں۔ میں نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ کی تصویروں کا حوالہ دیا تو انہوں نے کہا کہ تصویر کو انہی ناگزیر ضروریات تک محدود رہنا چاہئے، یہ تشہیر کا نہیں شناخت کا معاملہ ہے۔ میں تشہیر کے لئے تصویر کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟ یہ جواب تھا اس شخص کا، جس کی زندگی تصویروں کے سیلاب کے درمیان سے گزری ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ سے میں نے پوچھا: ''آپ پاکستان میں وزارتِ تعلیم جیسا کوئی منصب سنبھالتے تو کیا اس کے دُورِ رس نتائج برآمد نہ ہوتے؟'' ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: ''میں نے جس کام کے لیے

خود کو وقف کیا ہے وہ کسی ملک کے وزیراعظم سے زیادہ اہم ہے۔" اس کا گھر آج تک ٹی وی اور ریڈیو تک کے وجود سے خالی ہے۔ ذرا غور کیجئے اس کے گھر میں بیوی بچے ہوتے، ریڈیو اور ٹی وی ہوتے اور ٹیلی فون موجود ہوتا تو مجموعی طور پر عمر عزیز کا کتنا حصہ ان کی نذر ہوتا اور دنیا اس عظیم محقق، مصنف اور مفسر کی کتنی قیمتی کتابوں سے اور تبلیغی خدمات کے کتنے نتائج سے محروم رہ جاتی؟ بظاہر یہ ایک غیر فطری اور غیر متوازن زندگی ہے، لیکن جس شخص نے زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے مشن کے لئے وقف کر دیا ہو، اس کے بارے میں کوئی اپنے دل سے پوچھے کہ رازِ حیات اس پر کھلا ہم پر۔

یہ ایسی ہی ہستیوں کا توفیض ہے کہا آج فرانس میں عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے اور اس کی قبولیت کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہے۔



ڈاکٹر محمد حمید اللہ
بیسویں صدی کے ممتاز ترین محقق

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈاکٹر حمید اللہؒ مرحوم کی شخصیت کوئی ایسی غیر معروف نہیں کہ ان کے بارے میں ضروری معلومات بتانے یا کسی رسمی تعارفی گفتگو کی ضرورت پیش آئے۔ اسلامی علوم کا ہر سنجیدہ طالب علم اجمالی طور پر یہ بات جانتا ہے کہ ان کے کام کی نوعیت کیا تھی اور وہ دنیائے اسلام کے کتنے بڑے مفکر اور کتنے بڑے مصنف تھے۔ لیکن یہ بات ان کے خاص قارئین کے علاوہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وسعت نظر، تعمق علمی اور اپنی دلچسپیوں کے دائرے کی ہمہ گیری اور تنوع کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا کیا مقام تھا۔ شاید بیسویں صدی کے کسی اور مصنف یا اسلامی سکالر میں وہ وسعت علمی اور گہرائی نہیں پائی جاتی جو ڈاکٹر حمید اللہؒ میں پائی جاتی تھی۔ اسلامی علوم وفنون کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا رہا ہوگا جس میں مرحوم ڈاکٹر صاحب نے انتہائی فاضلانہ، عالمانہ اور انتہائی عمیق تحقیق کے نتائج دنیائے اسلام کے سامنے پیش نہ کیے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اصل میں قانون کے طالب علم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت قانون کے میدان میں ہوئی۔ وہ قانون ہی کے استاد اور قانون ہی کے مصنف تھے۔ قانون میں بھی اصول قانون اور بین الاقوامی قانون ان کے دلچسپی کے میدان تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دو عشروں میں ان کا بیشتر کام بین الاقوامی قانون کے میدان میں تھا۔ بین الاقوامی قانون پر انہوں نے فرانسیسی اور انگریزی سے اردو میں کئی کتابیں ترجمہ کیں جو

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کے تحت شائع ہوئیں۔ ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید بین الاقوامی قانون پر اردو میں قدیم ترین تحریریں شاید ڈاکٹر حمید اللہ ہی کی ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں'' ان کے بہت ابتدائی دور کی کتاب ہے جس کا پہلا ایڈیشن شاید تیس کی دہائی میں شائع ہوا تھا جب ڈاکٹر صاحب کی عمر ۲۶، ۲۷ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج دنیائے اسلام میں جو فکر پیدا ہو رہی ہے کہ مغربی علوم وفنون کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے اور اس کی اس انداز سے تدوین نو کی جائے کہ مغربی علوم وفنون اور اسلامی تصورات میں جو حصے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، ان کو ایک نئے انداز سے مدون کر کے اسلامی علوم کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا جائے، یعنی وہ عمل جسے ''اسلامائزیشن آف نالج'' کا نام دیا جاتا ہے اور جس پر ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کئی بزرگوں نے نہایت قابل قدر خدمات بھی انجام دیں، اگر ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کو دیکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں پہلا علمی قدم انہوں نے ہی اٹھایا کہ بین الاقوامی قانون کے ان تمام مغربی تصورات کو سامنے رکھا، ان کا ناقدانہ جائزہ لیا، پھر اسلامی تعلیم اور اسلامی فقہ میں بین الاقوامی تعلقات اور قانون جنگ اور قانون صلح کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس کو اس طرح سے مرتب اور مثبت مغربی تصورات سے ہم آہنگ کیا کہ ایک بالکل نئی چیز قوم کے سامنے پیش کی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ انہوں نے جس کام کی داغ بیل آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ڈالی تھی اس کو آگے بڑھایا جائے اور ان تمام علوم وفنون کا، جو آج کی دنیا پر اثر انداز ہو رہے ہیں، اس انداز سے جائزہ لیا جائے کہ اس میں کیا چیز اسلام کی تعلیم سے ہم آہنگ ہے اور کیا چیز متعارض۔ جو متعارض ہے اس کو دلائل کے ذریعے سے ثابت کیا جائے کہ یہ متعارض ہے، اور جو ہم آہنگ ہے اس کو اسلامی تعلیم کے ساتھ ملا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ علم کی وحدت کا جو اسلامی تصور ہے، وہ ہمارے سامنے آجائے۔

بین الاقوامی قانون سے دلچسپی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو اسلام کے قانون بین الاقوام سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کے لیے وہ قانون بین الممالک کی اصطلاح کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ اسلامی قانون کے بین الاقوامی پہلو پر انہوں نے کام شروع کیا اور

۱۹۳۳ء میں جرمنی کی بون یونیورسٹی میں اپنا وہ مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا: Neutialitat in Islamischen Volkeriecht یعنی (Neutrality in Muslim International Law) یہ اپنی نوعیت کا انوکھا کام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو انتہائی متواضعانہ انسان تھے اور اپنی کسی چیز کے بارے میں کبھی تعلّی سے کام نہیں لیتے تھے، خود مجھ سے فرمایا کہ جرمن کیا بلکہ کسی بھی مغربی زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی تحریر ہے جس میں بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اسلامی تصور پر اس طرح مدلل علمی انداز سے بحث کی گئی ہو اور اس کو بیان کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ جرمنی میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کو ڈگری ملی اور ۱۹۳۵ء میں یہ شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی سے پچھتر روپے ماہوار وظیفہ پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے یہ سفر شروع کیا تھا، اور ان کو غالباً تین سال کی چھٹی ملی تھی۔ سب سے پہلے وہ جرمنی تشریف لے گئے اور دس مہینے کی مختصر مدت میں یہ مقالہ تیار کر کے پیش کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس پر ان کو خیال ہوا کہ ابھی وظیفہ کی مدت باقی ہے کیوں نہ وہ پیرس جائیں اور سوبورن یونیورسٹی سے دوسری ڈگری حاصل کر لیں۔ چنانچہ وہ سوبورن یونیورسٹی چلے گئے اور اگست ۱۹۳۴ء میں انہوں نے دوسرا مقالہ پیش کیا جس کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ "نظری مباحث" پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ ان دستاویزات کا ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ سے متعلق ہیں۔ ان دستاویزات کی نوعیت یہ ہے کہ ان سے اسلام کے سیاسی نظام اور بین الاقوامی تعلقات اور اس زمانے کے لحاظ سے بین القبائلی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ مقالے کا عنوان تھا: La Diplomatie Musulmane a l' epoch an Prophete de 'l'Slam et se caliphes Othodoxes۔ یہ مقالہ بھی پیرس میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اور اب دستیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ مہربانی اس کی فوٹو کاپی مجھے عنایت فرمائی تھی جو میرے پاس موجود ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ چاہتے تھے کہ ابھی ایک سال باقی ہے اور پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ ان کو اگر ملتا رہے تو وہ لینن گراڈ جا کر پی ایچ ڈی کی تیسری ڈگری بھی حاصل کر لیں۔ اس دوران میں انہوں نے روسی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ وہ لینن گراڈ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کسی افسر حسابات قسم کی مخلوق نے ان کو

نوٹس دیا کہ آپ کو یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کی رُو سے جرمنی جانے کی اجازت دی گئی تھی، آپ بغیر اجازت پیرس چلے گئے اور اب کہیں اور جانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ فوراً واپس آئیں اور جواب دیں کہ کیوں نہ آپ کے خلاف محکمانہ کارروائی کی جائے۔ نہیں معلوم کہ ڈاکٹر صاحب نے اس محکمانہ کارروائی کا کیا جواب دیا، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لینن گراڈ سے پی ایچ ڈی نہ کر سکے اور واپس عثمانیہ یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انہوں نے اس مقالے کو جو اس سے پہلے وہ ایم۔ اے کے لیے پیش کر چکے تھے، نئے انداز سے ترتیب دے کر "Muslim Conduct of State" کے نام سے پیش کیا اور غالباً ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء کے زمانے میں پی ایچ ڈی کی تیسری ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں انہیں بہت سے اساتذہ سے کسب فیض کرنے کا اتفاق ہوا، جن کے وہ ہمیشہ مداح اور معترف رہے۔ اپنے اساتذہ میں وہ بہت تواتر سے مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام لیا کرتے تھے جو وہاں دینیات اور اسلامیات کے صدر شعبہ تھے۔ اس کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا گیلانی سے بھرپور استفادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تینوں کتابیں، خاص طور پر ان کی آخری کتاب "Muslim Conduct of State" اپنے موضوع پر انتہائی منفرد کتاب ہے۔ بین الاقوامی قانون کا اس زمانے میں جو تصور تھا اور اس وقت تک اس نے جو ترقی کی تھی اس کو سامنے رکھ کر انہوں نے اس سارے اسلامی مواد کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ اس زمانے میں بین الاقوامی قانون کی انتہائی مقبول کتاب اوپن ہائم کی ''انٹرنیشنل لاء'' تھی جو دو جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں درسی کتاب کے طور پر معروف و مقبول تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو بطور نمونہ کے سامنے رکھا، اس میں مضامین کی جس طرح تقسیم تھی اس کو اپنایا اور فقہ اسلامی کے علاوہ پورے اسلامی ادب میں بین الاقوامی تعلقات پر جو مواد دستیاب تھا، اس سب کو کھنگال کر سارے مواد کو ایک نئی ترتیب سے مرتب کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب ۱۹۴۰-۴۱ء تک اسلامی تحقیق کا شاید سب سے اعلیٰ نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اتنی فاضلانہ کتاب اور اتنے ٹھوس اور عمیق مطالعے پر مبنی کہ جس میں دستیاب مواد کی ہر چیز کو سمو لیا گیا ہو، شاید کوئی اور موجود نہیں ہے۔ اس زمانے میں یعنی بیسویں صدی میں اسلام کے بین الاقوامی قانون، قانون جنگ و

صلح پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کی تعداد اب سینکڑوں میں ہے، لیکن اس کتاب کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ جامعیت میں کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بین الاقوامی قانون ۱۹۴۱ء تک، جیسا کچھ تھا، اس میں زیر بحث کوئی اہم اور بنیادی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اوپن ہائم نے اٹھایا ہو اور ڈاکٹر صاحب نے اسلامی ماخذ اور مصادر سے تلاش کر کے اس کا جواب نہ دیا ہو۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے فقہ اصول فقہ کی کتابوں سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اس کے علاوہ تاریخ، سیرت اور مسلمانوں کی حربیات، مسلمان ملاحوں کی یادداشتوں اور ان کی بحریات، مسلمان سیاحوں کے تذکرے اور یادداشتیں، سفرنامے غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انہوں نے اس کتاب میں کام نہ لیا ہو۔ بین الاقوامی قانون پر ڈاکٹر صاحب مزید کام کرتے رہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ انہوں نے ان دستاویزات پر جو ان کے فرانسیسی مقالے کی دوسری جلد کا حصہ تھیں، مزید کام کیا۔ اور ۱۹۴۰ء میں شاید پہلی مرتبہ ان دستاویزات کا عربی متن شائع کیا۔ یہ عہد نبوی کی سیاسی دستاویزات کا اب جامع ترین اور مقبول ترین مجموعہ ہے "الوثائق السیاسیہ فی العھد النبوی والخلافۃ الراشدۃ" کے نام سے پہلی بار ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ مسلسل اپنی تحقیق میں اضافہ کرتے رہتے تھے اور اگر کہیں ایک لفظ کے اضافے کی گنجائش انہیں معلوم ہوتی تھی تو اپنے خاص نسخے میں اضافہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں اس کتاب کی آٹھ اشاعتیں سامنے آئیں اور ہر ایڈیشن میں پہلے کے مقابلے میں اضافے اور مزید تفصیلات انہوں نے بیان کی ہیں۔ غالباً اسی زمانے میں جب وہ ان وثائق و دستاویزات پر کام کر رہے تھے، ان کو سیرت کے کام سے دلچسپی ہوئی اور پھر انہوں نے زندگی کے بقیہ پانچ چھ عشرے سب کے سب سیرت کے کام میں صرف کیے۔ "Muslim Conduct of State" کے بعد غالباً بین الاقوامی قانون پر انہوں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا، چھوٹی موٹی تحریر لکھی ہو یا سابقہ کتابوں کے مختلف ایڈیشنوں میں اضافے کیے ہوں تو الگ بات ہے، لیکن کوئی نئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کے بعد ان کی تمام تر توجہ کا مرکز سیرت اور علم الحدیث رہے۔

علم الحدیث میں ان کے کام کی حیثیت ایک خاص انداز کی ہے۔ وہ معروف معنوں میں محدث نہیں کہلائے۔ انہوں نے علم حدیث کی تدریس کا اس انداز سے کام نہیں کیا جیسا علم حدیث کے اساتذہ کرتے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی تاریخ میں وہ ایک منفرد مقام کے حامل ہیں، اتنے منفرد مقام کے کہ اگر علم حدیث کی تاریخ لکھی جائے تو شاید "ڈاکٹر حمید اللہ کا کام" اس تاریخ کا ایک منفرد عنوان ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستشرقین نے پچھلی صدی کے اواسط سے ایک خاص نقطہ نظر اپنایا تھا کہ علم حدیث کے نام سے جو ذخیرہ مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے، یہ تاریخی اعتبار سے مستند نہیں ہے، اس لیے کہ علم حدیث کے بیشتر متداول مجموعے تیسری صدی میں مرتب ہوئے۔ اس وجہ سے مستشرقین نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ چونکہ تین چار سو سال کے بعد یہ چیزیں لکھی گئی ہیں اور اس وقت تک بقول ان کے زبانی یادداشتوں کے ذریعے سے چلتی رہیں اور زبانی یادداشتوں میں سہو اور نسیان کا جو امکان ہے وہ واضح ہے، اس لیے تاریخی اعتبار سے یہ سارا ذخیرہ غیر مستند ہے۔ اس تصور کو مختلف مستشرقین آگے بڑھاتے گئے اور اس کا سب سے بڑا اظہار جرمن مستشرقین کے ہاں ہوا ہے ان کی تحریریں مشہور و معروف ہیں، جن کے اثرات برصغیر میں بھی ہوئے۔ برصغیر کے بعض بااثر اور مقبول مصنفین نے ان خیالات کو زیادہ پُرجوش اور مؤثر انداز میں یہاں پھیلایا۔ خود مصر میں ایک دو مصنفین آئے جو ان کے خیالات سے متاثر ہوئے اور مصر میں بھی اس کے اثرات پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ان اولین شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے اس موضوع کا علمی جواب دینے کا فیصلہ کیا اور بڑی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ صحابہ کرام اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں حدیث کی تحریر و تسوید اور تدوین کا کام شروع ہو چکا تھا جس میں دور تابعین میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ صحابہ کرام سے یہ پورا ذخیرہ زبانی اور تحریری دونوں انداز سے تابعین کو منتقل ہوا اور اسی انداز سے تابعین نے اپنے بعد کی نسل تک پہنچایا۔ اس وقت حدیث کے جتنے مجموعے ہمارے سامنے ہیں یہ سب کے سب نہ صرف سند متصل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے ہیں بلکہ ہر دور میں، ہر سطح پر تحریری یادداشتیں اور ذخیرہ بھی موجود تھا جن پر اس کی بنیاد ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے سب سے پہلے

غالباً ۴۳-۱۹۴۲ء میں صحیح بخاری کے مآخذ پر کام شروع کیا اور ابتدائی طور پر انہوں نے یہ پتہ چلایا کہ صحیح بخاری کے مآخذ میں ایک بڑا اہم مآخذ امام عبدالرزاق صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) بھی ہیں۔ امام عبدالرزاق صنعانی کی کتنی احادیث صحیح بخاری میں ہیں، اس کا انہوں نے جائزہ لیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ امام عبدالرزاق نے اپنے تمام حدیثی ذخیرے کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر لیا تھا، جو اس وقت تک نہیں چھپا تھا لیکن اب چھپ چکا ہے اور مصنف عبدالرزاق کے نام سے ہر جگہ دستیاب ہے۔ اس لیے امام بخاری اور امام عبدالرزاق کے درمیان یہ کہنا کہ سنی سنائی باتیں نقل کر دی گئیں، درست نہیں ہے۔ پھر عبدالرزاق کے اساتذہ میں ان کے مآخذ میں انہوں نے یہ بتایا کہ اہم ترین مآخذ معمر بن راشد ہیں جن کا تحریری ذخیرہ جو اس وقت نہیں چھپا تھا، آج چھپ چکا ہے اور ''جامع معمر'' کے نام سے دستیاب ہے۔ یوں معمر بن راشد کے ذریعے سے تابعین کی سطح تک تحریری ذخیرے کی نشان دہی ہو گئی۔ پھر معمر بن راشد کے مآخذ میں دو مآخذ کا خاص طور پر انہوں نے ذکر کیا۔ ایک عبداللہ بن عمرو بن العاص، جن کے بارے میں تمام کتب حدیث میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ''صحیفہ صادقہ'' کے نام سے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ دوسرا مجموعہ حضرت ابو ہریرہ کے تلامذہ ہمام بن منبہ کا مرتب کردہ تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک مثال سے معمر بن راشد کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مجموعہ احادیث پانچ سو روایت پر مشتمل تیار ہوا تھا، اس ذخیرے سے معمر بن راشد نے فائدہ اٹھایا، معمر بن راشد نے وہ ذخیرہ عبدالرزاق کو منتقل کیا، عبدالرزاق نے وہ ذخیرہ امام بخاری کو منتقل کیا اور یوں امام بخاری کی کتاب سامنے آئی جو اپنی ترتیب کی عمدگی اور جامعیت کی وجہ سے مقبول ہوئی، بقیہ مجموعوں میں ترتیب کی وہ عمدگی نہیں تھی یا وہ جامعیت نہیں تھی اس لیے وہ مقبول نہیں ہو سکے۔ یہ آج کہنے کو بڑی آسان بات لگتی ہے، لیکن اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے کتنا مطالعہ کرنا پڑا ہو گا، کتنے کتب خانوں کی چھان بین کرنی پڑی ہو گی اور کتنے طویل سال لگے ہوں گے، اس کا اندازہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جو بات لکھی، اس کی بنیاد پر دورِ جدید میں بہت سے مصنفین نے

اس اسلوب تحقیق کو آگے بڑھایا اور پھر دلائل، قرائن اور شواہد سے اس بات کو پورے طور پر ثابت کر دیا کہ علم حدیث صرف زبانی روایات پر مبنی نہیں بلکہ انسانی وسائل کے اعتبار سے کسی بھی ذخیرہ علم کو محفوظ کرنے کے لئے جو اسالیب انسانوں کے لیے ممکن ہیں ان سب سے کام لے کر علم حدیث کے ان قیمتی ذخائر کو محفوظ کیا گیا ہے۔ آج کوئی مستشرق یا مستشرقین سے متاثر کوئی مستغرب یہ بات نہیں کہتا کہ علم حدیث کی بنیاد سنی سنائی روایات پر ہے۔ یہ وہ بنیادی اہمیت کا کام ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ نے علم حدیث کے باب میں کیا، جس کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم حدیث کی تاریخ کے ایک انتہائی بنیادی پہلو سے متعلق ہے۔ اس سے ایک اور نئی جہت اور نئی رو کا آغاز ہوا ہے۔

علم حدیث کے ذریعے سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق علم سیرت سے پیدا ہوا۔ پھر انہوں نے تمام تر زندگی سیرت پر کام کرتے ہوئے گزار دی۔ کہا جا سکتا ہے کہ سیرت پر جو کام ہونا تھا، وہ ہو چکا، جنہیں لکھنا تھا لکھ چکے، اب سیرت پر کوئی نئی معلومات اور ذخیرہ کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب نے کوئی نیا ذخیرہ سیرت تو دریافت نہیں کیا۔ جو واقعات اور روایات سیرت پر دستیاب ہیں ڈاکٹر صاحب نے انہی وقائع اور واقعات سے کام لیا۔ لیکن انہوں نے بعض ایسے سوالات اٹھائے اور بعض ایسے سوالات کے جوابات دیے جن سے قدیم مصنفین نے اعتنا نہیں کیا تھا۔ اس میں سے میں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس انداز سے سیرت کے واقعات کو بیان کیا اور اس کی تشریح و توضیح کی۔ ایک مزید بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے علم حدیث اور حدیث کے ذخائر سے کام لینے کے ساتھ ساتھ جب سیرت پر اپنی کتابیں تصنیف اور مرتب کیں اور خاص طور پر فرانسیسی زبان میں جو ان کی دو جلدوں میں سیرت ہے، وہ اپنے موضوع پر عجیب اور منفرد انداز کی تحریر ہے۔ اس میں انہوں نے صرف سیرت اور حدیث کی کتابوں سے مدد نہیں لی بلکہ قدیم جاہلی ادب، علم انساب، تاریخ، تذکرہ، سوانح عمری، سفر ناموں اور ایسی ہی دوسری کتابوں سے بھرپور کام لیا، اور، ان سب میں سیرت سے متعلق جو مواد تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کو اپنی کتابوں میں نہ صرف شامل کیا بلکہ اس سے سیرت کے مختلف واقعات کی توضیح و تشریح میں کام لیا۔

عام طور پر ارباب سیرت کا اسلوب یہ رہا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو ایک تشریحی انداز میں پیش کر دیتے ہیں کہ واقعہ اس طرح پیش آیا، فلاں جنگ ہوئی اور فلاں جگہ ہوئی اور فلاں قبیلے کے ساتھ ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ فلاں علاقے ہی میں یہ جنگ کیوں ہوئی اور فلاں قبیلے ہی کے ساتھ کیوں ہوئی۔ اس قبیلے سے جنگ ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں قبائل ہی سے کیوں مدد لی۔ اس طرح کے سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس علاقے کے اس وقت کے قبائل کا پوری طرح جائزہ لیا جائے اور ان قبائل کے آپس کے تعلقات کو بیان کیا جائے۔

مثال کے طور پر یہ آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلی مرتبہ نجاشی کے پاس سفیر بھیجا تو اس غرض کے لیے حضرت عمرو بن امیہ الضمریؓ کو بھیجا۔ عمرو بن امیہؓ ہی کا انتخاب کیوں ہوا، اس کا کوئی جواب ارباب سیرت کے ہاں نہیں ملتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے لیے بنی ضمرہ قبیلے کی تاریخ کو کھنگالا، پھر بنی ضمرہ کے تعلقات جو اسلام سے ڈھائی سو سال پہلے سے نجاشی کے خاندان سے چلے آ رہے تھے، ان کا پتہ چلایا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ نجاشی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حبشہ کا حکمران تھا، اس کا اپنی نوجوانی میں اپنے چچا یا کسی اور رشتہ دار سے اختلاف ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں دوسرا مدعی تخت نشین ہو گیا اور اس کو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ جلاوطن ہونے کے بعد وہ عرب میں آ گیا اور بنی ضمرہ کے ہاں پناہ گزیں ہوا اور عمرو بن امیہ ضمریؓ کے کسی بزرگ نے اسے پناہ دی اور کافی عرصے وہ ان کے ہاں پناہ گزیں رہا، اس لیے یہ اس قبیلے کا مرہون احسان تھا اور اس قبیلے کے سردار کے ہاتھوں جو نامہ مبارک ملتا تھا اس کے اپنے اثرات بھی تھے، قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک ہونے کے، جو تعلقات پچاس سال سے اس کے اور اس قبیلے کے درمیان چلے آ رہے تھے اس کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت اور حکمت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے کہ افراد کے انتخاب کے معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن اسباب کی بنیاد پر کس حکمت عملی سے کام لیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس طرح مواد کا جائزہ لیا جو بظاہر ارباب سیرت کی نظر میں زیادہ مستند نہیں سمجھا جاتا اور بظاہر سنجیدہ محدثین اور ارباب سیرت نے اس کو درخور اعتنا بھی

نہیں سمجھا۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس میں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔انہوں نے خود مجھے بتایا کہ انہوں نے کئی مرتبہ بالاستیعاب ''الاغانی'' کی تمام جلدیں پڑھی ہیں۔الاغانی خالص ادب کی کتاب ہے اور افسانہ نگاری اور ادبیت کے اعتبار سے اس کا بڑا اونچا درجہ ہے،لیکن کبھی کسی مورخ نے یا کسی سنجیدہ مصنف نے اس کو تاریخی واقعات کا ماخذ نہیں سمجھا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے مصنفین اور اہل علم کے اعتراض کا پورا احساس ہے جو اغانی کی حیثیت کے بارے میں وہ کرتے رہے ہیں۔لیکن اغانی میں اگر کوئی ایسا واقعہ آیا ہے جس سے مثلاً یہ پتہ چلتا ہے کہ بنی ضمرہ کا تعلق نجاشی سے کس نوعیت کا تھا تو اس کو قبول کرنے میں کیا تامل ہے۔اس میں فن رجال کی بحثوں میں جانے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔یوں ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کے خالص ادبی مواد سے بھی کام لیا۔اس پر ہمارے بعض روایتی محدثین اور ارباب علم نے ان پر تنقید بھی کی اور یہ محسوس بھی کیا کہ وہ غیر مستند روایات سے کام لے رہے ہیں۔لیکن ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ خالص حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے متعلق کسی چیز کے بارے میں انہوں نے کوئی غیر مستند روایت قبول نہیں کی۔لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہے کہ اس سے کسی مستند روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے تو اس طرح کی روایات لینے میں انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کس طرح کے سوالات اٹھائے اس کی ایک چھوٹی سی مثال دینا چاہوں گا۔عام طور پر سب ارباب سیرت نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو کعب بن اشرف، جو یہودیوں کے قبیلے کا سردار تھا،اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کرتا تھا،اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی بدزبانی کرتا تھا۔اس کی بدزبانی اور سازشوں سے دق ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''کعب بن اشرف سے کون نمٹ سکتا ہے؟''محمد بن مسلمہ انصاریؓ نے کہا کہ میں نمٹ سکتا ہوں۔چنانچہ وہ اپنے چند معتمد ساتھیوں کو خاموشی سے لے کر گئے اور رات کو جا کر اس کو قتل کر کے آ گئے۔سب نے اس کی تفصیلات بیان کیں کہ کیسے گئے،کس طرح کا لباس پہنا ہوا تھا اور کس راستے سے گئے۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ایک آدمی بھیج کر کعب بن اشرف کو قتل کرا دیا تھا تو کیا یہ مان لیا جائے کہ حکمران اپنے کسی سیاسی مخالف کو جب چاہے رات کو دو آدمی بھیج کر قتل کرا دے۔ اور کیا اسلام میں یہ جائز ہے؟ اگر اس سوال کا مستند جواب تلاش کیا جائے تو کسی بھی قدیم مصنف کے ہاں یہ جواب نہیں ملتا۔ بلکہ کسی قدیم مصنف نے یہ سوال ہی سرے سے نہیں اٹھایا۔ یا تو انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی یا اس زمانے کے حالات میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا، آج کل کے حالات میں بہر حال یہ سوال پیدا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال اٹھایا اور اس پر غور شروع کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ یہ طے ہو کہ کعب بن اشرف کی حیثیت کیا تھی۔ یہ جاننے کے لیے ضروری تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ یثرب کی اس وقت کی حدود کیا تھیں؟ جس کو ہم دارالاسلام یا مدینۃ الرسول کہتے ہیں، وہ کیا تھا؟ اس کے لیے جغرافیہ کا مطالعہ ضروری تھا۔ چنانچہ جغرافیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس پر کتنے سال لگے، میں نہیں جانتا۔ انہوں نے یثرب کی حدود متعین کیں۔ پھر یہ متعین کیا کہ کعب بن اشرف کا تعلق جس علاقے سے تھا وہ یثرب کی حدود میں داخل تھا یا نہیں، تحقیق ہوئی کہ وہ داخل نہیں تھا۔ جب داخل نہیں تھا تو اس کی حیثیت کیا تھی؟ کیا وہ معاہد تھا یا مصالح تھا یا محارب تھا۔ انہوں نے تحقیق سے ثابت کیا کہ وہ محارب تھا۔ لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ وہ محارب علاقے سے تعلق رکھتا تھا، یہ ثابت ہو بھی جائے تب بھی بعض سوالات تشنہ رہ جاتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب کعب بن اشرف کا قتل ہوا تو اس سے پہلے میثاق مدینہ لکھا جا چکا تھا۔ اگر میثاق مدینہ لکھا جا چکا تھا تو یہودی میثاق مدینہ میں شامل تھے اور کعب بن اشرف بھی شامل ہوگا اس لیے وہ معاہد ہوگا، محارب نہیں، اس سے پہلے محارب رہا ہوگا۔ اب انہوں نے میثاق مدینہ پر تحقیق شروع کی اور کافی تحقیق کے بعد ثابت کیا کہ آج جو میثاق مدینہ ہمارے سامنے ہے، یہ نہ ایک دستاویز ہے اور نہ ایک وقت میں لکھی گئی۔ بلکہ یہ تین دستاویزات کا مجموعہ ہے اور تین مختلف اوقات میں لکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ جنگ بدر کے فوراً بعد لکھا گیا۔ دوسرا حصہ جنگ احد سے تھوڑا پہلے لکھا گیا۔ اور اس کا تیسرا حصہ جنگ احد کے بعد لکھا گیا اور جیسے جیسے یثرب کے قبائل اس میں شامل ہوتے گئے ان کے لیے شرائط کا اضافہ ہوتا گیا اور دستاویز کے دوسرے حصے اس میں شامل ہوتے گئے۔

یہ تحقیق کرنے کے بعد انہوں نے ایک روایت کو بنیاد بنایا جو سنن ابوداؤد میں ہے، جس میں ایک باب ابوداؤد نے باندھا ہے "باب اس بیان میں کہ بنونضیر کے یہودیوں کو مدینہ سے کیسے جلاوطن کیا گیا؟" اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ لکھ لیا اور اہل مدینہ کو امان دے دی اور جنگ بدر ہوئی تو یہودی ڈر گئے اور انہوں نے سوچا کہ ان کو بھی اس امان میں شامل ہو جانا چاہیے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ شامل نہ ہوں، جب کعب بن اشرف کا قتل ہوا تو پھر پورے یہودی اس میں شامل ہو گئے۔ گویا کعب ابن اشرف کے قتل کے وقت میثاق مدینہ میں یہودی پارٹی نہیں تھے اور ان کی حیثیت ایک شہری یا معاہد کی نہیں بلکہ ایک محارب کی تھی اور محارب کے خلاف ملٹری ایکشن یا پولیس ایکشن لیا جا سکتا ہے اور جائز ہے۔ اس نتیجے پر ڈاکٹر صاحب کوئی پینتیس چالیس سال کی تحقیق کے بعد پہنچے۔

اس طرح کے بہت سے معاملات ہیں جس میں وقتاً فوقتاً مجھے بھی ان سے تبادلہ خیال کا اتفاق ہوا۔ ان کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ اگر سوال کا جواب آج ان کے سامنے نہیں ہے تو اس پر کوئی فوری رائے قائم کر لیں۔ وہ فوری رائے کبھی قائم نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر مسلسل غور کرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ انہوں نے ایک سوال اٹھایا یا ان کے مخاطب نے کسی کم علمی، ناپختگی یا جلد بازی کی وجہ سے جواب دے دیا تو انہوں نے اس کو سراہا نہیں۔ ایک مرتبہ ایک نیاز مند سے پوچھا کہ یہ جو قرآن مجید میں آیا ہے کہ کلا ان کتاب الابرار لفی علیین۔ کلا ان کتاب الفجار لفی سجین۔ اس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جو نیک لوگ ہیں ان کی کتاب جنت میں جائے گی اور جو بُرے لوگ ہیں ان کی کتاب جہنم میں جائے گی، تو میری کتاب اگر جہنم میں چلی جائے اور میں بچ جاؤں تو یہ اچھی بات ہے، اگر نہیں تو اس سے مراد کیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد فیصلہ ہے۔ اور کتاب کا لفظ عربی زبان میں فیصلے کے لیے بھی آتا ہے۔ مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ نیک لوگوں کا فیصلہ جنت کے بارے میں ہوگا اور بُرے لوگوں کا فیصلہ جہنم کے بارے میں ہوگا۔ مخاطب کہنے لگا: جی بالکل، بالکل! فرمایا: اتنی جلدی نہ کیجیے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے، اس میں ابھی بہت سے سوالات ہیں۔ پھر اس پر جو اعتراض

آتے، وہ بیان کیے۔

وہ مختلف معاملات پر اس طرح سے مسلسل سوچتے رہتے تھے اور ایسے سوالات اٹھاتے تھے کہ جن کا جواب کم از کم ان کے مخاطبین کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے لکھا کہ آج کل میں اپنے فرانسیسی ترجمے پر نظر ثانی کر رہا ہوں اور غالباً دسویں یا بارہویں نظر ثانی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ عربی زبان میں یاویلتنا، یاویلتنا اور یاویلنا میں کوئی فرق ہے یا نہیں ہے۔ اور اگر فرق ہے تو اس کو فرانسیسی یا انگریزی میں کیسے بیان کیا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی عربی دان یا اساتذہ تھے (میں کسی کی تحقیر نہیں کرتا) سب سے میں نے بات کی۔ اول تو اکثر کے ذہن میں یہ سوال پہلی مرتبہ آیا تھا کہ ان میں فرق بھی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ فرق تو ہے۔ عربی کے تین الگ الگ الفاظ ہیں۔ قرآن پاک نے تین سیاقوں میں یہ تین الفاظ استعمال کیے ہیں تو کیوں کیے ہیں؟ کافی غور و خوض کے بعد یاویلتنا اور یاویلنا کا فرق تو سمجھ میں آ گیا، لیکن اس کو انگریزی میں کیسے بیان کیا جائے غالباً انگریزی زبان اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ فرانسیسی میں کیسے استعمال کیا جائے، یہ ڈاکٹر صاحب کو بہتر معلوم ہوگا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرانا مقصود ہے کہ عام مترجمین قرآن بلکہ بڑے بڑے مترجمین قرآن نے، یا کسی نے بھی یاویلتنا اور یاویلنا کے ترجمے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یہ انگریزی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی علوم و فنون پر کتنی گہرائی اور باریک بینی سے کام کیا۔ ان کا آخری کام ایک لحاظ سے سیرت ہی ہے اور بقول شبلی "یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا"۔

میری جب ان سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ قرآن مجید پر کام کر رہے تھے اور صحیح بخاری کی انڈیکس بنا رہے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے بیسیوں متون ایڈٹ کیے جس میں خالص نباتات جیسی کتاب بھی شامل ہے۔ ان سے کسی عربی اسلامی ادارے نے کہا کہ ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات ایڈٹ کر دیں۔ اس کی ایک جلد دستیاب تھی، دوسری دستیاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے دستیاب جلد ایڈٹ کر کے دے دی۔ جب وہ اسے ایڈٹ کر رہے تھے تو حواشی لکھتے ہوئے ان کو یہ خیال ہوا کہ مسلمانوں میں جن لوگوں نے علم الادویہ پر لکھا ہے انہوں نے کتاب النبات کے حوالے بڑی کثرت سے دیے ہیں۔ اسی

طرح بہت سے ارباب لغت نے بھی کتاب النبات کے حوالے دیے ہیں، اگر لغت کی تمام کتب کو چھانا جائے اور علم الادویہ کی تمام کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور جہاں جہاں ابوحنیفہ دینوری کے حوالے آئے ہیں، ان کو جمع کیا جائے تو شاید گمشدہ جلد دوبارہ مرتب ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے لسان العرب، قاموس، جمھرہ، کتاب العین جیسی بنیادی کتابیں سب بالاستیعاب پڑھنی شروع کیں اور پھر علم الادویہ کی کتابیں جن جن کی ہیں مثلاً زکریا، رازی وغیرہ، ان سب میں جہاں جہاں ابوحنیفہ کے حوالے لکھے تھے، ان کو جمع کیا اور یوں گمشدہ جلد کا بیشتر حصہ الحمدللہ جمع ہو گیا جسے انہوں نے شائع بھی کر دیا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ یہ واقعہ سنا تو یقین نہیں آیا کہ ایک انسان ایسا کام کر سکتا ہے۔

ایک چھوٹا سا واقعہ ذکر کروں جو میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ان کی کتاب "Muslim Conduct of State" کا ایک خاتون نے اردو ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب اکتوبر ۱۹۷۹ء کو اسلام آباد میں ایک سیمینار میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے میں نے ذکر کیا کہ آپ کی کتاب کا ترجمہ ایک خاتون نے کیا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ ایک نظر اس پر ڈال لیں۔ انہوں کہا دے دیجیے۔ سیمینار کے اختتام پر مغرب کے وقت وہ ہوٹل واپس جا رہے تھے، میں نے وہ بستہ ان کو دے دیا۔ اگلے دن میں صبح ساڑھے نو بجے پہنچا تو وہ بستہ بغل میں دبائے ہوئے تھے اور کہا یہ لے لیجیے۔ میں نے دیکھا تو اس کے کم و بیش ہر صفحہ پر کوئی نہ کوئی اصلاح اور غلطی کی درستگی موجود تھی جو انہوں نے کی ہوئی تھی۔ اب بظاہر اگر وہ پوری رات بھی کام کرتے رہے ہوں تو دس یا بارہ گھنٹے جو دو ملاقاتوں کے درمیانی وقفے سے عبارت تھے، اس مدت میں پانچ سو ساڑھے پانچ سو صفحات کا مسودہ دیکھنا اور ہر صفحے پر اصلاح کرنا میرے خیال میں ممکن نہیں۔ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو بعض صوفیہ نے لکھا ہے کہ انسانوں کے لیے جو وقت اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اس میں کچھ لوگوں کے لیے عام وقت میں سے طول رکھا ہے، خاص انسانوں میں وقت کے لیے عرض بھی رکھا ہے اور خاص الخاص انسانوں کے لیے عمق بھی رکھا ہے اور اس میں گہرائی بھی ہوتی ہے، تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تین پہلو وقت Three Dimensional Time دے دیا تھا۔

ان کی اس طرح کی بہت سی مثالیں اور واقعات میرے علم میں ہیں جو میں بیان کر سکتا ہوں۔ آخر میں ایک چھوٹی سی مثال دینا چاہوں گا۔ برصغیر کے ایک بڑے عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی مشہور کتاب ''اظہار الحق'' ہے جس میں بائیبل اور مسیحیت پر تنقید ہے۔ اس کا اردو ترجمہ کوئی پینتیس سال پہلے کراچی میں شائع ہوا تھا اور بڑا مقبول ہوا۔ اس کا اشتہار ایک دینی رسالے میں چھپتا تھا اور اس میں لکھا ہوتا تھا کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ''لندن ٹائمز'' نے لکھا تھا کہ اگر یہ کتاب دنیائے مغرب میں پڑھی جاتی رہی تو مسیحیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ناشر کو خط لکھا اور پوچھا کہ آپ کے اشتہار میں ''لندن ٹائمز'' کا حوالہ دیکھا پچھلے دنوں میں نے لندن ٹائمز کی فائل ۱۸۰۰ سے لے کر ۱۹۰۰ فلاں تک پوری دیکھ لی ہے، اس میں مجھے یہ جملہ نہیں ملا، تو آپ کا ذریعہ کیا ہے؟

ایک عالم ایک محقق

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بارے میں ذاتی تاثرات)

شاہ بلیغ الدین

کچھ فرزندان جامعہ ایسے تھے جو دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے --- سرخ و سپید رنگت اکہرا جسم، کھڑی گردن، مخصوص داڑھی! اوسط قد نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا۔ سب شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے۔ سب کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر ہوتے تھے --- یہ تھا ان کا حلیہ۔ پاس آنے کے بعد سمجھ میں آتا تھا کہ یہ ڈاکٹر غلام غوث ہیں وہ محمد فاروق ہیں۔ یہ شرف الدین صاحب ہیں اور وہ ڈاکٹر یوسف الدین۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی۔ یونیورسٹی میں تو نہیں پڑھے لیکن تھے وہ بھی انہی میں سے ایک۔ ان کی کتاب --- دکن میں اردو --- بڑی مشہور ہوئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو اردو کے وطن کا پتہ لگانے کے لئے خطہ داری بنیاد پر لکھی گئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جامعہ عثمانیہ عابد روڈ پر ہوا کرتی تھی۔ کسی منچلے نے اسی زمانے میں اس برادری کو کرین فیملی (Crane Family) کا نام دیا لیکن ہم لوگوں کے آتے آتے اس میں تقدیس کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ ہم لوگ انہیں --- ڈاکٹر حمید اللہ فیملی کہنے لگے تھے۔ یہ سب اپنی دینداری، شرافت اور علمی رجحانات میں ایک جیسے تھے۔ انہیں کھیل کود، درسگاہوں کی شرارتوں، طلبہ برادری کے عہدوں، منصبوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر آباد ہونے والی یہ برادری فن جہاز رانی اور تجارتی پیشے میں بھی بڑی نام ور تھی۔ ان کی تبلیغی اور علمی خدمات بھی تاریخ میں قابل قدر رہی ہیں۔

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی انساب کی کتاب (لب اللباب) میں لکھا ہے کہ بصرے کے آس پاس ایک جگہ تھی --- نوایت یہ وہاں کے رہنے والے تھے۔ معجم البلدان میں یاقوت حموی نے بھی نوایت ہی لکھا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ قریش کے جد امجد نضر بن

کنانہ کی اولاد میں ایک نوائط بن نصر بھی تھے۔ تائے قرشت کا املا عام نہیں ہوا۔ نوائط عام ہو گیا۔ نوائط مسلک کے لحاظ سے شافعی ہوتے ہیں۔

ارکاٹ اور مدراس کی اسلامی ریاستوں کے بعد ان کے ذی علم حضرات نے حیدرآباد دکن کا رُخ کیا۔ اب تو حیدرآباد بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان آنے والے نوائط برادری کے افراد میں دو شخصیتوں نے بڑا نام پیدا کیا، ایک عزیز جنگ ولا نے جو شمس العلما کہلائے دوسرے ڈاکٹر حمید اللہ جو اسلامیات کے معروف محقق اور بین الاقوامی شہرت کے استاذ الاساتذہ میں سے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقاتیں یونیورسٹی کے علاوہ ان کے کٹلمنڈی کے مکان میں ہوئیں جو کلیہ اناث کے قریب یا مسٹر سروجنی نائیڈو کے مکان گولڈن تھریشہولڈ (Golden Threshold) کے پیچھے تھا۔ کٹلمنڈی کے اس محلے میں مکانات اچھے تھے مگر گلیاں بڑی کوتاہ تھیں۔ یہ مکان غالباً ڈاکٹر صاحب کے والد نے خریدا تھا۔ اس کا نام خانہ خلیل تھا۔ ڈاکٹر صاحب فیل خانے کے اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے تھے۔ تذکرہ قانون (۱۹۴۴ء) جسے حمید اللہ صاحب نے خود مرتب کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۳۵ پر اپنی تاریخ ولادت ۱۶ ارمحرم ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۳۱۷ فصلی لکھی ہے۔ (Diglott calendar) مطبوعہ دارالطبع سرکار عالی ۱۹۲۹ء کے مطابق شمسی حساب سے یہ ۱۹ ارفروری ۱۹۰۸ء بنتی ہے۔ اس وقت (مئی ۹۷ء) میں الحمدللہ وہ (۸۹) برس کے ہو گئے ہیں۔ فیل خانہ جدید کارواں سرائے، گوشہ حل کنٹہ اور بیگم بازار سے لگا ہوا محلہ تھا۔ بیگم بازار میں نواب بہادر یار جنگ پیدا ہوئے تھے۔ نواب صاحب اور ڈاکٹر صاحب بچپن کے دوست اور دارالعلوم کے ساتھی بھی رہے تھے۔ فیل خانے میں شاہی ہاتھی رکھے جاتے تھے اور یہیں رود موسیٰ کے کنارے ہاتھیوں اور گھوڑوں کے بڑے بڑے سوداگر بھی بازار لگایا کرتے تھے جن کے پاس ہر نسل کے گھوڑے اور بڑے بڑے ہاتھی ہوتے تھے۔ ایک بڑا ہاتھی اب سے سو سال پہلے دس ہزار روپے میں مل جاتا تھا۔ میر محبوب علی خان چھٹے نظام کے دورِ حکومت تک تو شاہی جلوس ہاتھی پر نکلتے اور مغلیہ تزک واحتشام کی یاد تازہ کرتے رہے۔

ایک تو عرب نژاد دوسرے قاضی بدرالدولہ کا خاندان، ڈاکٹر صاحب کی گھٹی میں

عربی پڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش سے بہت پہلے ۱۸۷۳ء میں اردو حیدرآباد کی دفتری زبان بھی ہوگئی تھی۔ شرفا کے خاندانوں میں عربی فارسی ہی سے پڑھائی کی ابتداء ہوتی تھی۔ چنانچہ ابتدائی فرزندانِ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر ولی الدین، ڈاکٹر سیادت علی خان، پروفیسر مجید صدیقی، ڈاکٹر رضی الدین، قاری قطب الدین، قاری کلیم اللہ سب عربی فارسی سے اچھے خاصے واقف تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر حمید الدین فراہی دارالعلوم کے پرنسپل تھے۔ یہ سب ان کے کسی نہ کسی طرح سے شاگرد ہیں۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتداء میں وہی پرنسپل بھی رہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ دارالعلوم سے جامعہ نظامیہ گئے پھر دارالعلوم ہی سے ۱۹۲۳ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ ڈاکٹر رضی الدین ان کے ساتھی ہیں۔ اور یہ عثمانیہ میٹرک کا پہلا امتحان دینے والے فرزندان جامعہ ہیں۔ ان سے پہلے مدراس میٹرک، علی گڑھ میٹرک اور دارالعلوم سے انگریزی کا پرچہ دے کر ایف اے میں شرکت کے اہل طالب علموں نے جامعہ عثمانیہ کے آغاز میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں ۱۹۲۳ء میں داخل ہوئے۔ یہاں پروفیسر عبدالقدیر صدیقی، حسرت جیسے استاد انہیں میسر آئے۔ ان کے علاوہ مفتی عبداللطیف، شاہ مصطفیٰ قادری، مولوی محمد صبغت اللہ، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر حسین علی خان، پروفیسر حسین علی مرزا سے انہوں نے استفادہ کیا۔

جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر صاحب کا طالب علمی کا دور تابناک رہا۔ وہ وقت کے پابند اور حاضر باش طالب علم کی شہرت رکھتے تھے۔ کسی دن جماعت سے غیر حاضر نہیں رہے۔ صرف ایک دن آدھا گھنٹہ دیر سے آئے۔ اس دن والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طالب علموں میں بحیثیت مجموعی ممتاز رہے انعام یافتہ طالب علموں میں ان کا نام سرفہرست رہا۔

۱۹۲۹ء میں وہ بزم قانون کے معتمد منتخب ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں نائب صدر رہے۔ صدر کلیہ، صدر بزم قانون ہوئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے فقہ میں بدرجہ اول ایم اے کیا اور اسی سال ایل ایل بی میں بھی درجہ اول حاصل کیا۔ ریسرچ اسکالرز کے لئے اسی سال ایک نیا شعبہ کھلا تھا۔ اس میں انہیں لے لیا گیا اور اسلامی قانون بین الممالک پر انہوں نے کام کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں تحقیقی کام کرنے والے طالب علموں کو جامعہ

ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ دیتا تھا۔ اپنے مقالے کے لئے مواد جمع کرنے کے لئے انہیں مشرقِ وسطیٰ اور یورپ جانے کا موقع ملا۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ کی اکیڈمک کونسل کی اجازت سے یہ مقالہ بون یونیورسٹی (جرمنی) میں داخل کیا گیا جہاں ۱۹۳۲ء میں ڈی فل (D. Phil) کی ڈگری ملی۔ اس کے بعد پیرس یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔ اور اسی سال وہ حیدر آباد لوٹ گئے۔

آنکھوں دیکھی نہیں۔ کانوں سنی بات ہے مگر راوی خود ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یورپ میں رہے اور بالخصوص پیرس جیسے شہر میں تین چار سال تک قیام رہا پیرس کی مشہور عالم سڑک شانزالیزری سے کوئی دلچسپی تھی نہ یہاں کے قہوہ خانوں اور آرٹ گیلری سے کوئی لگاؤ تھا۔ تیسری چوتھی منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہی ان کا دیوان خانہ یہی طعام خانہ اور یہ خواب گاہ کا کام دیتا بلکہ کبھی کبھی یہ مہمان خانے کا بھی کام دیتا۔ اسٹوو اور کیتلی کا مستقل ساتھ رہتا تھا۔ ایک فرائی پان یا تو ابھی مول لیا تھا۔ چائے مکھن، توس اور آملیٹ پر گزارہ تھا۔ ڈاکٹر مظہر الحق جو کراچی یونیورسٹی میں بحر نویسی (Oceanography) کے پروفیسر تھے آج کل پیرس میں ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس عمارت میں لفٹ نہیں ہے۔ پرانی عمارت ہے۔ یہ لاطینی کوارٹروز کا علاقہ ہے۔ بس یونیورسٹی کے قریب ہے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی صرف حصول علم کے لئے چند طالب علم یورپ جایا کرتے تھے۔ نقل مکانی کا سلسلہ اس زمانے میں شروع نہ ہوا تھا۔ اس لئے حلال گوشت یا مرغی عام طور پر ملنے کا تصور ہی بے معنی تھا۔ جنہیں ہوٹلوں کا چسکا نہ ہوتا ان کی گزر بسر بس اسی طرح ہوتی تھی جس طرح ڈاکٹر صاحب کی زندگی گزرتی تھی۔

وظیفہ کا پیسہ پیسہ بچا کر ڈاکٹر صاحب کتابوں کی خریداری میں لگاتے۔ بسا اوقات ٹرام (Tramway) یا بس کا خرچہ بھی بار گزرتا تھا۔ پیدل ہی کتب خانوں اور یونیورسٹی کو جایا کرتے۔ بننے سنورنے اور کپڑے پہننے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شیروانی میں ملبوس نظر آتے۔ البتہ سر پر کبھی ترکی ٹوپی نظر نہ آتی۔ ہمیشہ جناح کیپ پہنتے تھے البتہ پہلی بار پاکستان آئے تو بش شرٹ اور پتلون میں دیکھا۔ پیرس میں شاید ان کا یہی لباس رہتا ہوگا۔ حیدر آباد میں بھی زندگی میں سادگی کی جھلک تھی یہاں تو

صرف بنیادی ضرورت کی چیزوں پر اکتفا کرتے۔ یاری دوستی کی طرف بھی کچھ زیادہ میلان نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی علمی صحبتیں کمرے پر منعقد ہو جاتی تھیں۔ ملاقاتی جن میں اکثریت طالب علموں اور مستشرقین کی ہوتی ان سے بھی کتابوں کے انبار میں اٹے کمرے ہی میں مل لیتے۔ ہوٹلوں میں لے جا کر مہمانوں سے ملنے کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ کسی طرح کی فضول خرچی ان سے متوقع نہیں تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی ڈاکٹر صاحب نے خاصی کچھ دنیا دیکھی ہے۔ اسی زمانے میں حج وزیارت کی سعادت بھی انہیں حاصل ہوئی تھی۔ عہد نبوی کے میدان جنگ اور اپنی بلند پایہ تصنیف سیاسی وثیقہ حیات کے سلسلے میں بعض کتب کی چھان بین کے لیے وہ نجد وحجاز اور مشرق وسطیٰ کے کئی اہم مقامات پر جا چکے ہیں۔ خط وہ کسی کو شوقیہ لکھتے نہ تھے۔ غالب بیچارا اور طرح کا آدمی تھا جو کہتا تھا---

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

ڈاکٹر صاحب تو قرآنی حکم کے مطابق --- ولا تبذر تبذیرا --- (بنی اسرائیل) یعنی روپیہ بے کار نہ اڑاؤ کے قائل تھے۔ جس کو خط لکھتے تو کوشش کرتے کہ کارڈ پر کام چل جائے بہت ہوا ایروگرام سے کام چلا لیتے۔ ویسے خطوں کا جواب وہ بڑی پابندی سے دیتے ہیں۔ استفسارات اور حوالوں کے طلب گار کو فوراً جواب دیتے۔ پیرس میں ۴۹ء کے بعد ان کے قیام کے دوران میں بہت خط آتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے یہ ہونہار سپوت ڈگریوں سے لد پھند کے واپس آئے تو ٹرین سے اترتے ہی گھر پہنچے۔ سامان رکھا ہاتھ منہ دھویا یونیورسٹی پہنچ گئے۔ سرکاری تعلیمی وظیفے پر گئے تھے اس کی شرط یہ تھی کہ لوٹ کر جامعہ عثمانیہ میں نوکری کریں گے۔ اس لئے چلے آئے ورنہ اُن بہت سی درسگاہوں نے پانسہ پھینکا، گوندا ڈالا مگر یہاں زبان پر جو نہیں تھی سو نہیں قائم رہی۔ البتہ بون (جرمنی) یونیورسٹی میں انہوں نے ریڈر کی حیثیت سے کام کیا مگر اعزازی طور پر ابڑا عہدہ، بڑی تنخواہ، بڑی سہولتیں سب کچھ سہی مگر وعدہ پھر وعدہ ہوتا ہے۔ وعدہ توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ ارشاد ربانی ہے---او فوا باالعہد ان العہد کان مسئولا

--- اپنے اقراروں کو پورا کرو ورنہ پکڑ ہوگی --- اللہ کی پکڑ کے آگے پیرس کی رنگینیوں یا روپے پیسے کی افراط سے کسے دلچسپی تھی۔ اپنے فرائض جلد سے جلد شروع کرنے کا خیال ستا رہا تھا۔ اڈکمیٹ کی عارضی عمارتوں میں یونیورسٹی پہنچے تو دوست احباب اساتذہ کرام اور انتظامیہ کے بڑے چھوٹوں سب نے ہاتھ ملائے۔ سب نے تعریف کی مگر کوئی آسامی خالی نہ تھی۔ نوکری کہاں سے دیتے۔ اس انمول ہیرے کو گنوا بھی نہ سکتے تھے۔ اس لئے دم دلاسے پر دھر لیا۔

کچھ دنوں بعد ایک صاحب چھٹی پر گئے تو ان کی جگہ بٹھا دیا۔ ادھر شعبہ قانون میں قانونِ بین الممالک (International Law) پڑھانے والا کوئی ملتا نہ تھا تو یہ خدمت بھی وہ انجام دیتے رہے۔ پھر ڈاکٹر سیادت علی کی جگہ خالی ہوئی تو (۳۰۰ تا ۶۰۰) کی آسامی پر ریڈر کی حیثیت سے تقرر کر دیا گیا۔ یاں کسے بحث تھی کہ اتنی تنخواہ ہو یا اتنی تنخواہ ہو۔ یہ بات پہلے ہی عرض کر دی گئی تھی کہ مادر جامعہ کی خدمت کا موقع دیجیے معاوضہ حق الخدمت کی بات کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیئے۔ ادھر یونیورسٹی کی باگ ڈور قاضی محمد حسین صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ریاضی میں کیمبرج کے رینگلر تھے یعنی حساب کے پکے! وہ بھی جانتے تھے کہ --- مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دینی چاہئے۔ اس لئے انہوں نے بیگاری والی کوئی بات چلنے نہ دی۔

ہم جب یونیورسٹی میں آئے تو شعبہ تاریخ کے آس پاس ہی شعبہ قانون کو پایا۔ بڑی خوشی اس لئے ہوئی کہ ہم نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ سول سروس میں نہیں بیٹھیں گے ایل ایل بی کر کے وکالت کریں گے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ''من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال'' والا معاملہ ہمارے ساتھ ہوا۔ ملک کے بٹوارے کے بعد حیدر آباد پر ظالمانہ حملہ ہوا اور سلطنت آصفیہ کے سقوط کے بعد ہم سیدھے اپنے وطن پہنچے۔ جیب میں مشکل سے سو دو سو روپلی تھے۔ اتنے ہی روپے بڑے بھائی کے پاس بھی تھے۔ رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا روز کنواں کھودنا اور پانی پینا تھا۔ ایسے میں وکالت کا مسئلہ یوں بھی مشکل ہو گیا تھا کہ ہم ایل ایل بی کا پہلا سال مکمل کر کے امتحان دیتے ہی چلے آئے تھے۔ نتیجہ نکلا کامیابی ہوئی مگر اب فائدہ کیا تھا۔ قصہ مختصر بعد میں ہم نے جامعہ کراچی سے دوسرے سال کا امتحان دے کر ایل ایل بی کی

ڈگری تو لے لی لیکن پیشہ قانون میں آنے کی ہمت نہ پڑی۔

شعبہ قانون کی طرف سے ہم جب بھی گزرتے اور ڈاکٹر صاحب نظر آتے تو ہم ان کو بڑے احترام سے سلام کیا کرتے تھے۔ اسلام نے السلام علیکم کا فقرہ سلام کے لئے دیا ہے لیکن ہندلسانی تہذیب (Indo Muslim Culture) اور ریاستی ماحول میں --- آداب عرض ہے! --- کا سکہ چلتا تھا۔ تن کے سلام تو دوستوں میں ہوتا تھا مگر سب بزرگوں سے جھک کے سلام ہوتا تھا۔ اساتذہ اور والدین تو ظاہر ہے کہ بڑے احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔ جب عقیدت زیادہ شامل ہو جائے تو تقدیس اور بڑھ جاتی ہے۔ شعبہ قانون کی راہداری میں یہی مظاہرہ ہم سے ہوتا --- لیجئے سامنے سے ہمارے ممدوح چلے آرہے ہیں --- قد میں لمبے نہ ٹھگنے، دکھاوٹ میں لمبے نظر آتے ہیں۔ دھان پان آدمی ہیں لیکن رعب ان کا بڑا ہے۔ کچھ ان کی ذاتی خوبیوں اور بہت کچھ علمی عظمتوں نے ان کا قد بڑھا دیا ہے۔ اس لئے وہ بالا بلند دکھائی دیتے۔ سفید رنگت خون کی کمی سے کچھ پیلی معلوم ہوتی، لمبی پتلی ناک، ذہانت بھری آنکھیں، پتلا تلوار کی طرح کا چہرہ، اونچی گردن، نحیف ہاتھ پاؤں۔ شرعی پاجامہ بر میں جسم پر حیدرآبادی شیروانی گھٹنوں سے ذرا نیچی۔ سر پر بالوں والی ٹوپی۔ ہاتھ میں چمڑے کا بستہ، جو کتابوں اور کاپیوں سے پھولا ہوتا۔ یہ نہ بریف کیس کی وضع کا ہوتا تھا نہ بریف کیس کی طرح فیشن ایبل، صاف سمجھ میں آتا تھا کہ اگر طاقت اجازت دیتی اور موقع مل جاتا تو ٹن کا کوئی بڑا صندوق ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے چلے آتے۔ دانت پاک صاف، چمکیلے، سیاہ ترشی ہوئی موچھیں اور سیاہ جھالر نما ڈاڑھی --- یہ ہیں ڈاکٹر حمید اللہ! وزن ایک سو بارہ پونڈ سے آگے کبھی نہ بڑھا ہوگا۔ آج بھی اتنے ہی وزن کے ہوں گے۔ وہ ان اللہ کے بندوں میں سے تھے جو سلام کا جواب دے کر بازو سے گزرتے تو علم کی روشنی کے لپکے آتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا تعلق ارکاٹ کے ایک علمی گھرانے سے تھا ان کے جدِ امجد قاضی بدرالدولہ اپنے دور کے فاضل اجل تھے۔ محمد خلیل اللہ صاحب حیدرآباد میں دوم تعلقدار اور مددگار معتمد مالگزاری تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب انہی کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۶ر محرم ۱۳۲۶ھ بدھ کی رات وہ حیدآباد دکن میں پیدا ہوئے ان کی بسم اللہ والد محترم نے پڑھائی۔

کچھ عرصے تک خود بیٹے کو درس دیتے رہے۔ پھر حیدرآباد کی مشہور درسگاہ دارالعلوم میں داخل کرایا جہاں وہ چھٹے درجے تک پڑھتے رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ چھٹی جماعت کے بعد انہیں مدرسہ نظامیہ میں شریک کرایا گیا۔ ایک سال وہ وہاں پڑھتے رہے اور دارالعلوم کو جسے جامعہ عثمانیہ میں بدلنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں انہیں دیکھتے رہے۔ یہاں ان کے ساتھیوں میں ڈاکٹر رضی الدین، نواب بہادر یار جنگ اور احمد عبداللہ المسدوسی جیسی ہستیاں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ دونوں بھائی اور ایک بہن ڈاکٹر صاحب سے بڑی تھیں۔ سب سے بڑے بھائی حبیب اللہ صاحب تھے جنہوں نے عثمانیہ سے بی اے کیا۔ یہ نائب ناظم بندوبست ہو گئے تھے انہوں نے بلاذری کی ''انساب'' سے حضرت عثمانؓ کی زندگی کے حالات کا اردو ترجمہ کیا ہے جو حیدرآباد دکن سے چھپ چکا ہے۔ ان سے چھوٹے بھائی صبغت اللہ صاحب تھے جو مددگار ناظم بندوبست حکومت حیدرآباد رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بڑی بہن امتہ العزیز عربی کی فارغ التحصیل تھیں۔ چھوٹی بہن حبیتہ الرحمٰن تھیں۔ ان چاروں کا انتقال ہو چکا ہے۔

جورو نہ ماتا اللہ میاں سے ناتا --- اردو کی ایک مشہور مثل ہے جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو اس کے لئے بولتے ہیں۔ اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے --- جورو نہ ماتا بس کتابوں سے ناتا --- اب یہ مثل ڈاکٹر صاحب پر صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا عشق کتابوں سے تھا۔ شب و روز کتابوں کی دنیا میں گم رہتے تھے۔ پانچوں وقت مسجد جا کر نماز پڑھ لیتے پھر لکھتے پڑھتے رہتے۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جعفر حسن، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر حمیداللہ نے کیوں تجرد کی زندگی اختیار کی اللہ بہتر جانتا ہے۔ ان میں سے دو کے بارے میں --- اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی --- عنفوانِ شباب کے معاشقے ناکام ہوئے ان میں ایک ڈاکٹر جعفر حسین ہیں ایک مجید صدیقی صاحب۔ مولوی عبدالحق کی طالب علمی کے زمانے کی ایک شادی کے بارے میں بھی کچھ گن پھن سننے میں آئی۔ ڈاکٹر حمیداللہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا۔ ایک مرتبہ بہت موڈ میں تھے۔ اپنی یورپ کی زندگی کا احوال سنا رہے تھے۔ خود پکانا، کھانا اس خشک موضوع کے

بعد فرمایا کہ ایک بار ہمارے فلیٹِ یا کمرے--- (مجرد گاہ)(Bachelor Quarter) کی مالکن آئی اپنی زندگی کی بپتا سنانے لگی۔تان اس بات پر ٹوٹی کہ شوہر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ عرصے سے لاپتہ ہے۔تم معقول آدمی دکھائی دیتے ہوتم ہی توجہ کرلیا کرو--- یہ کہہ کرڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور بات ختم ہوگئی۔طالب علمی کا زمانہ ۴۵ء میں ختم ہوا پھر ۴۹ء میں کوئی ۱۴ برس بعد ڈاکٹر صاحب اسی مالک مکان خاتون کے کرائے دار بنے اور حال تک وہیں رہتے تھے۔ بلکہ اب بھی وہ کمرہ ان کے قبضے میں ہے۔ان کی کتابیں ان کا سامان وہیں ہے ان کی زیادہ تر ڈاک بھی اسی پتے پر آتی ہے۔خود وہ پیرس کے بجائے اب امریکہ میں اپنی بھتیجی کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو حیدرآباد نے اپنے مخصوص حالات میں اپنی آزادی کا اعلان کردیا اگست ۴۸ء سے دوسرے سال ستمبر ۴۹ء تک ہم اپنی آزادی کے گن گاتے رہے۔اس دوران میں جو کچھ اپنے آقاؤں سے میر جعفر اور میر صادق نے کیا، وہی ہمارے ساتھ بھی ہوا (۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ اور ۱۷۹۷ء میں سلطان ٹیپو ان نمک حرموں کی سازشوں کا شکار ہوئے۔) مملکت آصفیہ حیدرآباد بھی سازش کا شکار ہوئی۔حضور نظام کے درباری اس میں پیش پیش رہے۔۱۹۴۹ء ستمبر میں قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارت نے سترہ مختلف مقامات سے مملکت حیدرآباد پر حملہ کردیا۔مخدوم کا باغیانہ جذبہ پکار اٹھا---

پڑی ہے فرق مبارک پہ ضربت کاری
جناب آصف سابع پہ ہے غشی طاری

مخدوم نے کالج کے زمانے میں مرشد کا پارٹ ادا کر کے نظام سابع سے کئی بار انعامات لئے تھے۔ مجھے اس موقع پر گولکنڈہ کے عظیم المرتبت سپہ سالار عبدالرزاق لاری پر سکندر علی وجد کی نظم کا ایک شعر یاد آیا جو زندگی کی ایک بڑی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

اقبال کا ساتھی ہے پدر ہو کہ برادر
ادبار میں تسکین نہیں دیتا کوئی دم بھر

حیدرآباد کی آزادی کی حفاظت کے لئے اس زمانے میں جو کوششیں ہوئیں ان میں سب سے بڑا اقدم یہ تھا کہ صیانتی کونسل میں حیدرآباد بھارت کی جارحیت کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرنے نکلا۔ اس موقع پر جامعہ عثمانیہ کے دو پروفیسر صاحبان بھی وفد کے ساتھ گئے۔ ایک ڈاکٹر حمید اللہ دوسرے ڈاکٹر یوسف حسین خان! وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے والد حیدرآباد دکن میں ہی بس گئے تھے۔ اور یہیں وکالت کرتے تھے۔ بعد میں لارپورٹ (Law Report) چھپانے لگے تھے۔ اپنی آپ بیتی یادوں کی دنیا میں، ڈاکٹر یوسف نے اس وفد میں شرکت پر بڑا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ حالانکہ حیدرآباد کے ان کے پورے خاندان پر احسانات تھے۔ ان سے سروجنی نائیڈو پھر غنیمت نکلیں۔ انہوں نے سقوطِ حیدرآباد پر مگرمچھ کے آنسو تو بہائے۔ ڈاکٹر حمید اللہ جان بیچ کے لڑنے نکلے تھے وہ لوٹ کر حیدرآباد نہ گئے۔ درمیان میں پیرس میں اتر پڑے اور وہیں رہنے لگے۔ سکندر علی وجد کا ایک اور مصرعہ اس موقع پر ذہن میں آیا۔

اے مرد خدا قدر وفا تو نے بڑھا دی

بہت سے دوستوں اور ساتھیوں نے ڈاکٹر حمید اللہ سے کہا کہ --- حیدرآباد لوٹ آیئے۔ انہوں نے انکار کر دیا کچھ دوستوں اور عزیزوں نے کہا کہ --- پاکستان آجایئے۔ انہوں نے اس سے بھی اتفاق نہ کیا بعد میں کچھ عرصے کے لئے حکومت پاکستان کی دعوت پر آئے مگر پھر چلے گئے۔

پیرس چھوڑنے سے انکار کی وجہ بڑی خاموشی سے انہوں نے واضح کر دی کہ --- آٹھ زبانیں جانتا ہوں کچھ اور زبانیں بھی پڑھ لیتا ہوں پیرس میں جو کام میں کرسکوں گا وہ شاید ان دونوں جگہوں پر نہ ہو سکے۔ حیدرآباد کی خدمت البتہ انہوں نے جاری رکھی۔ فرانسیسی کا ایک ٹائپ رائٹر خرید لیا تھا۔ اس پر ہر مہینہ ایک بلیٹن چھاپتے۔ اس میں حیدرآباد کے مقدمے اور حیدرآباد کے مسلمانوں پر گزرنے والی آفتوں کا ذکر کرتے اور عالمی سیاسی منڈی کے سیٹھوں کو بھیجتے۔ پاکستان آئے وہ ٹائپ رائٹر بھی ساتھ تھا۔ کچھ بلیٹن بھی انہوں نے دکھائے --- زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کا مضمون تھا۔ ویسے ان کے پیرس

میں رہنے کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا۔ اسلامی ادب کی وہ خدمت نہ کر سکتے جس کے لئے آج وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔

کچھ دنوں کے لئے پاکستان آنے کا معاملہ یہ تھا کہ جسٹس ایم بی احمد جو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے سیکرٹری تھے، قرارداد مقاصد کی تیاری کے لئے اور شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں ان سے رہنمائی چاہتے تھے اس غرض کے لئے وہ خود پیرس گئے تھے۔ وہ یہاں آنے کے لئے تیار ہو گئے تو ان سے شرائط پوچھنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا --- شرط بس ایک ہی ہے جب میں کہوں مجھے واپس یہاں چھوڑ دیجیے جہاں سے آپ لے جا رہے ہیں۔ اس کے آگے جو بھی سوال ہوا اس کا ڈاکٹر صاحب نے جواب نہ دیا۔ رہنے، کھانے پینے، آنے جانے اور تنخواہ کے سلسلے میں کچھ نہ بولے۔ انہیں قصر ناز یا وزیر اعظم کے مہمان خانے میں اتارنے کی کوشش ہوئی تو انہوں نے کراچی ایئرپورٹ پر انکار کر دیا۔ اپنے ایک عزیز کا پتہ دیا کہ وہاں ان کے پاس قیام کروں گا۔ یہ جگہ تھی خداداد کالونی! تنخواہ کا مسئلہ آیا تو فرمایا کہ --- میرے عزیز جو کھاتے ہیں وہی مجھے کھلا دیں گے اور میں یہاں پاکستان کی خدمت کرنے آیا ہوں! یہ قلندرانہ ادائیں ایسی تھیں جن میں بڑا سکندرانہ جلال بھی تھا۔ کاش ایسے کچھ اور لوگ پاکستان کو میسر آ جاتے۔

قرارداد مقاصد پیش ہونے کے بعد وہ کچھ زیادہ دن یہاں نہ رہ سکے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ --- میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔ یہاں کام کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ انہیں بہت روکا گیا مگر وہ یہاں کے حالات سے بددل ہو گئے تھے۔

اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب سے کئی بار ملنا ہوا۔ ایک سب سے اہم مسئلہ حیدر آباد کی جلاوطن حکومت قائم کرنے کا تھا۔ ہم کچھ لوگ مل بیٹھتے تمام نشیب و فراز پر غور کرتے رہے۔ آزاد حیدر آباد کی حکومت کے صدر کے لئے اس وقت سب سے موزوں شخصیت نواب حسن یار جنگ کی نظر آتی تھی۔ نذرت روڈ کے ان کے مکان میں ان سے ایک خصوصی ملاقات ہوئی۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر یاسین زبیری مولانا مظہر علی کامل، اکرام اللہ صاحب سابق وزیر حیدر آباد اور شیخ حیدر صاحب بھی شریک تھے حسن یار جنگ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ حیدر آباد کے سقوط سے پہلے ان پر اور ان کے خاندان پر نظام کا سخت عتاب تھا۔

نظام نے ان سے اپنی بیٹی کا رشتہ بھی توڑ دیا تھا۔ ان کی دشواریاں سمجھ میں آتی تھیں بہر حال اس تصور کو آگے بڑھا کر بہادر یار جنگ سوسائٹی کی طرف سے ایک شام اخبارات کو اعلان جاری کر دیا گیا کہ --- آزاد حیدر آباد حکومت کا قیام عمل میں آ گیا ہے۔ یہ خبر میں نے بنائی ڈاکٹر صاحب نے دیکھی دوسرے ساتھیوں نے اتفاق کیا تو عالمی نیوز ایجنسی کے حوالے کر دی گئی دوسرے دن ڈان، جنگ، انجام، امروز، سندھ آبزرور وغیرہ میں مرکزی خبر کے طور پر شائع ہوئی۔ طے یہ پایا تھا کہ اس کا دفتر بہادر یار جنگ سوسائٹی میں ہو گا جس کا میں ان دنوں جنرل سیکرٹری تھا لیکن اسے ظاہر نہیں کیا جائے گا۔

حسن یار جنگ کے بعد جو شاہی خاندان کے فرد تھے ہمارا خیال تھا کہ سابق صدر اتحاد المسلمین مولانا مظہر علی کامل کو اس عہدے کے لئے منتخب کریں گے لیکن مولانا کی اپنی مشکلات تھیں۔ وہ اس خیال کے تو حامی تھے کہ آزاد حیدر آباد کی جلاوطن حکومت قائم ہونا چاہئے اور وہ اس کی مجلس مشاورت میں رہنا بھی چاہتے تھے لیکن صدارت کے لئے آمادہ نہ تھے۔ ہم یہ بھی کر سکتے تھے کہ صدر کے نام کا اعلان کئے بغیر یہ تحریک چلائیں اسی پر اتفاق رائے ہو گیا۔

دوسرے ہی دن وزارت خارجہ کے سیکرٹری صاحب کا خصوصی ایلچی ہمارے پاس آیا اور بتایا کہ سیکرٹری خارجہ اس اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اکرام اللہ صاحب اس وقت معتمد خارجہ تھے اور موہٹا پیلس کلفٹن میں وزارت کا دفتر تھا۔ حکومت پاکستان نے بڑی شدومد سے اس خیال کو روک دیا۔ ڈاکٹر صاحب عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے ان کی سوچ و فکر علمی تھی ریاست ہائے کیلن ٹائن اور جوہو کے فیصلے پری وی کونسل نے کئے تھے۔ بین الاقوامی دستوری اور سیاسی تاریخ میں ان کی حیثیت نظائر کی سی تھی لیکن دنیا کے کام اصول اور قانون کے مطابق نہیں چلتے اقبال نے اسی لئے کہا کہ --- عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد! حالات کا تقاضہ تھا کہ ہم خاموش ہو جائیں --- جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے تو یہی صورت ہو جاتی ہے۔ اس وقت تک میر لائق علی صاحب پاکستان نہیں آئے تھے۔ حیدر آباد دکن سے تو انہوں نے اپنے آخری پیام میں مشتاق احمد خان صاحب ریجنٹ جنرل کو جلاوطن حکومت کے قیام کا مشورہ دیا تھا لیکن یہاں آ کر وہ بھی خاموش ہو گئے۔

اسی زمانے میں سوسائٹی نے اعلان کیا کہ بہادر یار جنگ اسکول میں ڈاکٹر صاحب فرانسیسی اور روسی زبانوں کی تعلیم دیں گے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے کچھ خاص لیکچر بھی ہوئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے بہادر یار جنگ اسکول کی مالی امداد بھی کی۔ اسکول اسی زمانے میں قائم ہوا تھا۔ ابتداء میں اسکول کے اخراجات بڑی مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ اساتذہ کے تنخواہوں کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ ڈاکٹر یاسین زبیری شیخ حیدر صاحب اور میں خداداد کالونی کے مکان میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ میں نے اسکول کی مجلس انتظامیہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اپنی مشکلات بیان کیں ہم لوگ اس وقت خداداد کالونی کے ایک گھر میں کچی مٹی کی دیواروں کے کمرے میں چاندنی کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تکیے کے پیچھے ہاتھ ڈالا جس سے وہ لگے بیٹھے تھے۔ اپنا بٹوہ نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا۔ فرمایا --- جتنی ضرورت ہو اس میں سے لے لیجیے۔ میں بڑی شش و پنج میں پڑ گیا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے انکار کے باوجود حکومت پاکستان نے ان کے لئے کچھ الاؤنس اور بھتہ مقرر کر دیا تھا لیکن کتنا؟ کچھ معلوم نہ تھا۔ میں رُک گیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا --- آپ بلا تکلف جتنی رقم کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تنخواہوں کی رقم میں سترہ سو روپے کی کمی تھی۔ میں نے عرض کیا --- ڈاکٹر صاحب! میری ضرورت تو سترہ سو روپے کی ہے آپ جو مناسب سمجھیں عطیہ عنایت فرمائیں۔ انہوں نے بڑی ہمت افزائی کے لہجے میں مجھ سے فرمایا --- میں نے کہہ تو دیا کہ آپ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے رقم نکال لیں۔ ہم تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا تو فرمایا --- بسم اللہ! میں نے بٹوہ کھولا۔ یہ سو سو روپے کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس میں سے ایک ایک نوٹ نکالتا گیا اور فرش پر ڈالتا گیا سترہ کی گنتی ختم ہوئی تو میں نے بٹوہ بند کر کے انہیں پیش کیا انہوں نے بٹوہ میرے ہاتھ سے لے کر تکیے کے پیچھے ڈال دیا۔ نوٹ فرش پر پڑے رہے اور پھر ہم باتوں میں ایسے مشغول ہو گئے --- اللہ کا شکر کہ اس مہینے ہمارے پورے اسٹاف کو تنخواہ مل گئی۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک واقعہ میں نے یونیورسٹی میں سنا تھا۔ ایل ایل ایم

کی کلاسوں کا اجراء ہوا تو صبح ساڑھے سات بجے سے کلاسیں شروع ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ پہلے دن یونیورسٹی کی بس میں سوار ہوئے جو ان کے گھر کے قریب سے چلتی تھی تو چار پانچ طالب علم اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بعد میں داخل ہوئے تو طالب علم کھڑے ہو گئے وہ اندر آ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کنڈیکٹر پہلے انہی کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے دس روپیہ کا نوٹ تھمایا۔ دو تین آنے کا اس زمانے میں ٹکٹ تھا۔ جب کنڈیکٹر نے کہا کہ --- اس کے پاس ریزگاری نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ --- میرے اکیلے کا ٹکٹ نہیں سب کے ٹکٹ کے پیسے اس میں سے کاٹ لیجیے! وہ دن اور پھر یہ ڈاکٹر صاحب کا معمول ہو گیا کہ صبح کی پہلی بس میں جتنے طالب علم ہوتے سب ان کے ٹکٹ پر سفر کرتے۔ یہ اطلاع عام ہوئی تو کچھ نادار لڑکوں نے پہلی بس پکڑنا شروع کی اور تعداد بہت بڑھ گئی لیکن ڈاکٹر صاحب کے معمول میں فرق نہ آیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھیوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور طالب علموں اور ضرورت مندوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ فضول خرچ وہ بالکل نہیں تھے مگر آڑے وقت دینے کے لئے ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب پیرس لوٹ گئے تو پھر کبھی کبھار ان سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ ۱۹۸۳ء میں امریکہ سے واپسی کے موقع پر بہت ارادہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤں لیکن قاہرہ جانے کے اسباب بن گئے۔ ۱۹۸۹ء میں جب میں لندن گیا اور تین چار مہینے وہاں رہنے کا اتفاق ہوا تو میرا بڑا دل چاہا کہ میں فرانس جا کر ڈاکٹر صاحب سے مل آؤں لیکن موقع نہ مل سکا۔ میں اس لئے بھی ان سے ملنا چاہتا تھا کہ پندرھویں صدی کے آغاز پر اقوام متحدہ کے اجلاس کے لئے جنرل ضیاء الحق نے جو تقریر کی اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ یہ تقریر بروہی صاحب کی تجویز پر جنرل صاحب نے ڈاکٹر حمید اللہ ہی سے لکھوائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب خطبات بہاولپور کے لئے جب ۱۹۸۰ء میں یہاں آئے اس وقت بھی میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ وزیر اعظم کے مہمان خانے نمبر ۱۰ عبداللہ ہارون روڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی تھی۔ یادداشت

بھی اچھی تھی۔ مارچ 1980ء کے اس پروگرام کی دعوت پر اگرچہ کہ بہاولپور اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے تھی۔ اس کا خاکہ خود ڈاکٹر صاحب نے بنا کر روانہ کیا تھا۔

خطبات بہاولپور کی تعداد بارہ ہے۔ میرے خیال میں سرسید احمد خان کی کتاب خطبات احمدیہ کے بعد اردو زبان میں تاریخی اور تحقیقی مواد کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ ان خطبات میں سے پچاس ساٹھ ایسے عنوانات نکل سکتے ہیں جن پر مختلف جامعات میں پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔ ان خطبات سے ڈاکٹر صاحب کی وسعتِ مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کوئی خطیب نہیں۔ تدریسی انداز میں بولتے ہیں۔ الفاظ کی جادوگری اور آواز کے زیر و بم کا خیال نہیں رکھتے پھر بھی جی چاہتا ہے کہ ان کی گفتگو جاری رہے۔ خطبات بہاولپور میں ڈاکٹر صاحب کا پانچواں خطبہ قانون بین الممالک پر ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو عام طور پر دینی درسگاہوں کے طالب علموں کی دسترس سے باہر ہے۔ بے شک امام ابو حنیفہ کی اکیڈیمی میں اس موضوع پر چھان بین اور بحث و تمحیص ہوئی ہے۔ لیکن اردو زبان میں اس پر کوئی مواد نہیں ملتا۔ ۱۹۳۶ء میں جب جامعہ عثمانیہ کے ایل ایل بی کے نصاب میں اس مضمون کو داخل کیا گیا تو انگریزی کی جس کتاب کو پڑھنے کی سفارش کی گئی وہ ۱۹۲۴ء کی چھپی ہوئی تھی جبکہ اس موضوع پر تازہ ترین تبدیلیوں کا ذکر کتاب میں ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس کتاب میں اور امریکہ کی چھپی ہوئی اور کتابوں میں اسلامی ممالک کی تاریخ سے کوئی مثالیں اور نظیریں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۳۰ء سے اس موضوع پر تحقیقی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے جمع کردہ مواد سے ایک سال کام چلایا اور پھر نومبر ۱۹۳۶ء میں اپنی کتاب چھاپی۔ اسی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے امام محمد شیبانی کی کتاب السیر الصغیر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مسلمانوں نے دوسو (۲۰۰) برس میں قانون بین الممالک مرتب کر لیا تھا جب کہ مشاہیرِ یونان و روما کے وارثین اور مغربی مفکرین نے صدیوں کا وقت لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر جو کتاب لکھی اس کا نام تھا:---

سلطنتوں کے باہمی برتاؤ کا دستور العمل

یعنی

قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں

یہی کتاب تھی اور اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی نظر کی وجہ سے انہیں آزاد حیدر آباد کے مقدمے کے سلسلے میں صیانتی کونسل کے وفد میں شامل کیا گیا تھا۔

قانون بین الممالک پر ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب سے ڈاکٹر صاحب کی ایک اور اہم تصنیف کا بھی تعلق ہے اور وہ ہے:----

سیاسی وثیقہ جات---عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تا بہ خلافت راشدہ

اس کتاب کا ترجمہ مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے کیا اور ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع کیا۔ یہ تحقیقی مقالہ بھی جو بالِ جبرئیل کے سائز کی کتاب کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اردو ادب کے دامن میں ایک نیا گوہرِ آبدار ہے۔

اگر چہ کہ بعد میں صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ اور دور عثمانی اور دور مرتضوی کے بعد کچھ خطوط اور دستاویزات شائع ہوئی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی جانے والی عہد حاضر کی بیشتر کتابوں کے مصنف ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کی افادیت سے ناواقف ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سیرت کی کتابیں اکثر نقل نویسی کا شہکار ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور تصنیف کا ذکر بھی خطبات بہاولپور کے ساتھ ہونا چاہیے جس کا نام ہے---رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی!

اس کے پہلے دو ایڈیشن ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء میں چھپے تھے اس کا تیسرا ایڈیشن ڈاکٹر صاحب کی اجازت اور ان کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۶۱ء میں دارالاشاعت کراچی نے چھاپا۔

اس میں ڈاکٹر صاحب کے (۳۳) مضامین شامل ہیں تیسرے مضمون---مواد و ماخذ---کے بارہ ابواب ہیں جو سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں پر مشتمل ہیں---بہاولپور کے خطبات میں مملکت اور نظم و نسق، نظام دفاع، اور غزوات اور خطبہ نمبر ۱۲ تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ وہ خطبات ہیں جو اس کتاب کے بعض ابواب کی نظر ثانی اور مواد میں اضافے کے مظہر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ حکمرانی بھی ایسا موضوع ہے جو ڈاکٹر صاحب کے خطبات بہاولپور میں شامل ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی میں بھی اس کا مواد موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک چھوٹی کتاب ہے---عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے میدان جنگ۔اس کا موضوع بھی خطبہ نمبر (۸) نظام دفاع اور غزوات---کے تحت آ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ میں نے پہلی مرتبہ انگریزی میں پڑھا۔یہ جہازی سائز کے ایک رسالے کی صورت میں تھا۔اس میں نقشے بنے ہوئے تھے۔

پیرس جانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے نجد وحجاز کے سفر میں اس مقالے کے لئے بہت کچھ مواد اکٹھا کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ ایک ایک میدان جنگ خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھیں۔

اردو زبان میں یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔اردو میں یہ درسی کتابوں کے سائز پر چھپا اور اردو کتابوں کے ناشرین نے اس کے نقشے اور چارٹ اس میں سے نکال دیئے ہیں۔جس زمانے میں ڈاکٹر حمید اللہ کی یہ کتاب چھپی اس زمانے میں میجر جنرل اکبر اور دوسرے بہت سے فوجیوں کی کتابیں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔مصر میں اب سے چالیس برس پہلے ان تفصیلات اور ندرت کے ساتھ کوئی کتاب نہ چھپی تھی۔

صحیفہ ہمام بن منبہ کی تدوین کا کام ڈاکٹر صاحب نے طالب علمی کے زمانے ہی سے شروع کر دیا تھا۔یہ ان کا مدون کیا ہوا پہلا مخطوطہ ہے۔جس میں حضرت ابوہریرہؓ کی جمع کردہ حدیثیں ہیں۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کئی اور کتابیں مدون (Edit) کیں جن میں بلاذری کی انساب الاشراف،ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات کو بڑی شہرت ملی۔

انساب الاشراف کے حوالے تو ملتے تھے لیکن اس کی کچھ جلدیں ناپید ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے کو مدون (Edit) کر کے تاریخ اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔

ابوحنیفہ دینوری نے جزیرہ نمائے عرب کی تمام جڑی بوٹیوں کی تفصیل ان کے خواص اور ان کے بارے میں بعض حیرت انگیز تفصیلات دی ہیں۔یاقوت اور حاجی خلیفہ کے مطابق وہ تیسری صدی ہجری کے آخری چوتھائی میں پیدا ہوا۔یوں چوتھی صدی ہجری کا

یہ ماہر علم نباتیات بہت بڑا مورخ اور اخبار الطوال کا مصنف بھی ہے۔

قرآن الحکیم کے ترجمے فرانسیسی میں موجود ہیں پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی انہوں نے فرانسیسی زبان میں لکھی ہے جو دو جلدوں میں چھپ گئی ہے۔ انہوں نے دو بڑی اہم کتابوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک امام محمد شیبانی کی کتاب السیر ہے اور دوسری شاہ ولی اللہ صاحب کی حجتہ اللہ البالغہ جس کی پہلی جلد کا ترجمہ غالباً انہوں نے پبلشر کو دے دیا ہے۔

یہاں خطبات گارسان دتاسی پر ان کی نظر ثانی کا ذکر کرتا چلوں۔ یہ اردو ادب و زبان سے متعلق خطبات ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اور پروفیسر عزیز احمد نے ان کا ترجمہ کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کے کہنے پر ڈاکٹر صاحب نے نظر ثانی کے نام سے نیا ترجمہ کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی اسلامی علوم سے متعلق تحریرات کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان ترجموں اور تالیفات کی وجہ سے فرانسیسی قاری یا مستشرقین کو صحیح اسلامی نقطہ نظر میسر آئے گا۔

فرانسیسی اور جرمنی میں اسلامی ادب پر جتنا کام ہوا کم کسی اور زبان میں ہوا ہوگا۔ لیکن مستشرقین نے تمام اسلامی علوم اور تاریخ اسلام کے بارے میں مذموم جانبداری اور عصبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کی صحیح تصویر یورپ اور امریکہ کے سامنے نہیں رکھی۔ پچھلے سال ۱۹۹۶ء میں سان فرانسسکو کے ایک بڑے اجتماع میں اسلامی تعلیمات کو تصوف کا لبادہ اڑھا کر حجرہ نشینی اور چلہ کشی اور مراقبے تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں اپنے ۱۹۹۶ء کے دورے میں امریکہ اور شمالی امریکہ میں مجھے متعدد مواقع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی نقل مکانی سے اب ان علاقوں میں سے مستشرقین کی فریب کاریوں کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب آٹھ زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ عربی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ فارسی کی تعلیم انہوں نے لڑکپن میں حاصل کی۔ انگریزی جامعہ عثمانیہ کی طالب علمی کے چار سالہ دور میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کا نصاب ختم کر کے حاصل کی۔ انساب الاشراف پر کام کے دوران میں انہیں ترکی

میں طویل قیام کرنا پڑا۔ وہاں کی درسگاہوں میں پڑھانے کا موقع بھی ملا۔ اس زمانے میں انہوں نے ترکی میں اچھی خاصی دسترس پیدا کر لی۔ ڈاکٹر صاحب مراکش اور الجزائر میں بھی رہے ہیں۔ وہاں کے لوگ ڈاکٹر صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی زیارت کے لئے پیرس کا سفر کرتے ہیں۔

اطالوی اور یونانی کے ساتھ ساتھ وہ جرمن زبان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے جرمن میں کلام پاک کے ترجمے کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اور چھ پاروں کا ترجمہ شاید مکمل کر چکے ہیں۔

انگریزی میں ڈاکٹر صاحب نے ---محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم--- کے نام سے اوسط ضخامت کی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین مشہور عالم جریدے ---اسلامک کلچر--- میں چھپتے رہے ہیں۔

انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی سیرت کا تو مکمل ترجمہ نقوش کے ایک رسول نمبر میں دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تمام تصانیف اور تالیفات کا احاطہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔ بایں ہمہ بعض اہم کتابوں اور امور کا تذکرہ ضروری تھا۔

ایک مرتبہ نواز شریف صاحب کے پہلے دورِ وزارتِ عظمٰی میں جب وہ پاکستان آئے تو انہیں دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ ان کا حافظہ متاثر ہو گیا تھا۔ بات کرتے اور بھول جاتے تھے۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو کچھ زیادہ دیر تک تقریر نہ کر سکے اور اپنے موضوع سے انصاف بھی نہ کر سکے۔ حافظہ ہی ساتھ نہ دے رہا تھا۔ حیدر آباد کالونی کے جلسے میں میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ تقریر شروع کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا ---مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے میں کیا بات کروں؟

اس موقع پر ڈاکٹر رضی الدین صاحب کو حکومت نے خاص طور پر کراچی آنے جانے کا ٹکٹ بھیجا تھا کہ وہ اپنے دوست کی رفاقت میں رہیں۔ ڈاکٹر رضی بھی ان کے ہم عمر ہیں۔ اب ان کا بھی کبرسنی میں یہی حال ہو گیا ہے۔ حال میں ان پر جو پیہم صدمات گزرے

ہیں کچھ ان کا بھی اثر ہے۔

"فاران کلب" کے جلسے میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک زرد صفحات کے نمائندے نے جو ایک مذہبی جماعت کا دست گرفتہ ہے ان سے اپنی عقل کے مطابق ایک اخلاق سوز سوال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس شرافت اور انکسار سے بُرا مانے بغیر ان کی کردار کشی کرنے والے کو بڑا با اخلاق جواب دیا تو وہ شوریدہ سر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس بداخلاق نمائندے نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کی ڈاکٹر صاحب کی کراچی میں آمدورفت کے اخراجات برداشت کر کے نواز شریف ان سے اپنی مرضی کی بات کہلوانا چاہتے ہیں۔ تفو برتو اے چرخ گردوں تفو!

بات اصل میں یہ تھی کہ بلاسود بینکاری کے بارے میں نواز شریف صاحب ان سے بات کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے والد نے اپنے دور ملازمت میں ایک بلاسودی قرضہ کمیٹی بنائی تھی۔ وزارت مالگواری کے بڑے بڑے لوگ اور بڑی تعداد میں ملازمین اس کے حصہ دار اور اس انجمن امداد باہمی کے رکن تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے دونوں بھائی، مولوی حبیب اللہ اور مولوی صبغت اللہ اس کے منتظمین میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بلاسودی نظام پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ مجلّہ "طیلسانین" حیدر آباد دکن میں شائع ہوا تھا اور غالباً اسلامک کلچر کے بھی ایک شمارے میں چھپا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ ایک زمانے میں مارماڈیوک پکتھال اس کے مدیر ہوتے تھے۔ یہ عالمی معیار کا پرچہ تھا جو دنیا کو اسلامی اقدار سے روشناس کراتا تھا۔

ابھی عالم اسلام میں بلاسود بینکاری کے تعلق سے بڑا شدید تضاد ہے۔ نقل مکانی کر کے جتنے مسلمان گھرانے امریکہ، یورپ اور کینیڈا میں بس گئے ہیں ان کا پہلا سوال ہر اسلامی اسکالر سے یہی ہوتا ہے۔ مجھ سے پچھلے سال ۱۹۹۶ء کے دورے میں اور اس سے پہلے کے دوروں میں اس تعلق سے کئی سوال ہوئے تھے۔ دارالحرب، دارالامن اور دارالسلام کے معیارات کے مطابق میں نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا۔ اصل مسئلہ اس پر اجماع کا ہے۔ صحابہ کرام کے دور کے بعد کسی مسئلے پر مکمل اجماع صدیوں سے نہیں ہوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس مقالے کی بڑی تلاش کی لیکن یہ مقالہ مجھے ابھی تک نہیں مل سکا۔

اس مرتبہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان کی رہائش گاہ نمبر ۱۰ عبداللہ ہارون روڈ گیا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر تنہائی میں ان سے باتیں کر کے آیا۔ اس موقع پر ہم ''البدایہ والنہایہ'' کی آٹھویں جلد کے بارے میں بھی کچھ دیر بات کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو تین مرحلوں پر فرمایا --- امام ابن کثیرؒ بہت بڑے مورخ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے اس دورے کے زمانے میں کسی جگہ انہوں نے عورت کی امامت کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا تھا۔ اسے بھی ایک اختلافی مسئلہ بنانے کے لئے بعض لوگوں نے اخبار ''جنگ'' اور دیگر رسالوں میں مراسلے لکھے اور خبریں چھپوائیں۔ ایک صاحب کا ارشاد تھا کہ --- یہ تاریخ کے آدمی ہیں انہیں فقہی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے --- درسگاہ نظامیہ کا وہی کورس ڈاکٹر صاحب نے بھی پڑھا جو ان مفتی صاحب نے پڑھا اور ان استادوں سے پڑھا جو اس وقت کے چوٹی کے اساتذہ تھے جن کے ہمسر آج نہیں ملتے۔ پھر انہوں نے ایم اے فقہ میں کیا اور ان کا پہلا ریسرچ پیپر بھی قانون بین الممالک کے فقہی مسائل ہی پر تھا۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ سیاسی میدان کی طرح علمی میدان میں بھی صاحبانِ فکر و نظر کا بڑا زبردست خلا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مدینے میں عورتوں کی امام ام ورقہ بنت عبداللہ کے بارے میں ابن سعد کی رائے دہرائی تھی۔ تنقید اس بات پر ہوئی جو ڈاکٹر صاحب نے چھیڑی ہی نہیں تھی ---

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

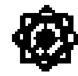
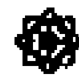
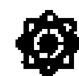
ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلے پر ''فکر و نظر'' جیسے وقیع مجلّے کی جلد نمبر ۲۶ (۱) ماہ ستمبر ۸۸ء میں واضح طور پر اپنا نقطہ نظر بتا دیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے ایسی جامع کمالات شخصیات پیدا ہوں جو مشرقی اور مغربی علوم پر گہری نظر رکھنے والی ہوں۔ علامہ اقبال بھی الٰہیات کی تشکیل جدید کے لئے ایسی ذہین اور فطین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس خلا کو پُر کرنے والوں میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مدت العمر اپنے آپ کو علمی

موضوعات اور تاریخی تحقیقات کی دنیا تک محدود رکھا۔ دینی سیاست کی اکھاڑ پچھاڑ میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کے اپنے بیان کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ ان کے مقالے ہیں اور ۱۶۴ (ایک سو چونسٹھ) کے لگ بھگ ان کی تصنیفات، تالیفات، ترجموں، نظر ثانی شدہ کتابوں، کتابچوں اور رسائل کی تعداد بنتی ہے۔ اس تعداد میں کمی وبیشی بھی ان کے خطوط میں موجود ہے۔ جو مظہر ممتاز صاحب نے رسالہ ''ارمغان'' کے جولائی ۹۶ء تا دسمبر ۹۶ء کے مشترکہ شمارے میں چھپوائے ہیں۔ ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب کا سرمایہ چار جگہ پھیلا ہوا ہے۔ حیدر آباد، کراچی، امریکہ اور پیرس میں اور کسی جگہ بھی کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں جو طالبہ اس وقت ڈاکٹر صاحب پر ایم فل کر رہی ہیں شاید وہ اس معاملے میں پہل کریں تو اس ذخیرے کی وافر مقدار کو سمیٹ سکتی ہیں۔

ابو حنیفہ دینوری کی کتاب ''النبات'' ڈاکٹر صاحب نے اپنی تدوین کے بعد پہلے بھی چھپوائی تھی۔ نظر ثانی کر کے کویت کی حکومت کو بھی دی تھی۔ اب اسے ہمدرد فاؤنڈیشن نے کراچی میں چھاپا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمدرد فاؤنڈیشن بھی ڈاکٹر صاحب کی کئی نگارشات اور تصانیف کو سمیٹنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی رحلت

شاہ بلیغ الدین

عربی کی ایک کہاوت کا مطلب ہے کہ............ایک عالم کا دنیا سے اُٹھ جانا گویا دنیا کا مٹ جانا ہے۔ایسا ہی ایک عالم دنیا سے اُٹھ گیا۔کیا عالم تھا اور کیا انسان تھا کہ اس کا مثل ملنا مشکل ہے۔ایک دانشور نے کہا کہ انہیں دیکھ کر صحابہ کرام یاد آتے تھے۔علم بھی تھا، پارسائی بھی تھی۔بڑی بڑی عباؤں والے مسند شاہی کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں۔کہنے کو تو صاحب طریقت ہوتے ہیں لیکن اقتدار کی چوکھٹ پر سرنگوں ہو جاتے ہیں۔یہ ایسا عابد شب زندہ دار تھا اور ایسا عالم باعمل کہ اقبال کا کہا سچ معلوم ہوتا ہے۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

فیصل ایوارڈ کا اعلان ہوا تو اس برگزیدہ شخصیت نے معذرت کر لی۔یہ کوئی معمولی انعام نہیں تھا سارے عالم اسلام سے اس انعام کے لئے انتخاب ہوتا ہے۔عزت بھی بڑی اور رقم بھی بڑی، بڑی بھی ایسی کہ لاکھوں کی بات ہوتی ہے۔حضرت نے معذرت کر لی۔ انعام نہ لیا۔

مملکت پاکستان نے بڑی منتوں بڑی کوششوں سے نئی صدی ہجری کے آغاز پر ہجرہ ایوارڈ پیش کیا تو پھر معذرت کر لی۔اے۔کے۔بروہی اور جنرل ضیاء الحق نے بہت زور

لگایا۔ بڑی منتیں، خوشامدیں کیں تو بڑی عاجزی اور بڑے انکسار سے کہا کہ چلئے محبتوں کی عطا ہے تو قبول! انعام میرے نام لکھ دیجئے لیکن رقم اسلامی یونیورسٹی کی جھولی میں ڈال دیجئے۔

ترکی، مراکش، پاکستان اور لیبیا جیسے نہ جانے کن کن حکومتوں اور مملکتوں نے اعزازات کی پیش کش کی۔ ان کے ساتھ رقمی عطیات بھی تھے لیکن یہ سارے شاہی اور شہنشاہی تمغے اور نشانات مسترد کرتے ہیں۔ حرص و ہوس تو تھی ہی نہیں ایسے درویش، خدا مست کا نمائش اور ریا سے کیا تعلق! جسے دنیا کی چاہت ہی نہ ہو اسے نمود و نمائش سے کیا سروکار یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عظمتوں کے معراج سمجھ میں آتے ہیں۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کس دیوانے نے موت پائی ہے

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے فلوریڈا کی ریاست سے فون آیا۔ سدیدہ احمد فون پر تھیں شہر جیکسن ول (Jackson-vill) سے بول رہی تھیں۔ وہی جگہ جہاں علم و عمل کے اس ''دیوانے'' نے دنیا چھوڑ دی اور خالق کائنات کی بارگاہ خاص میں حاضر ہو گیا۔ پوتی نے اپنے دادا کے بارے میں بتایا بروز منگل 17 دسمبر 2002 کو صبح اٹھے اپنے کمرے سے نکلے ناشتہ کیا معمول کے مطابق گھر میں ٹہلتے رہے اور اپنی مصروفیات میں لگے رہے۔ دوپہر میں قیلولے کی عادت تھی بعد نماز ظہر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔

باتیں وہ ہمیشہ کم کرتے تھے۔ کوئی ضروری بات ہوتی تو کہہ دیتے تھے ورنہ بے کار باتوں پر منہ نہ کھولتے تھے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کا مطلب ہے کہ بے ضرورت باتوں پر منہ نہ کھولنا چاہیئے۔ ان کا بھی حساب ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا انہیں کس درجہ خیال تھا۔ خیال کیا اسوہ حسنہ تو ان کی زندگی کا مآل تھا۔

سدیدہ احمد کسی کالج میں پڑھاتی ہیں۔ روزگار کا یہ ذریعہ ختم ہونے کے بعد تبلیغِ دین کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ نئی نسل کی تعلیم پر ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے۔ وہی پیرس جا کر اپنے دادا کو ساتھ لے آئی تھیں پھر وہ انہی کے ساتھ رہے۔ باتوں باتوں میں سدیدہ نے

کہا کہ وہ دین کے کاموں کا کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔ دادا نے تاکید کی تھی کہ ان کاموں کا معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ میں نے سنا اور دیکھا کہ دادا خود اس پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان کی محدود آمدنی تھی اسی پر صبر اور شکر سے گزارا کرتے۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کر اللہ کی راہ میں بانٹتے۔ ان کی زندگی سادہ ان کے اصول آسان اور ان کا لہجہ بہت نرم ہوتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ''قولو للناس حسنا'' کے حکم پر عمل پیرا رہتے تھے۔ اللہ کا حکم ہے کہ اچھی بات کرو اس میں لہجے کی نرمی کا بھی حکم ہے اور بات کی اچھائی کا بھی۔

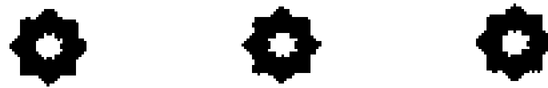
اس مضمون کی ابتداء میں ''فیصل ایوارڈ'' اور ''ہجرہ انعام'' کی جو تفصیل آپ نے پڑھی اس کی وجہ یہ تھی کہ دینی کاموں کا معاوضہ کسی صورت اور کسی بھی انداز سے لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ یہ صرف علم و عمل کی وہ صورت تھی جس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ کردار صحابہ کی یہ متاع گم گشتہ اب ملت اسلامیہ میں شاذ و نادر ہی کسی اہل نظر میں ملتی ہے اللہ نے کردار کی یہ عظمت ڈاکٹر حمید اللہ کو عطا فرمائی تھی۔

سدیدہ احمد نے بتایا کہ نیند کی حالت میں دادا کی روح خالق حقیقی سے جا ملی۔ ہم لوگوں کو عصر کے وقت یہ احساس ہوا کہ وہ نماز کے لئے اٹھے نہیں جب ہم انہیں اٹھانے کے لئے پہنچے تو حقیقت کا علم ہوا۔ بدھ 18 دسمبر 2002ء کو ظہر کی نماز کے بعد آرلنگ ٹن کی مسجد کے امام پروفیسر ڈاکٹر یونس کوچی نے جیکسن ول کی اسلامی مرکزی مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی پروفیسر کوچی استنبول میں ڈاکٹر صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ وہ آرلنگسٹن (ڈالاس) سے اس موقع پر فلوریڈا آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے 95 برس کی عمر پائی۔ وہ 19 فروری 1908 بروز بدھ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبے دینیات سے انہوں نے فقہ میں ایم اے کیا اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لے کر یورپ سدھارے۔ ان کی دونوں ڈگریاں درجہ اول کی تھیں۔ وہ اپنے دور کے بہت ہی ممتاز اور ذہین طالب علم سمجھے جاتے تھے۔ اساتذہ اسی زمانے سے اپنے ہونہار شاگرد کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر قائداعظم یونیورسٹی ان کے معاصرین میں تھے۔ 1948ء میں وہ سقوط حیدر آباد سے پہلے سیکورٹی کونسل کے اس وفد میں شریک ہو کر نیویارک پہنچے جو نواب معین نواز جنگ وزیر خارجہ

مملکت حیدرآباد کی قیادت میں وہاں پہنچا تھا۔ افسوس کہ اسی دوران میں جب سلامتی کونسل حیدرآباد کا دستوری مقدمہ سن رہی تھی کہ بھارت نے حیدرآباد پر جارحانہ حملہ کیا اور اٹھارہ راستوں سے اپنی بھاری فوج کے ساتھ اسلامیان ارض ہمالہ کی اس آزاد اور مقتدر اعلیٰ مملکت کو زبردستی ہندوستان میں ضم کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب اس سانحے کے بعد پھر حیدرآباد نہیں گئے۔ وہ پیرس میں علمی اور تحقیقاتی کام بھی کرتے رہے اور حیدرآباد کی آزادی کے لئے بڑے زمانے تک کوشاں بھی رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی کارناموں کے بارے میں پھر کسی موقع پر گفتگو ہوگی۔ جامع عثمانیہ کے قیام کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس جامعہ سے ایسے باصلاحیت اور ذہین طالب علم نکلیں جو مشرقی اور مغربی علوم سے واقف اور اسلام و ایمان کی برکتوں سے مالا مال ہوں۔ ڈاکٹر حمیداللہ ان کے ساتھیوں اور جامعہ عثمانیہ کے ذہن طالب علموں نے اس مقصد کو پورا کیا جن میں ایسے ایسے سائنسدان، انجینئر، ڈاکٹر، اسکالرز، بینکار پیدا ہوئے جنہوں نے بین الاقوامی سطح پر اپنی مادر علمی کا نام روشن کیا۔ ڈاکٹر حمیداللہ انہی ممتاز فرزندان جامعہ میں گلِ سرسَبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے جو فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں ہے اعلیٰ تحقیقی معیار کے مطابق مستشرقین کو اسلام کی صحیح تصویر دکھلائی۔ یہ کام اس قدر دقت نظر کے ساتھ پچھلی کئی صدیوں میں کسی نے انجام نہ دیا تھا۔



حصہ دوم

ڈاکٹر حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ

کی تحریروں کا انتخاب



تاریخِ قرآن مجید

ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن مجید کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اُردو زبان کو لیجئے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے۔ انگریزی میں پانچ سو سال پہلے کے مؤلف "چاسر" (Chaucer) کی کتاب کو لندن کا کوئی شخص، یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا، سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم و جدید زبانوں کا ہے۔ یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا جل شانہٗ کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہو جانے والی زبان میں آتا تو پھر خدا جل شانہٗ کی رحمت کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دیں تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں کیونکہ صدیوں پرانی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثناء ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر عربی، یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو عربی آج اخباروں میں پڑھتے ہیں، ان دونوں میں بہ لحاظ الفاظ، گرامر، ہجے اور تلفظ، کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپؐ

سے گفتگو کروں تو آپؐ اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپؐ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبیؐ پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہئے جو غیر تبدل پذیر ہو، لہٰذا عربی کا انتخاب کیا گیا۔ اس زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت، بلاغت، ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ عربی زبان غیر تبدل پذیر ہے اور اسکے لیے ہمیں عربوں کا شکر گزار بھی ہونا چاہئے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کی زبانوں کو اپنی زبان نہیں بنالیا۔ بلکہ اپنی عملی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

جہاں تک نزول قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ جیسا کہ زبور (تورات) کے متعلق یہودیوں کا بیان کہ اسے خدا جل شانہ نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی مرتبہ دے دیا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تیئس سال تک جستہ جستہ (نجماً نجماً) نازل ہوتا رہا اور یہ اس کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز 610ء میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معتکف تھے۔ وہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے ہیں اور آپ تک خدا جل شانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اُمی ہیں۔ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اس اُمی شخص کو جو پہلا حکم دیا گیا وہ ہے "اِقرأ" اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے پڑھنے کا حکم کیوں دیا جاتا ہے؟ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے خدا جل شانہ انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا یا دوسرے الفاظ میں، قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن، انسانی تہذیب کا مخزن (depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جائے۔ آنے والے اس میں نئی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء یہی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے۔ ورنہ آپ غور کریں کہ کوا آج سے بیس لاکھ سال پہلے جس طرح گھونسلا بناتا تھا آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ لیکن انسان وہ جانور ہے جو چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آج وہ ساری کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ ساری ترقیاں انسان نے اس لیے کی ہیں

کہ اس کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تجربات کا جو علم حاصل ہوا اس میں سے اس نے اپنے ذاتی تجربوں سے بہت کچھ اضافہ کیا اور اس سے استفادہ کرتا رہا۔ اور یہ سب قلم کی بدولت ممکن ہوا۔ 'علم بالقلمْ علم الانسان مالم یعلم' ٥ (۹۶:۵) میں اس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جب ''سورۃ العلق'' کی یہ پانچ ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار کو چھوڑ کر واپس آئے۔ اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا جل شانہٗ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچا زاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے، وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔ کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے، وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ ؐ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ اپنے ساتھ ورقہ ابن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے ان کے عزیز دوست ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ ابن نوفل بہت بوڑھے تھے۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں''۔ ناموس کا لفظ اُردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بعض مفسرین ناموس کے معنی ''قابل اعتماد'' لکھتے ہیں۔ وہ بھی یہاں موزوں نہیں ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ ''روح الامین'' ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ''ناموس'' اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو مُعرب ہو کر عربی زبان میں مستعمل ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ ''نوموس'' (nomos) ہے۔ یونانی زبان میں توریت کو ''نوموس'' کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ

بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ اور یہ معنی زیادہ قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحٰق کی کتاب المغازی میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ضائع ہوگئی ہے لیکن اس کے بعض ٹکڑے حال ہی میں ملے ہیں اور حکومت مراکش نے اس کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے، جسے ابن ہشام نے اپنی سیرۃ النبی میں معلوم نہیں کس بنا پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی، تو آپؐ سب سے پہلے اُسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد اسی عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے''۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، یہ کہنا مشکل ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرانا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقعے پر قرآن مجید کی ''سورۃ العلق'' کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں تو ایک حدیث کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بتایا۔ خود جبرائیل علیہ السلام امام بنے اور پیغمبر مقتدی کی حیثیت سے پیچھے کھڑے دیکھتے رہے کہ پہلے کھڑے ہوں، پھر رکوع میں جائیں، پھر سجدہ کریں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ لہٰذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا ہوگا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھنی ہیں، ان نمازوں میں ان کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اس کو لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کے ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اسی کو

بار بار پڑھتا ہے، بالآخر وہ حفظ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کو حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایسے شخص کو، جسے لکھنا پڑھنا آتا ہو، یاد فرماتے اور اس کی املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ تاکہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہے تو اس کی اصلاح کرا سکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کر لو اور روزانہ دو وقت نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھیں۔ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں صرف عید الاضحیٰ عید الفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا رہے تو ظاہر ہے قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔

الغرض قرآن مجید کو لکھنے اور اسے حفظ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے پہلے انبیاء علیہ السلام کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور کام بھی ہوا۔ وہ یہ کہ، فرض کیجئے میرے پاس ایک تحریری نسخہ موجود ہے جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ اس غلط نسخے کو میں حفظ کر لیتا ہوں۔ اس طرح میرا حفظ بھی غلط ہوگا۔ اس کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور حکم دیا کہ ہر مسلمان کو کسی مستند استاد ہی سے قرآن مجید پڑھنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر قرآن مجید سے کون واقف ہوسکتا ہے؟ اس لیے ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنا اور پڑھنا چاہیئے۔ اگر اس کے پاس تحریری نسخہ موجود ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فرمائیں کہ ہاں یہ نسخہ ٹھیک ہے تب اسے حفظ کیا جائے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ظاہر ہے کہ ایک آدمی سارے لوگوں کو تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسے صحابہؓ

کو، جن کی قرآن دانی کے متعلق آپؐ کو پورا اعتماد تھا، یہ حکم دیا کہ اب تم بھی پڑھایا کرو۔ یہ وہ مستند استاد تھے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند دیتے تھے کہ تم پڑھانے کے قابل ہو۔ اور اس کا سلسلہ آج بھی دنیا میں قائم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی استاد سے قرآن مجید پڑھتا ہے تو قراۃ کی تکمیل کے بعد استاد کی طرف سے اسے جو سند ملتی ہے، اس میں وہ استاد لکھتا ہے کہ "میں نے اپنے شاگرد کو قرآن مجید کے الفاظ، قرآن مجید کے قراۃ کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر یہ تعلیم دی ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میرے استاد نے مجھ تک پہنچائی تھی اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ اس کو اس نے اپنے استاد سے اسی طرح پڑھا تھا"۔ اس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اسلامی روایت (tradition) کے سوا دنیا کی کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یہ اصول کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔ یہ چیزیں قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں عہد نبویؐ میں ہی پیش آئیں مگر اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ ایک اور چیز کی بھی شروع ہی سے ضرورت تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں، قرآن مجید کے تحریری نسخوں کے متعلق بھی کچھ آپ کو بتاتا چلوں کہ ان کا کب سے پتہ چلتا ہے۔ غالباً نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے واقعہ سے آپ واقف ہوں گے۔ میں مختصراً ذکر کر رہا ہوں کہ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو اس پر آمادہ کر لیا کہ جو چیز وہ پڑھ رہی تھیں وہ ان کو دکھائیں۔ انہوں نے غسل کرانے کے بعد آپؓ کو وہ چیز پیش کی۔ یہ قرآن مجید کی چند سورتیں تھیں۔ ان کو پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کی کم از کم چند سورتوں کے تحریری صورت میں پائے جانے کا ذکر سنہ ۵ نبوی ہی سے قبل ہجرت تک ملتا ہے۔ اس کے بعد جس تحریری نسخے کا پتہ چلتا ہے، اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔ یہ غالباً بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے۔ مدینے سے کچھ لوگ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اُن میں سے بنی زریق کے ایک شخص کے بارے میں مؤرخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا مکمل مجموعہ ان کے سپرد کیا۔ یہ صحابی

مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے قبیلے میں، اپنے محلے کی مسجد میں روزانہ باآواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن مجید کے مدون ہونے یا تحریری صورت میں پائے جانے کا یہ دوسرا واقعہ ہے جس کا مؤرخوں نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مستند استاد سے پڑھنا پہلی خصوصیت تھی۔ دوسری خصوصیت تحریری صورت میں محفوظ رکھنا، تاکہ اگر کہیں بھول جائے تو تحریر دیکھ کر اپنے حافظے کو تازہ کر لیا جائے، اور تیسری خصوصیت اسے حفظ کرنا تھا۔ ان تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ قرآن مجید کامل حالت میں بہ یک وقت نازل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جستہ جستہ ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میکانیکی طور پر مدون نہیں کیا کہ پہلی آیت شروع میں ہو اور بعد میں نازل شدہ دوسرے نمبر پر رہے بلکہ اس کی تدوین حکمت نبویؐ کے تحت ایک اور طرح سے کی گئی۔ قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیتیں سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں۔ یہ آیتیں سورہ نمبر ۹۶ میں ہیں جب کہ قرآن مجید کی کل سورتیں ۱۱۴ ہیں۔ ان میں ۹۶ نمبر پر ابتدائی سورہ ہے۔ قرآن مجید کی جو بالکل ابتدائی سورتیں ہیں، مثلاً سورۃ البقرہ، وہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید زمانی ترتیب کے لحاظ سے مدون نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری صورت میں تدوین ہوا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو دشواریاں پیش آ سکتی تھیں، یعنی آج ایک سورہ نازل ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت دیتے تھے کہ اس کو فلاں مقام پر لکھو۔ پھر کل ایک آیت نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اس کو فلاں آیت سے قبل لکھو یا فلاں آیت کے بعد لکھو یا فلاں سورہ میں لکھو۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی ہوتی رہے۔ لوگوں کے ذاتی نسخوں کی اصلاح اور نظر ثانی کا ذکر بھی ہجرت کے بعد سے ملتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینے میں دن کے وقت قرآن مجید کو، جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا، باآواز بلند دہرایا کرتے تھے اور ایسے صحابہ جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، اپنا ذاتی نسخہ ساتھ لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر اس کا موازنہ کرتے جاتے، تاکہ اگر ان سے کسی لفظ کے لکھنے میں یا سورتوں کو صحیح مقام پر درج کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو، تو وہ اس

کی اصلاح کرلیں۔ یہ چیز "عرضہ" یا پیشکش کہلاتی تھی۔ مؤرخین مثلاً امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آخری سال، وفات سے چند ماہ پہلے، جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپؐ نے پورے کا پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آ گئی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کے متعلق جبرائیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہوں تو وہ باقی نہ رہیں۔ یہ تھی تدبیر، جو آخری نبیؐ نے آخری پیغام ربانی کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائی۔ اس طرح قرآن مجید کے ہم تک قابل اعتماد حالت میں پہنچنے کا اہتمام ہوا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو شروع میں قرآن مجید کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود تھا اس کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ قرآن مجید کی طرف فوری توجہ دیں۔ اس زمانے میں قرآن مجید کا کوئی سرکاری نسخہ موجود نہیں تھا اور غالباً کسی ایک شخص کے پاس بھی کامل قرآن مجید موجود نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ملک میں چند لوگ مرتد ہو گئے اور مسیلمہ کذاب نے نہ صرف ارتداد کیا بلکہ نئے نبی ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ وہ چونکہ ایک طاقتور قبیلے کا سردار تھا، اس لیے بہت سے لوگ اس کے حامی بھی ہو گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے جنگ کی۔ یہ جنگ بہت شدید تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ بھی دشمن کے علاقے میں یمامہ کے مقام پر ہوئی۔ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہید ہونے والوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو قرآن مجید کے بہترین حافظ سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مدینے کے مسلمانوں کو فتح پر خوشی ہوئی لیکن یہ اطلاع پا کر کہ بہت سے برگزیدہ اور بہترین مسلمان اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں، رنج بھی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی اور حافظ قرآن رفتہ رفتہ آئندہ جنگوں میں شہید ہوتے رہے یا طبعی موت سے اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو پھر قرآن مجید کے لیے بھی وہی دشواری پیش

آئے گی جو پرانے انبیاء علیہ السلام کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ اس لیے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر المومنین! قرآن کے تحفظ پر توجہ فرمائیے۔ یمامہ کی جنگ میں چھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب، ان کی سیرت کے ایک خاص پہلو کا مظہر ہے۔ وہ فدائے رسولؐ تھے اور فدائے رسولؐ کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے عمر! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بحث کرتے ہیں۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہوئے کہ ہم کسی تیسرے شخص کو حَکَم بناتے ہیں، وہ جو فیصلہ کر دے ہم اس پر عمل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا حَکَم بنایا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب وحی تھے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فوری جواب بھی وہی تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ دوبارہ بحث ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا اے زیدؓ! اگر لکھیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ روایت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ واقعی میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ حرج تو مجھے بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ایک جذباتی رویہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو ہم کیسے کریں، لیکن اگر کریں تو اس سے کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ میں یہ کام سرانجام دوں تو مجھے یہ اتنا مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تدوین کے مقابلے میں اگر مجھے جبل احد کے ڈھانے کا حکم دیا جاتا تو وہ میرے لیے آسان ہوتا۔

قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احکامات قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے شہر مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ تحریری صورت میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ''عرضہ'' کے موقع پر جو تلاوت ہوئی تھی، اس سے مقابلہ کر کے تصحیح شدہ ہے، یا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ موجود ہے تو وہ لا کر اس کمیشن کے سامنے پیش کرے۔ کمیشن کے

صدر حضرت زید بن ثابتؓ تھے لیکن کئی اور مددگار بھی تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیشن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید کے جو نسخے پیش کیے جائیں، قابل اعتماد ہوں، ''عرضہ'' میں پیش کیے گئے نسخے ہوں۔ اگر کوئی آیت کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود ہو تو اسے لکھا جائے ورنہ رد کر دی جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' کے زمانے میں اس طرح قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور اس کو ایک کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ یہ بات بھی نہ بھلایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم از کم بیس پچیس حافظ موجود تھے، جن میں سے کچھ انصار تھے اور کچھ مہاجرین، جنہیں سارا قرآن مجید یاد تھا۔ ان میں ایک خاتون حافظ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ خود اس کمیشن کے صدر، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حافظ تھے، اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا، اس یقین کے ساتھ لکھا کہ یہ میرے ذہن میں بھی موجود ہے۔ آج الحمدللہ اس بات کی شہادتیں مل گئی ہیں۔ یہاں تک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کرتا چلوں کہ جب لوگ نسخہ لا کر پیش کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں حکم دیتے تھے کہ قسم کھا کر بتاؤ کہ یہ نسخہ جو تم پیش کر رہے ہو، وہی ہے جس کی تصحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی ہے۔ وہ قسم کھا کر یقین دلاتے تو پھر اس سے استفادہ کیا جاتا۔

ایک اور نکتہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا اور اسی پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائیوں کے پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے۔ اور ان کا آپس میں موازنہ کیا جائے۔ چنانچہ یونانی زبان میں انجیل کے جتنے نسخے دنیا میں پائے جاتے تھے ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا مقابلہ (collation) کیا گیا۔ اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں: ''کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں'' اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے: ''ان میں سے 1/7 اہم ہیں'' یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کو قرآن کے

متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونخ یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ''قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ''۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں ۱۹۳۳ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پریٹشل، پیرس آیا تھا تاکہ پیرس کی لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن مجید کے بیالیس ہزار (42,000) نسخوں کے فوٹو اسٹیٹ موجود ہیں، اور مقابلے (collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت اور اس کا کتب خانہ، سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلے کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہوگی وہ کوئی دوسرے نسخوں میں نہیں ہوگی۔ مثلاً فرض کیجئے ''بسم اللہ الرحیم'' میں ''الرحمٰن'' کا لفظ نہیں۔ لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے۔ باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے، سب میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے۔ اس کو ہم کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ یا کہیں کوئی لفظ بڑھ گیا ہے۔ مثلاً ایک نسخے میں ''بسم اللہ اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے۔ تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلافِ روایت، یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں میں ملے، ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا جل شانہٗ کا جو فرمان ہے۔ ''انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون'' [ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے] یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے، اس آیت کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں۔

﴿ 2 ﴾

تاریخِ حدیث شریف

آج کی تقریر کا موضوع تاریخِ حدیث ہے۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا ذکر ناگزیر ہے، اس لیے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو اسلام کا محور ہیں۔ شاید یہ نامناسب نہ ہوگا اگر میں شروع ہی میں تاریخ کے اس پہلو پر نظر ڈالوں کہ حدیث کی اہمیت کیا ہے اور یہ کہ حدیث اور قرآن کا ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے، اور کچھ نہیں تو دس پندرہ جگہ صراحت کے ساتھ، مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانو مثلاً "ما آتاكم الرسول فخذوه ج وما نهكم عنه فانتهوا ج" (جو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ) (۵۹:۷) اس سے بھی زیادہ زوردار صراحت کے ساتھ ایک اور آیت ہے: من يطع الرسول فقد اطاع الله (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا خدا کی اطاعت کرتا ہے (۴:۸۰) تو یہ آیت نیز اس طرح کی دوسری آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآنی تصور میں حدیث کوئی کم درجے کی چیز نہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا درجہ قرآن کے برابر ہی ہے۔

مختلف وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حدیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا دوسروں تک ابلاغ اتنا یقینی نہیں رہتا جتنا قرآن کا یقینی ہے۔ قرآن مجید کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں مدون کرایا اور اس کے تحفظ کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو اس سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں کی تھیں یا کم از کم تاریخ میں ہمیں

اس کی نظیر نہیں ملتی۔مگر حدیث کے متعلق یہ صورت پیش نہیں آئی اور اس کی وجہ ممکن ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل مبارکہ کا یہ پہلو بھی ہو کہ آپؐ میں تواضع بہت تھی۔اپنے آپ کو محض انسان سمجھتے تھے۔انما انا بشر مثلکم یہ خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ غالب رہتا تھا، بہ نسبت اس خیال کے کہ میں اللہ جل شانہٗ کا رسول ہوں۔شاید یہ تصور رہا ہو یا کوئی اور، بہر حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تدوین پر وہ توجہ نہ فرمائی جو قرآن مجید کے متعلق رہی۔اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ قرآن کریم میں "وما ینطق عن الھویٰ ٥ ان ھو الا وحی یوحیٰ ٥" (۴:۳-۵۳) کے ذریعے سے یہ واضح کیا گیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے بیان کرتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کرتے بلکہ وہ اللہ جل شانہٗ کی وحی کردہ چیز ہوتی ہے۔اس طرح ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی بیان کرتے ہیں وہ خدا کی وحی پر مبنی ہوتا ہے۔جب وحی آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غلطی نہیں کرتے اسے من وعن پہنچاتے ہیں لیکن اگر وحی نہ آئے تو انتظار کرتے ہیں کیونکہ وحی پیغمبر کے اختیار میں نہیں۔جب خدا جل شانہٗ چاہتا ہے وحی کرتا ہے اور جب وہ نہیں چاہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہیں ہوتا وہ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر من گھڑت طور سے اپنی بات کو وحی قرار نہیں دے سکتے۔ہمیں حدیث میں ایسی کافی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض دنیوی معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ بھی فرماتے تھے۔مثال کے طور پر ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام دیے۔صحابہ نے کہا کہ کیا یہ وحی پر مشتمل ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگر وحی پر مشتمل ہوتے تو میں تم سے مشورہ نہ کرتا۔غرض حدیث کی اہمیت قرآن کی اہمیت سے کسی طرح کم نہیں۔اگر ان دونوں میں فرق ہے تو اس قدر کہ حدیث کا ثبوت ہمیں اس طرح کا نہیں ملتا جس طرح قرآن کے متعلق ملتا ہے کہ متواتر چودہ سو سال سے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطے اور ایک ایک شوشے کے متعلق ہمیں کامل یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا جو قرآن تھا وہی اب بھی باقی ہے۔حدیث کے متعلق ایسا نہیں ہوا۔

قرآن کی مماثل چیزیں اور قوموں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً یہودیوں کے پاس توریت

اللہ جل شانہٗ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ یا مثلاً اور قوموں کے ہاں بھی دعویٰ ہے کہ خدا جل شانہٗ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، تو قرآن کے مماثل الہامی کتابوں کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، لیکن حدیث کی مماثل چیزیں دیگر قوموں میں مجھے نظر نہیں آتیں۔ بدھ مت میں ایسی چیز موجود ہے مگر اس کی اہمیت وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں حدیث کی ہے۔ بدھ مت کی اساسی اور بنیادی کتاب اسی قسم کی ہے جیسے ہمارے ہاں ملفوظات کے نام سے مشہور مجموعے ہیں جن میں کسی ولی، کسی بزرگ یا کسی مرشد کے اقوال کو ان کے مریدوں میں سے کسی نے قلم بند کیا ہے۔ بدھ کے ملفوظات بھی صرف ایک شخص کے جمع کردہ ہیں لیکن حدیث کے مماثل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ بہت سے اہل ایمان اپنے مشاہدات اور اپنے محسوسات کو جمع کر کے بعد والوں تک پہنچانے کی کوشش کریں، جیسا کہ حدیث کے مجموعوں میں کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔ گویا حدیث ایک ایسا علم ہے اور حدیث کے مندرجات ایسی چیزیں ہیں جن کے مماثل کوئی اور چیز دوسرے مذاہب میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ ان حالات میں تقابلی مطالعے کا امکان باقی نہیں رہتا لہٰذا براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تاریخ ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

حدیث کے سلسلے میں چند اصطلاحوں کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک لفظ حدیث ہے اور ایک لفظ سنت، اب یہ دونوں تقریباً مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ حدیث سے مراد وہی ہے جو سنت کا مفہوم ہے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ چیزیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کردہ امور جن کا تذکرہ کسی مشاہدہ کرنے والے کی طرف سے ہو کہ میں نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا، یا یوں کہا اور تیسرے وہ امور جنہیں ہمارے مؤلفین ''تقریر'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ امور جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا اور اسے اس سے منع نہ کیا یا خاموش رہے، تو گویا اپنی خاموشی سے آپ نے اس عمل کو برقرار رکھا۔ یعنی آپؐ کے سکوت سے بھی اسلامی قانون بن جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی بُرائی کو دیکھیں تو نہی عن المنکر کریں یعنی اپنے صحابی کے کسی ایسے فعل کو جو اسلام کے

مطابق نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاف تو کر دیں گے کہ اس صحابی نے غفلت سے یا ناواقفیت سے کیا ہے لیکن اسے روکیں گے ضرور کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ مختصر یہ کہ حدیث سے متعلق تین چیزیں پائی جاتی ہیں ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، تیسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے کے قول و فعل کو برقرار رکھنا یعنی اصطلاحی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''تقریر''۔ پہلی دو اصطلاحوں یعنی حدیث اور سنت میں اب تو کوئی فرق نہیں لیکن ابتداء میں فرق تھا۔ حدیث کے معنی ''بولنا'' یعنی ''قول'' اور سنت کے معنی ہیں ''طرز عمل'' اب گویا قول اور فعل دونوں ایک ہی طرح کی چیزیں ہوئیں۔ بارہا صحابہ کی نقل کردہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی، مگر اس کے لیے حدیث کو حدیث اور سنت میں تقسیم کر کے ان کو الگ الگ کر کے جمع کرنا ناممکن بات تھی۔ اس لیے کثرت استعمال سے حدیث سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اسی طرح سنت سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اب عملاً ان میں کوئی فرق باقی نہیں ہے، جہاں تک میرے علم میں ہے۔

حدیث اور قرآن کے مابین ایک تیسری چیز بھی آتی ہے اس سے بھی واقفیت ہو جانی چاہیے۔ اگرچہ اس میں اور حدیث میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، لیکن ایک حد تک فرق ضرور ہے وہ چیز ہے حدیث قدسی۔ حدیث قدسی کے معنی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ وہ حدیث جس کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہیں ''اللہ کہتا ہے'' کہ ''فلاں فلاں''۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں حدیث ساری ہی اللہ جل شانہٗ کے الہام پر مبنی ہے کیونکہ یہ ''وما ینطق عن الھویٰ ○ ان ھو الا وحی یوحیٰ ○'' (۵۳:۴،۳) کی آیت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرمائیں کہ اللہ جل شانہٗ کہتا ہے کہ فلاں چیز تو اس کو ہمارے مؤلف ایک مستقل درجے میں رکھتے ہیں اور اسے ''حدیث قدسی'' کا نام دیتے ہیں۔

حدیث کی دو بڑی قسمیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ ایک سرکاری مراسلے اور دوسرے صحابہ کا اپنے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل کا جمع کرنا۔ میں اولاً پہلی چیز کا ذکر کروں گا یعنی سرکاری مراسلے یا سرکاری تحریریں۔ ہجرت سے پہلے ہی ہمیں چند چیزوں کا

پتہ چلتا ہے مثلاً آپ واقف ہیں کہ تقریباً سنہ (۵) پانچ نبوت میں، ہجرت سے سات آٹھ سال پہلے مکے میں جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ظلم وستم کیا تو کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گئے اس سلسلے میں ایک دستاویز ہمیں ملتی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض اس سے واقف بھی ہوں کہ اس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آتا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی جعفر طیارؓ کو دیا کہ یہ خط نجاشی کو جو حبشہ کا حکمران تھا پہنچا دیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''شروع اللہ کی حمد وثنا سے۔ اے نجاشی، میں اپنے چچازاد بھائی کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں اس کے ساتھ کچھ اور بھی مسلمان ہیں جب یہ تیرے پاس پہنچیں تو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا''۔

ظاہر ہے کہ خط پر تاریخ نہ ہونے کے باوجود یہ خط ہجرت حبشہ کے زمانے کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس زمانے کی ایک اور چیز ملتی ہے جو کافی دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ یہ تمیم داریؓ کا واقعہ ہے۔ تمیم داری شام کے رہنے والے ایک عیسائی تھے۔ وہ مکہ آتے ہیں، اسلام قبول کرتے ہیں اور پھر اپنے قصے بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک جہاز ران تھے بہت سے بحری سفر کر چکے تھے، جن کا تفصیل کے ساتھ ''صحیح مسلم'' میں ذکر آیا ہے۔ تمیم داریؓ نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بہت جلد میرے وطن یعنی شام کو فتح کرے گی جب یہ ہو تو مجھے فلاں فلاں گاؤں بطور جاگیر مرحمت فرمائیں۔ تاریخی کتابوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پروانہ لکھوایا اور اس کو دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر مرطوم، خبرون (اور چند گاؤں کے نام ہیں) وغیرہ فتح ہو جائیں تو تمیم داریؓ کو دیئے جائیں۔ غرض یہ بھی ہجرت مدینہ سے پہلے کی تحریری چیزوں میں سے ایک چیز کہی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ دوسرا مختصر دور ہجرت کا وقت ہے، یعنی مکہ سے مدینہ کے سفر کا دس بارہ دن کا زمانہ۔ اس زمانے میں بھی ہمیں بعض تحریری چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر سراقہ بن مالک کا واقعہ ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

تعاقب کیا۔ چاہا کہ آپؐ کو گرفتار کرلے اور قریش کے ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچ دے، کیونکہ قریش نے اعلان کیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرے گا اسے اتنا انعام دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثناء میں کئی معجزات بھی پیش آئے۔ کہتے ہیں کہ آخر میں سراقہ نے معافی چاہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کیا تو اس پر اس نے درخواست کی کہ مجھے پروانہ امن دیا جائے۔ ہمارے راوی بیان کرتے ہیں کہ اس ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوات قلم اور کاغذ موجود تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں لکھنا پڑھنا جاننے والا ایک غلام بھی موجود تھا جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا۔ چنانچہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کروایا، جس میں سراقہ بن مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امن اور پناہ دینے کا ذکر تھا۔ بعد میں سراقہ مسلمان ہو گیا اور جس وقت وہ مسلمان ہونے کے لیے آیا اس نے بتایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ پروانہ میرے پاس ہے۔ چنانچہ اس تحریر کی اساس پر صحابہ نے اسے قریب ہونے کا موقعہ دیا۔ باوجود ہجوم کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور گفتگو کی۔ اسے ہجرت کے زمانے کی تحریروں میں شامل کیا جائے گا۔ ایسی چیزیں زیادہ تو نہیں ہیں۔ غالباً ہجرت کے دور کی یہ واحد مثال ہے۔

مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اب سرکاری تحریروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ان میں کچھ سرکاری کاغذات ہیں اور کچھ تحریریں خالص پرائیویٹ قسم کی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی ہیں جن کی کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ ایسی چیزیں بھی اس زمانے میں پائی جاتی ہوں گی مثلاً ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کے نام لکھو۔ چنانچہ مردم شماری کی گئی۔ صحیح بخاری کے مطابق اس فہرست میں پندرہ سو نام لکھے گئے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کی تعداد پندرہ سو تھی۔ اگرچہ بخاری کی روایت میں صراحت نہیں ہے کہ کس سال کا واقعہ ہے لیکن پندرہ سو کی تعداد ایسی ہے کہ میرے خیال میں ہجرت سے عین بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد اور بے شمار چیزیں ایسی ملتی ہیں جو تحریراً عمل میں آئیں ان میں سے

بعض چیزیں پرائیویٹ ہیں ۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام خریدتے ہیں اس کا پروانہ موجود ہے کہ میں نے یہ غلام فلاں شخص سے خریدا، اتنی رقم دی گئی۔ یا ایک غلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آزاد فرماتے ہیں، اسے آزادی کا تحریری پروانہ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو آزاد کیا جاتا ہے۔ اسے سب تسلیم کرلیں کہ یہ شخص آزاد ہے، اب آئندہ اسے غلام نہ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور چیز ذرا بعد کی ہے غالباً ۸ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ کے ایک شخص کو خط لکھتے ہیں کہ "جیسے ہی یہ پیغام رساں پہنچے زمزم کا پانی فوراً اس کے ہاتھ مجھے بھیجو"۔ یہ بھی تحریر ہے۔ اسی طرح مثلاً جب اسلامی مملکت توسیع پاتی ہے تو مختلف اضلاع اور صوبوں کے گورنروں کے نام پروانے بھیجے جاتے ہیں کہ فلاں کام انجام دو۔ یا گورنر خود دریافت کرتا ہے کہ اس خاص صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، تو اس کا جواب مدینہ سے بھیجا جاتا ہے۔ غرض سرکاری تحریروں کی کثیر تعداد ہے اور اس وقت ان کی تعداد جو ہم تک پہنچی ہے، کم سے کم چار سو ہے۔ چار سو مکتوبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پائے جا سکے ہیں جن میں کچھ تبلیغی بھی ہیں، مثلاً قیصر و کسریٰ کو دین اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ کچھ حلفی معاہدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب حدیث کا دوسرا پہلو لیجیے یعنی وہ حدیثیں جو سرکاری تحریریں نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے نجی طور پر مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اُمی تھے۔ لکھنا پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا لیکن اچھے مخلص مسلمان ضرور تھے۔ جب مدینہ میں ہوتے تو اکثر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سنتے، اس پر عمل کرتے۔ لیکن ایک واقعہ پیش آیا جو غالباً آغاز کا ہے حدیث کے مدون کرنے کا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ایک صحابی آئے، ان کا نام بیان نہیں ہوا ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ روزانہ جو چیزیں ہمیں بیان کرتے ہیں وہ بے حد دلچسپ، بے حد اہم اور ضروری ہوتی ہیں لیکن میرا حافظہ کمزور ہے، میں انہیں بھول جاتا ہوں، کیا کروں؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ الفاظ فرمائے "استعن بیمینک" (اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو) یعنی لکھ لیا کرو۔ غالباً انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور لکھا ہو

گا۔ ہمیں بعد میں ان کے متعلق تفصیل نہیں ملتی۔ بعد میں ایک دوسرا واقعہ جو غالباً اِسی حکم اور "استعن بیمینك" کے الفاظ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے وہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان تھے۔ غالباً سولہ سترہ سال کی عمر ہوگی۔ بے حد ذہین، بے حد دیندار اور علمی ذوق رکھنے والے تھے۔ ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بعد میں انہوں نے سریانی زبان بھی سیکھی اور وہ عیسائیوں کی دینی کتاب انجیل کو سریانی زبان میں پڑھ بھی سکتے تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت بھی دی تھی کہ اپنے علمی مشاغل جاری رکھیں۔ غرض عبداللہ بن عمرو بن العاص جب یہ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "استعن بیمینك" تو انہوں نے خود لکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنتے اسے فوراً نوٹ کر لیتے تھے۔ دو چار دن غالباً اسی طرح کا واقعہ گزرا ہوگا، پھر ان کے دوستوں نے ان سے کہا "اے عبداللہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، کبھی خوش ہوتے ہیں، کبھی خفا ہوتے ہیں، تم ان کی ہر چیز نوٹ کرتے جا رہے ہو، یہ مناسب نہیں"۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ان کے کہنے پر عمل کرتا اور اسے چھوڑ دیتا، مگر وہ ذہین تھے۔ انہوں نے سوچا کہ بجائے ان سے مشورہ لینے یا ان کی بات ماننے کے کیوں نہ براہِ راست اصل سے رجوع کیا جائے۔ ان کے استفسار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ضرور لکھو۔ اطمینان کے لیے وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت بھی جب آپ خفا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ ہے "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، یہاں سے جو چیز نکلتی ہے (اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا) وہ حق ہی ہوتی ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص پورے اطمینان کے ساتھ حدیثوں کو لکھتے رہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مجموعۂ احادیث میں کوئی دس ہزار حدیثیں تھیں۔ اور اس کے بعد ان کے بیٹے اور ان کے پوتے اس قلمی نسخے کی مدد سے دوسرے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور محدث گزرے ہیں۔

ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابو رافع ایک آزاد شدہ غلام تھے، وہ بھی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کے کہتے ہیں کہ کیا میں آپؐ کی حدیثوں کو لکھ سکتا

ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی اجازت دے دی۔ انہوں نے بھی مجموعہ تیار کیا ہوگا۔ ان سب سے اہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔ بہت کم سن بچے تھے لیکن ایک ایسے بچے جس کے والدین نہایت مخلص مسلمان تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جب مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میری والدہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور بہت ہی فخر کے ساتھ کہنے لگیں ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا بچہ لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہے''۔ پھر کہتی ہیں ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا اگر اسے آپ خادم کے طور پر قبول کرلیں''۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری والدہ کی درخواست کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا چنانچہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک رہا۔ اس دس سال کے عرصہ میں میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان ہی میں رہا۔ صبح شام وہیں رہتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی زندگی کو دیکھتا۔ مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں وہ بھی دیکھتا، مکان کے اندر اپنی ازواجِ مطہرات سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، غرض ہر چیز کا میں مشاہدہ کرسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت، جو ان کو حاصل تھی، بڑے سے بڑے صحابہ، مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی میسر نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی جماعت کی تعداد بڑھی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا تو میرے پاس بہت سے شاگرد آیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کی روایت کے دو الفاظ ہیں: ''اِذ کثروا'' (جب ان کی تعداد زیادہ ہوتی) اور ''اِذا صروا'' (جب وہ زیادہ اصرار کرتے)۔ بہرحال جو بھی صحیح ہو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر میں ایک صندوق میں سے ایک پرانا رجسٹر یا پرانی کتاب نکالتا اور اپنے شاگردوں کو بتاتا اور کہتا کہ یہ وہ چیز ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے متعلق نوٹ کی ہے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وقتاً فوقتاً پیش بھی کیا ہے۔ میری تحریر میں اگر کوئی خامی یا غلطی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح فرما دیتے۔ یہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مجموعہ ہے جو یقیناً کئی ہزار حدیثوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ ایک ہی ایسی حدیث کی کتاب کہی جاسکتی ہے جو صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے، کیونکہ لکھنے کے بعد خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نظر ثانی فرماتے، سن کر اس کی اصلاح فرماتے۔

ایسی اور مثالیں ملتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حدیث کی تدوین ہو رہی تھی۔ بخاری شریف میں دو ہزار سے زیادہ حدیثیں نہیں ہیں اور بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے مجموعۂ احادیث میں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی کثیر حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری طور پر مدون ہو چکی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ سب کی سب ہمارے پاس کتابی صورت میں نہیں پہنچیں۔ بعد کے مؤلفوں نے ان کو تتر بتر کر دیا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں میں سے ایک حدیث کو ایک باب میں، دوسری حدیث کو دوسرے باب میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح ان کا جو اصل مجموعہ تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔

بہر حال یہ بالکل واضح ہے کہ عہد نبوی میں حدیثوں کی جمع و تدوین کا آغاز ہو چکا تھا اور اس میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم کو ایسے صحابہ کی تعداد روز افزوں نظر آتی ہے جو اپنی یادداشتوں کو مدون کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہیں خیال نہیں آیا، اب انہیں احساس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باقی نہ رہے، میں بھی آج نہیں کل مرنے والا ہوں، اگر میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ نہ کر سکا تو یہ سب ضائع ہو جائیں گی۔ کم از کم میں خود اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحریر کر لوں۔ چنانچہ ایسی متعدد کتابوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دوسرے بہت سے صحابہ تھے جنہوں نے کتابیں اور

رسالے لکھ ڈالے۔ ان مجامیع حدیث میں سے بعض کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے: "فیہ علم کثیر" (اس میں بہت علم ہے)۔ ایک اور رسالے کے متعلق لکھا ہے کہ بہت ضخیم تھا۔ یہ جمع حدیث کی ایک صورت ہوئی۔

ایک دوسری صورت تدوینِ حدیث کی یہ ہے کہ لوگ صحابہ سے لکھ کر پوچھتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کو کسی مسئلے کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہے تو وہ کسی بزرگ صحابی کو، اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ جانتے ہوں، ایک خط لکھتا ہے۔ وہ صحابی جواب میں حدیث لکھ بھیجتے ہیں کہ ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ غرض خط و کتابت کے ذریعے سے حدیث کی تدوین اور حدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے اور اس میں ایسی بڑی شخصیتیں بھی ہیں جیسے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کہ ان کے ہاں اکثر خطوط آیا کرتے تھے اور وہ جواب لکھوا بھیجتیں۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے صحابی ہیں، ان کے متعلق صحیح بخاری میں یہ مذکور ہے کہ ان کے پاس ایک خط آیا جس کا انہوں نے جواب لکھ بھیجا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفۂ وقت ان سے لکھ کر دریافت کرتے کہ اس بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں۔

اب میں ایک اور خاص پہلو کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہ خاص بات یہ ہے کہ صحابۂ کرام نے جب حدیثوں کو اس طرح لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور ان کی تعلیم اپنے زمانے کے نوجوان مسلمانوں کو دینے لگے تو ابتداءً صحابہ کے ناموں کے تحت حدیثیں مدون ہوئیں۔ مثلاً میں اپنے شہر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کے پاس جا کر سبق لیتا ہوں اور ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کرتا ہوں۔ دوسرے شہر میں رہنے والے صحابہ سے مجھے استفادہ کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً صحابہ وار حدیثیں جمع ہوتی رہیں۔ صحابہ کے بعد کے دور میں ایک ہی شخص کئی استادوں سے درس لیتا ہے۔ مثلاً ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد سے درس لینے کے بعد اور اس کی روایت کردہ ساری حدیثوں کو قلم بند کرنے کے بعد ایک دوسرے صحابی کے شاگرد کے پاس جاتا ہے اور اس سے اس کی حدیثیں سنتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دو تین نسلوں کے بعد ساری حدیثیں علماء کے علم میں آ

گئیں۔ ایک اور چیز کا ذکر کرتا چلوں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہے اور ان کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے صحابی ہیں جو دیر سے مسلمان ہوئے یعنی سن ۷ ہجری میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چار پانچ سال پہلے اسلام لائے۔ اس کے باوجود ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "دیگر صحابہ مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور فلاں فلاں صحابی سارا دن اپنے کاروبار میں لگے رہتے، اپنی تجارت اور اپنی دکان میں مصروف رہتے۔ میں پیٹ بھر ابن کر مسجد نبوی کے اندر پڑا رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو سننے کا جتنا موقع مجھے ملتا، اتنا بڑے بڑے صحابہ کو بھی نہ ملتا"۔ ان کا حافظہ بھی بڑا اچھا تھا، علمی ذوق بھی تھا، لکھنا بھی آتا تھا۔ انہوں نے بہت سی حدیثیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد حسن بن عمرو بن حمزہ نے (جنہیں حمزی بھی کہتے ہیں) ایک دن غالباً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیرانہ سالی کے زمانے میں، اپنے اُستاد سے کہا کہ "اُستاد! آپ نے فلاں چیز بیان کی تھی"۔ انہیں یاد نہیں تھا مکر گئے۔ "نہیں صاحب میں نے کبھی یہ نہیں کہا ایسی کوئی حدیث مجھے بالکل یاد نہیں"۔ "نہیں استاد! آپ نے ہی ہم سے یہ چیز بیان کی ہے"۔ اس پر ان کا بیان ہے کہ اُستاد نے میرا ہاتھ پکڑا، اپنے گھر کی طرف چل دیئے اور راستے میں یہ کہتے چلے "اگر واقعی میں نے وہ حدیث تم سے بیان کی ہے تو وہ میرے پاس تحریری صورت میں موجود ہونی چاہیے"۔ چنانچہ گھر لائے، اپنی الماری سے ایک جلد نکالی۔ ورق گردانی کی پر نہیں ملی۔ پھر دوسری جلد اور پھر تیسری جلد میں نظر دوڑائی۔ پھر اس کے بعد یک بہ یک خوشی کی حالت میں پکار اٹھے "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہے تو وہ تحریری صورت میں موجود ہونا چاہیے۔ دیکھو، یہ موجود ہے۔ واقعی ٹھیک ہے"۔ ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ارانا کتبا کثیرة من الحدیث" (ہمیں ابو ہریرہ نے حدیث کی بہت سے کتابیں دکھائیں)۔ ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہت سی کتابیں ان کے گھر کے کتب خانے میں دیکھیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل عالمانہ اور بہت دلچسپ تھا۔ ان کے پاس جو شاگرد آتے، سارے شاگردوں کو وہ ایک ہی چیز نہیں پڑھاتے تھے۔ ہر شاگرد کو الگ الگ

حدیثیں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب ہمام بن منبہ ان کے پاس آتے ہیں تو ان کو ایک خصوصی رسالہ سوڈیڑھ سو حدیثوں کا مرتب کر کے دیتے ہیں جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کہلاتا ہے۔ ایک دوسرا شاگرد آتا ہے، اس کے لیے ایک نیا مجموعہ تیار کرتے ہیں جو اس شاگرد کے نام سے منسوب ہوا۔ غرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ ہزاروں حدیثیں انہیں حفظ تھیں اور اپنے متعدد شاگردوں کو انہوں نے جو رسالے لکھ دیئے تھے وہ آج تک محفوظ چلے آ رہے ہیں۔

ایک آخری نکتہ ہے جس پر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے مقرب ترین صحابہ نے حدیث کے متعلق کیا کام کیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، انہوں نے اپنی بقیہ مختصر زندگی کے دو اڑھائی سال کے عرصے میں حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، جس میں پانچ سو حدیثیں تھیں۔ لکھنے کے بعد ان کو وہ اپنی بیٹی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کرتے ہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ شاید بیٹی ہی نے فرمائش کی ہو کہ ابا جان! مجھے حدیث کی کچھ کتابیں لکھ دیجیے، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کا بے پناہ ذوق وشوق تھا۔ بیٹی کی تمنا پر حدیثیں مرتب کیں اور انہیں دے دیں۔ مگر اس رات کو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کے مکان میں لیٹے اور سو نہ سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میرے ابا جان ساری رات کروٹیں بدلتے رہے، مجھے خوف ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ بالآخر صبح کو میں نے جسارت نہیں کی کہ پوچھوں کہ کیا آپ بیمار ہیں؟ خود حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ بیٹی! میں نے تمہیں جو کتاب دی ہے وہ لے آنا۔ میں لائی تو اسے فوراً پانی سے دھو کر مٹا دیا اور کہا یہ حدیثیں وہ ہیں جو میں نے خود سنی ہیں۔ ان کے متعلق مجھے یقین ہے۔ بعض کو میں نے کسی اور صحابی سے سنا تھا۔ مجھے جھجک اور خوف ہے کہ شاید وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسا لفظ منسوب کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہو اور کسی بالمعنی روایت کے تحت آیا ہو۔ مگر اس حدیث کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

حدیث لکھنے کی ممانعت کی ہوتی تو یقیناً حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سے واقف ہوتے اور وہ لکھنے کی جسارت نہ کرتے۔ لکھنے کے بعد آپ کا مٹانا اس بناء پر نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کی تھی بلکہ اس بناء پر تھا کہ انہیں خوف تھا کہ کہیں صحیح حدیث میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی ایسی ہی روایت ملتی ہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے حدیث کو مدون کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ سب کا مشورہ یہی تھا کہ "لکھنا چاہئے"۔ مگر کافی عرصہ بحث مباحثہ اور مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "نہیں لکھنا چاہئے"۔ اور کہا کہ ہم سے پہلے کی اُمتوں نے انبیاء کے اقوال پر عمل کیا، ان کو محفوظ رکھا لیکن خدا جل شانہٗ کی نازل کردہ کتاب کو بھول گئے، اس کی تحریفیں ہونے لگیں۔ میں نہیں چاہتا کہ قرآن کے متعلق بھی یہ سانحہ پیش آئے۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث کی تدوین کا جو ارادہ فرمایا تھا، اس سے یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہوئی ورنہ وہ لکھنے کا ارادہ نہ کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نہ لکھنے کی وجہ ایک دوسری ہے کہ لوگ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک دن فرمایا: "جسے ایک درہم خرچ کرنے کی توفیق ہے وہ کاغذ خرید لائے، میں حدیثیں لکھواتا ہوں، لکھ لے"۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب بازار جا کر ایک درہم میں کاغذ کی ایک گڈی خرید لائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سے چیزیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت نہیں کی ورنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اصحاب کبار حدیث لکھنے یا لکھوانے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔

3

تاریخِ فقہ

اپنے دین کے مآخذوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کسی سے شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح قرآن اور حدیث ہم تک پہنچے ہیں اس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ دنیا کی کسی اور قوم کی اساسی چیزیں اُن تک نہیں پہنچیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں قابل اعتماد مآخذوں سے مسلمانوں نے اپنا قانون کس طرح بنایا اور وہ کس طرح آج تک چلا آ رہا ہے۔ ایک چیز کا آپ سے شروع ہی میں ذکر کرتا ہوں کہ قرآن مجید اپنی معجزانہ حیثیت کے باوجود، کہ وہ خدا کا کلام ہے، اور حدیث اپنی الہامی حیثیت کے باوجود کہ پیغمبر، خدا جل شانہٗ کی طرف سے الہام شدہ باتیں ہیں بیان کرتا ہے اور خدا جل شانہٗ علام الغیوب ہے، صرف قرآن اور حدیث انسان کے لیے ناکافی ہوتے، اگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ نہ بتایا ہوتا کہ قرآن وحدیث کے ناکافی ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ میں آپ کو یاد دلاؤں گا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ وہ ایک مشہور صحابی گزرے ہیں، اور اگر انہیں لمبی عمر ملتی تو صحابہ میں غالباً سب سے بڑے فقیہ ہوتے، بہرحال ابھی وہ نوجوان تھے لیکن اُن کی ذہانت کے باعث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گورنر بنا کر یمن بھیجا۔ آخری وقت باریابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا کہ اے معاذ! تم اپنے فیصلے کس طرح کیا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: ”بکتاب اللہ“ (اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق) جواب صحیح تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ میرا اشارہ اصل میں اُس نکتے کی طرف ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم عام حالات میں تو نہیں لیکن کسی

خاص حالت میں یہ ظاہر نا کافی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کے اندر جو دقیق نکات اور حقائق کے چھپے ہوئے خزانے ہیں، ان پر ہر شخص کی نظر فوراً نہیں پڑ سکتی۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم مطلوبہ چیز اس میں نہ پاؤ تو تم کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: "بسنة رسول اللّٰه" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کیا کروں گا) یہ جواب بھی صحیح تھا مگر حدیث وسنت کی الہامی کیفیت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "فان لم تجد" (اگر تم اس میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو اس پر وہ فرماتے ہیں "اجتہد برائی ولا آل" (یعنی میں اپنی رائے کے مطابق کوشش کروں گا اور استنباط مسائل کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا)۔ اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "اے اللہ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نے جو چیز بیان کی ہے، اس پر میں خوش ہوں" یعنی دعائے برکت دی، اور اس کو قبول کیا اور برقرار رکھا کہ یہی طریقہ ہونا چاہیے۔ انسانی نقطۂ نظر سے اگر قرآن مجید اور حدیث ناکافی ثابت ہوں تو ممکن ہے مسلمانوں کی قوم بے بس ہو جاتی اور اپنی ضرورت پورا نہ کر سکتی، جو قیامت تک چلنے والے دین کے لیے نامناسب ہوتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہمیں بتا دیا کہ اگر قرآن وحدیث نہ ملے تو اجتہاد کرو۔ میں اس کی طرف بعد میں رجوع کروں گا، کہ اجتہاد کے معنی کیا ہیں۔

فقہ ایک عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "جاننا" اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں "قانون"۔ قرآن مجید میں قانون کے متعلق ایک بہت ہی لطیف انداز میں ذکر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا تصور کیا تھا۔ وہ آیت یہ ہے: مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت و فرعها في السماء ٥ (۲۴:۱۴)[اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی ہے اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی رہتی ہے لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں۔] دوسرے الفاظ میں قانون کی بنیاد بیج جیسی چھوٹی سی چیز کی طرح ہے لیکن اس سے جو درخت نکلے گا وہ آسمان تک پھیل جائے گا اور اس کی شاخیں ہر چیز کو ڈھانپ سکیں گی۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اگر ہم قرآن اور حدیث کو جڑیں تصور کریں یا بیج

تصور کریں تو اس جڑ یا بیج سے نکلا ہوا درخت اتنا تناور اور اتنا شاخ در شاخ پھیلا ہوا ہے کہ انسان کی ہر ضرورت کو، اور قیامت تک کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کی جدید ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہے اور ظاہر ہے کہ شاخ در شاخ روزانہ اس درخت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

غرض جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس وقت دنیا کے سامنے ایک قانونی چیلنج تھا کہ اگر تم میں ہمت ہے تو اس رومی قانون سے بہتر قانون بناؤ۔ اس چیلنج کا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور وہ قانون بنایا جو جسٹینین کے قانون سے بھی حقیقتاً بہتر ہے۔ اس میں وہ کمزوری بھی نہیں ہے جو Justinian کے قانون میں تھی بلکہ استحکام، استقامت اور پائیداری بھی ہے۔ اسلامی قانون میں جو وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ رومی قانون میں نہیں ہے۔ مثلاً جسٹینین کے کوڈ میں دینی امور اور عبادات کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جو اسلامی قانون میں ملتی ہیں، وہاں نظر نہیں آتیں۔ اگر کوئی شخص غیر جانبداری سے رومی قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ کرے تو وہ یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اسلامی قانون ہی بہتر ہے۔

اسلامی قانون کس طرح بنا؟ اسلامی قانون رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات پر مشتمل ہے۔ ان احکام کا کچھ حصہ آپ نے املا کرایا اور کہا کہ یہ اللہ کا حکم یعنی قرآن ہے، تم اسے یاد کرو، اسے نمازوں میں پڑھو، کبھی نہ بھلاؤ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور احکامات بھی دیئے۔ اللہ جل شانہٗ کے احکام، اللہ جل شانہٗ کے پیغمبر کے احکام، یہ دونوں چیزیں ایک دن میں مدون نہیں ہوئیں۔ جیسا کہ میں نے آپ سے بیان کیا قرآن مجید کو نازل ہوتے ہوتے تیئس (۲۳) سال لگے۔ یہی حال اور یہی مدت حدیث کی بھی ہے۔ لیکن شروع میں کچھ بھی نہ تھا۔ دل سے لوگ مسلمان ہونے لگے تھے اور اُن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قانون کے معنی ہیں، ''طرزِ عمل'' یا ''اصول کار''، تو ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا، کیونکہ اُس وقت سوائے ''سورہ اقرأ'' کی پہلی پانچ آیتوں کے، کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت نہ کی جائے وہ مباح ہے۔ دوسرے الفاظ میں

مکہ معظمہ ہی کے کافرانہ معاشرے میں بت پرستی کے سوا، جو بھی معاشرتی رسم ورواج تھے اور جو بھی عرف وعادت پائی جاتی تھی، اس پر عمل کرنے کی مسلمانوں کو اجازت تھی۔ آپ کو شاید بُرا لگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداء میں مسلمان شراب بھی پی سکتے تھے، اس لیے کہ شراب ابھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی قانون شروع ہوتا ہے، شہر مکہ کے رسم ورواج سے، اور اس رسم ورواج میں رفتہ رفتہ ترمیم اور تبدیلی ہوتی گئی۔ قرآن وحدیث کے احکام کے مطابق قدیم رسم ورواج میں جو تبدیلی ہوئی وہ ۲۳ سال کے عرصے میں ترجیحی بنیاد پر ہوئی کہ کن چیزوں کو سب سے پہلے منسوخ کیا جائے، ان کے بعد کن چیزوں کو، ان کے بعد کن چیزوں کو، اور کن نئی چیزوں کا اضافہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مکے کے رسم ورواج کے متعلق اسلام کے اعتنائی اور اصلاحی احکام کا سب سے پہلا عنصر، سب سے پہلی چیز بت پرستی کی مخالفت تھی۔ یعنی اللہ جل شانہٗ ایک ہے، بتوں کی پرستش نہ کرو، اللہ جل شانہٗ کا کسی کو شریک نہ بناؤ۔ عقائد کے متعلق ایک چیز اور بھی تھی کہ ہماری زندگی کا تعلق صرف اسی دنیا سے نہیں بلکہ اس کے بعد آخرت کی زندگی بھی ہے۔ مرنے کے بعد ہمیں اپنا حساب کتاب دینے کے لیے اللہ جل شانہٗ دوبارہ زندہ کرے گا اور ہمارے نیک و بد اعمال کے مطابق ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ یہ بالکل ابتدائی چیزیں تھیں۔ اللہ جل شانہٗ پر ایمان اور قیامت پر ایمان۔ ایک چیز اور تھی کہ جب اللہ جل شانہٗ کو ہم ایک مانتے ہیں اور اسے اپنا مالک اور خالق جانتے ہیں تو اس کے متعلق ہمیں اپنے فرائض کس طرح انجام دینے چاہئیں؟ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہمارا محتاج نہیں بلکہ ہم اللہ جل شانہٗ کے محتاج ہیں۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ کی بندگی اور شکر گزاری بھی ہمارا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ نماز اور عقائد یہ دو عنصر تھے جو شروع میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر امور میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا مآخذ قرآن وحدیث تو ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ، بلکہ ان سے کچھ پہلے ہی شہر مکہ کا رسم ورواج بھی اسلامی قانون تھا۔ یہ رسم و رواج ایک عارضی مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث جو باضابطہ مآخذ قانون تھے اُن میں یہ بھی قوت تھی کہ اس غیر اہم یا غیر دوامی عنصر یعنی رسم ورواج کو منسوخ کر سکے۔ اس سے انکار کیے بغیر کہنا یہ پڑتا ہے کہ پہلا مآخذ ملک کا رسم ورواج تھا۔ دوسرا باضابطہ مآخذ

قرآن اور حدیث ہیں۔ لیکن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق مشہور حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ عہد نبوی ہی میں قرآن و حدیث کے علاوہ اجتہاد کو بھی ایک تیسرے مآخذِ قانون کی حیثیت حاصل تھی۔

ہمارے پاس اصول فقہ کی کتابوں میں ایک اور مآخذ بھی ہے جسے اجماع کا نام دیتے ہیں، یعنی کسی بات پر علمائے اُمت کا متفق ہو جانا۔ عہد نبوی میں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے کہ اگر کوئی سوال پیدا ہوتا تو لوگ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرما دیتے جو قطعی اور آخری ہوتا۔ آپس میں مشورہ کر کے کسی پر متفق ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ان مآخذوں کے ساتھ ساتھ عہد نبوی میں ایک اور چیز بھی ملتی ہے جو آئندہ بھی ہمیں کام آ سکتی ہے، اسے ہم "معاہدہ" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اگر کسی دوسرے ملک سے اور کسی دوسری حکومت سے ہم معاہدہ کر لیں اور بعض شرطیں قبول کر لیں، کہ ہم یہ کریں گے اور تم یہ کرو گے، تو جب تک وہ معاہدہ برقرار رہے گا، وہ پابندیاں، یا وہ شرطیں جو ہم نے قبول کی تھیں، ہمارے قانون کا جزو بن جائیں گی اور ہمارے لیے واجب التعمیل رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ معاہداتی پابندیاں اور معاہدے کے ذریعے سے قبول کی ہوئی شرطیں اسلامی قانون ہیں، لیکن غیر تابیدی اور عارضی۔ جب تک معاہدہ برقرار رہے گا، وہ شرطیں ہمارے قانون کا جزو رہیں گی۔

اب ہم اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق ایک اور پہلو کو لیں گے۔ قانون کا کچھ حصہ صراحت کے ساتھ قانون ساز یعنی خدا جل شانہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں گویا انسان کے بنانے کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن اگر کسی وقت قرآن و حدیث میں سکوت ہو، جیسا کہ میں نے ابھی معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے ذریعے سے آپ کو بتایا تو ایسے حالات میں ہم کو اجتہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی سوچ کر، اپنی عقل سلیم کے لحاظ سے ہم کوئی قاعدہ استنباط کریں جو ہمیں مناسب معلوم ہو اور ہماری عقل اور ہمارا ضمیر اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہ کام قانون کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک طبیب ہے، اس کا قانون سازی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک روٹی

پکانے والا نانبائی ہے، اس کو قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں وغیرہ وغیرہ۔ قانون سازی کا کام قانون کے متخصصین ہی کر سکتے ہیں، کوئی اور نہیں۔ لہٰذا ہم دیکھیں گے کہ اسلامی معاشرے میں قانون بنانے کا کام کون کرتے ہیں اور قانون کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام کون کرتے ہیں؟ یہ دو لوگ کرتے ہیں ایک تو حاکم عدالت اور دوسرا جسے ہم مفتی کا نام دیتے ہیں یعنی اس سے پوچھتے ہیں کہ اس بارے میں کیا قانون ہے اور وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلامی قانون یہ ہے یا یہ ہونا چاہئے، لیکن وہ اس کا نفاذ نہیں کرتا۔ حاکمِ عدالت کسی مقدمے میں فریقین کے مابین اس کا نفاذ کرتا ہے۔ لیکن مفتی قانون بناتا ہے، قانون کا نفاذ نہیں کرتا۔ اس فرق کے باوجود دونوں ذیلی قانون سازی کا کام کرتے ہیں۔ اساسی قانون کی حیثیت تو قرآن و حدیث رکھتے ہیں لیکن قرآن و حدیث ساکت ہوں تو اجتہاد کے ذریعے سے، استنباط کے ذریعے سے، یہ لوگ قانون معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے بھی ہیں اور ہم پر نافذ بھی کرتے ہیں۔

عہد نبوی میں اسلامی قانون کی ترقی کے لیے جو اولین ماٰخذ تھے، وہ میں نے بیان کیے اس کے علاوہ دو نئے عناصر کا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک مفتی ہیں اور دوسرے قاضی۔ قاضیوں کو عام طور پر نئی قانون سازی کی ضرورت پیش آتی ہے مقدمات ان کے سامنے آتے ہیں اور ہر مقدمے کے مواقع، حالات اور روداد یں مختلف ہوتی ہیں اور انہیں اُسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسی متعدد مثالیں ہمیں تاریخ میں ملتی ہیں کہ گورنر اور قاضی، جو دور دراز علاقوں میں تھے یا تو خود لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے اور ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان گورنروں اور قاضیوں نے اپنی صوابدید اور اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کر ڈالا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ اگر آپ کو نامناسب معلوم ہوا تو فوراً تصحیح کے احکام صادر فرمادیئے چنانچہ دوسری قسم کی ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ ایک شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے، اس کا خون بہا کس کو دیا جائے؟ پرانے زمانے میں عرب میں رواج تھا کہ خون بہا مقتول کے مرد رشتہ داروں کو دیا جاتا تھا، یعنی بیٹے کو، باپ کو، بھتیجے کو وغیرہ۔ مقتول کی بیوہ کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ضحاک

نامی ایک گورنر کو قاضی کے فیصلے کے متعلق خط بھیجا کہ فلاں شخص کے خون بہا سے اس کی بیوہ کو بھی اُسی تناسب سے حصہ ملنا چاہئے جس تناسب سے وراثت میں اُس کا حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں تھا حدیث میں بھی اُس وقت تک اس کا ذکر نہ تھا، جب تک یہ واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے ذریعے سے یہ نیا اضافہ سامنے آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی قانون کے دو مستقل، غیر تبدیل پذیر مآخذ قرآن و حدیث مکمل ہو جاتے ہیں۔ قانونی نقطۂ نظر سے جب کوئی نئی گتھی پیدا ہوتی تو اُسے سلجھانے کے لیے مسلمان سب سے پہلے قرآن اور پھر حدیث سے رجوع کرتے اور اگر ان دونوں میں کوئی حل نہ ملتا تو پیغمبر کے عطا کردہ عظیم الشان اصول یعنی اجتہاد پر عمل کرتے۔ یہ اصول بعد میں مسلمانوں کے بہت کام آیا، ورنہ اسلامی قانون منجمد ہو جاتا ہے، اور مسلمان اسے ترک کرنے پر مجبور ہوتے۔ اجتہاد کے ذریعے سے ہر نئی چیز کے بارے میں قانون بنانے کا امکان پیدا ہو گیا۔

اسی طرح قاضیوں کے نام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہمیں ایک خط ملتا ہے جس میں یہ حکم تھا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ بھی کر لیا کرو۔ یہ نہیں کہ من مانا فیصلہ کرو اور اُسے نافذ کر دو۔ اگر تمہیں قانون معلوم نہیں ہے تو خود بھی سوچو اور عالم لوگوں سے جو تمہارے آس پاس موجود ہوں، اُن سے بھی مشورہ کرو۔ یہ ایک طرح سے اجتماعی (collective) اجتہاد کی صورت ہو سکتی ہے۔ خود خلفاء کا بھی یہی معمول تھا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق ہمیں کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے آتا، جس کے بارے میں انہیں قرآن و حدیث میں وضاحت کے ساتھ کوئی قانون نہ ملتا تو اجتماع کیا جاتا۔ اذان ہوتی، لوگ دوڑتے ہوئے مسجد کی طرف آتے، مسجد میں خلیفہ ان سے مخاطب ہو کر پوچھتا کہ اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس اجتماع میں ہر شخص رائے دینے کا مجاز تھا: بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، ہر ایک مشاورت میں شریک ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا جسے قانونی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے ایک فاضل صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا۔ یوں سمجھئے کہ کوفہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بہر حال انہیں معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا گیا۔ وہ مؤرخ نہیں تھے، صوفی نہیں تھے، وہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح نامور سپاہی بھی نہیں تھے لیکن قانون میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ وہ وہیں درس دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے درس میں قانونی مباحث اور فقیہانہ عناصر ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ وہاں بھیجے گئے تو انہیں ایک پروانہ یا تقرر نامہ دیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے: ''اے کوفہ کے مسلمانو! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت محترم صحابی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں اپنے آپ پر ایثار کر کے ایسے شخص کو تمہیں دے رہا ہوں۔ اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ ان کی کیا اہمیت ہے''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی وفات تک وہاں شعبۂ قانون کے استاد کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ اس شہر کے باشندوں میں انہیں ایک لائق شاگرد، علقمہ نخعی ملا، جو ان کا بہترین طالب علم تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد یہ شاگرد جامع مسجد کوفہ میں قانون کا معلم بنا اور اُس نے درس جاری رکھا۔ اُس کی وفات ہوئی تو ابراہیم نخعی ایک اور یمنی باشندہ جو کہ کوفہ میں ہی رہتا تھا، وہ ان کا جانشین بنا۔ غرض یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ شہرت پھیل گئی کہ کوفہ کی مسجد میں فقہ کی تعلیم بہت اچھی ہوتی ہے۔ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد حماد بن سلیمان، جو عرب نہیں بلکہ ایرانی تھے، وہ جانشین ہوئے۔ وہ بھی قانون کے ماہر تھے اور فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کا جانشین ایک اور ایرانی شاگرد بنتا ہے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ وہ بہت کمسن تھے، اس کے باوجود سب سے بہتر شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود حماد بن سلیمان کے شاگرد یعنی امام ابو حنیفہ کے جو ہم درس طلباء تھے وہ بھی اصرار کرنے لگے کہ: اے ابو حنیفہ، اُستاد کے بعد تم اس کام کو جاری رکھو۔ ابو حنیفہ بہت ذہین آدمی اور انسانی نفسیات سے آشنا تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ مجھ جیسے نوجوان کو اُستاد کی جگہ لوگ دیکھیں گے تو غالباً پسند نہیں کریں گے۔ جب تک انہیں کوئی تشویق نہ دی جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ واقعی ان کے لیکچر بہت اہم ہیں۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ نے اپنے ساتھیوں سے، جو ان کے رفیقِ درس تھے، کہا کہ میں اس شرط کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ

ایک سال تک تم میرے طالب علموں کی حیثیت سے لیکچروں میں حاضر ہو گے۔ اگر تم اس پر آمادہ ہو تو میں قبول کرتا ہوں۔ وہ بھی مخلص دین دار لوگ تھے۔ انہوں نے کہا، "بہت خوب"۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابو حنیفہ وہ اُستاد ہیں کہ ان کے ہم درس بھی ان کے شاگرد بننے کو تیار ہیں، تو انہیں خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ واقعی یہ قابل شخص ہوگا، جب ہی تو اس کے ہم جماعت اس کے شاگرد بننے پر آمادہ ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی اور دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب کبھی اُن کے پاس کوئی غریب طالب علم آتا تو وہ مالی مدد بھی کیا کرتے۔ اس طرح لوگوں میں ان کی شہرت وعزت اور ان کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ بنی اُمیہ کا آخری دور تھا۔ یہ زمانہ سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا۔ ملک میں دہشت گردی اور خون ریزی عام تھی۔ حکومت کے جبر وتشدد کے خلاف عوام میں بغاوت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ غرض بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ اس دور کے آخری زمانے یعنی ۱۲۰ھ کے ایک واقعے کی طرف اشارہ کروں گا۔ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے زید بن زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکومت کے مظالم کی وجہ سے حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی، اور وہ بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے۔ امام ابوحنیفہ ان کو بہت چاہتے تھے اور وہ دل سے خواہاں تھے کہ بنو اُمیہ کے حکمرانوں کی جگہ زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بن جائیں۔ ایک دن زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن سے کہا کہ بہت سے لوگ مجھے مدد دینے پر آمادہ ہو چکے ہیں، اور میں اب حکومت کے خلاف ایک مسلح بغاوت کرنا چاہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں رقم دی، لیکن ساتھ دینے سے انکار کر دیا، یہ کہتے ہوئے کہ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تمہارے ساتھی، آخر تک ساتھ دیں گے تو میں بھی اس فوج میں شریک ہوتا، یعنی حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لیتا۔ مگر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ میں تمہیں رقم کی حد تک مدد دیتا ہوں۔ چنانچہ وہی پیش آیا جس کا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اندیشہ تھا۔ یعنی ان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں قتل کر دیا۔

زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قانون دانی کی وجہ سے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے محبت تھی۔ زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے فقیہ تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو

حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہی معاملات میں ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ معمر اور پرانے ماہر تھے۔ زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کتاب لکھی اُس کا نام ہے "المجموع فی الفقہ" یہ مشہور کتاب ہے اور اسلامی قانون کی قدیم ترین کتاب ہے، جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں آج کل جس انداز و ترتیب کی ہوتی ہیں، وہ ساری خوبی اس میں موجود ہے۔ آغاز ہوتا ہے "کتاب الطہارۃ" سے جس میں وضو کے احکام اور غسل کے احکام ہیں۔ پھر نماز کے احکام، روزہ وغیرہ، عبادات کا بیان، پھر معاملات، پھر دوسری چیزوں کا بیان۔ یہ طرح زید بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ڈالی اور لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ بعد میں کسی نے اس میں ترمیم نہیں کی۔ یہ دور گزر گیا اور بنی عباس برسر اقتدار آئے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ بنو عباس کے زمانے میں دنیا جنت بن جائے گی مگر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مختلف وجوہ سے لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوئیں، یہاں تفصیل کا موقع نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس دور میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کارنامہ انجام دیا، جو اسلامی قانون کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں امام مالک، امام اوزاعی وغیرہ بڑے بڑے فقیہ موجود تھے۔ انہوں نے کتابیں بھی لکھیں لیکن ان کی کوششیں انفرادی تھیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سوچا کہ انفرادی کوشش کی جگہ، اسلامی قانون کی تدوین اگر اجتماعی طور پر کی جائے، تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بہت سے شاگردوں میں سے چالیس ماہرین قانون منتخب کر کے ایک اکیڈمی قائم کی۔ انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا کہ جو لوگ قانون کے علاوہ دیگر علوم اور معاملات کے ماہر ہوں، انہیں اکیڈمی کا رکن بنایا جائے۔ غرض مختلف صلاحیتوں کے ماہرین کو اس اکیڈمی میں جمع کیا۔ اصول یہ تھا کہ ایک فرضی سوال پیش کیا جائے، کہ اگر یوں ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ اس مسئلے پر بحث ہوتی۔ بعض اوقات ایک سوال پر ایک ایک ماہ تک بحث ہوتی اور بالآخر جب سب لوگ ایک نتیجے پر پہنچ جاتے تو اس اکیڈمی کے سیکرٹری امام ابو یوسف اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسی کچھ تحریریں ہم تک پہنچی ہیں، جن میں "قال"، "قلنا"، "قال"، "قلنا" یعنی سوال و جواب کی صورت میں کسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں اسلامی قانون کی تدوین کی دو کوششیں ہوئیں۔ ایک کوشش حکومت کی طرف سے ہوئی۔ دوسری کوشش پرائیوٹ طور پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے۔ سرکاری کوشش خلیفہ منصور کی تھی۔ اُس نے چاہا کہ اسلامی قانون کو مدون کیا جائے اور ساری اسلامی سلطنت میں اُسے نافذ کیا جائے۔ اس زمانے میں امام مالک کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ خلیفہ نے امام مالک کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم اپنی کتاب فقہ کو مکمل کرلو۔ میں تمہاری فقہ کو حکومت کا قانون بنا کر نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ امام مالک بہت خدا ترس تھے۔ انہوں نے کہا، نہیں، ایک آدمی کی رائے سب پر نافذ نہیں کی جا سکتی۔ لوگوں کو اختلاف کی اجازت ہونی چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا۔ مگر اسلامی قانون کی تدوین کی ضرورت تھی۔ وہ کام امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا اور سالہا سال کی کوشش سے ایک ایسا قانون بنایا جس کے متعلق میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ Justinian Code سے زیادہ مکمل اور زیادہ مناسب ہے۔

اس زمانے میں اور بھی فقیہ پیدا ہوئے اور ان فقہاء کے شاگرد بھی بنتے گئے۔ ایک مختصر جملے پر میں اسے ختم کرتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو فقہاء تھے، ان میں ایک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، جن کے شاگرد کے شاگرد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ دوسرے فقیہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے شاگرد کے شاگرد امام مالک ہیں۔ مالکی مذہب گویا اس صحابی کی راہ سے پہنچتا ہے۔ ایک اور صحابی عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قانون، اسلامی فرقوں میں سے خوارج کا قانون ہے۔ ایک اور صحابی ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ان کے قانونی احکامات ہمارے شیعہ بھائیوں کے پاس، زید بن علی، اثنا عشری، فاطمی وغیرہ، کے ذریعے سے پہنچتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ان علماء کے شاگردوں کے شاگرد، مثلاً امام شافعی ہیں کہ وہ بیک وقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، امام محمد کے شاگرد اور امام مالک کے بھی شاگرد ہیں۔ امام شافعی کے شاگرد ہیں امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ہیں ظاہری مذہب کے پیشوا، داؤد ظاہری۔ غرض شیعہ سُنی کا کوئی فرق نہیں۔ سب ایک دوسرے کے شاگرد ہیں اور خود ایک دوسرے کی مثال ہیں۔



قانون بین الممالک

شہر مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی حیثیت ایک مملکت درمملکت کی تھی لیکن جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں چند ہی ہفتوں کے اندر مسلمانوں نے ایک مملکت قائم کردی جس کا دستور بھی ہم تک پہنچا ہے اور یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ مملکت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ پرانی سلطنتوں سے متعلق ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ وہاں مملکت کس طرح قائم ہوئی۔ شہر مدینہ کے متعلق ہمیں مبینہ طور پر تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ اس شہر میں کئی قبیلے رہتے ہیں جن میں تقریباً ۱۲۰ سال سے آپس میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری ہے اور وہاں کوئی مرکزیت، تنظیم یا حکومت بالکل نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز پیش کی کہ دفاعی و عدالتی اغراض کے لیے اہل مدینہ اپنے آپ کو منظم کر لیں اور اپنے لیے سردار منتخب کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تجویز کو مقامی باشندوں اور قبیلوں نے قبول کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار کیوں بنالیا گیا جب کہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں تھے اور وہاں مسلمان بھی دو طرح کے تھے: مدنی مسلمان یعنی انصار اور مکی مسلمان یعنی مہاجر۔ ساتھ ہی ساتھ مدینے کے مشرک بھی تھے، جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہودی بھی تھے اور کچھ عیسائی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔ اس تنوع اور باہمی اختلاف کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کا سردار منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شہر مدینہ کے قبیلوں میں آپس میں سخت لڑائی جھگڑے تھے، اس لیے یہ عملاً ناممکن تھا کہ ان قبیلوں کے کسی شخص کو سردار منتخب کیا جائے تو دوسرے قبیلوں کے

لوگ اسے قبول کریں۔ ب کو کیا جائے تو الف قبول نہیں کرتا، الف کو کیا جائے تو ج قبول نہیں کرتا۔ ان حالات میں انہیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ کسی اجنبی کو سردار بنالیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار منتخب کرلیا گیا اور سردار اور رعیت کے حقوق و فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ ایک دستاویز میں لکھے گئے۔ یہی دستاویز ہے جسے ہم شہری مملکت مدینہ کا دستور کہہ سکتے ہیں۔ وہ دستور جو ہم تک پہنچا ہے، اس میں اندرونی انتظامات کے متعلق کافی تفصیل سے احکام دیئے گئے ہیں اور مذہبی آزادی کا بھی اس میں تفصیل سے ذکر ہے۔ دفاع کے انتظامات اور جنگ وصلح کے قوانین بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال جب یہ مملکت قائم ہوگئی تو بہت جلد مسلمانوں کو جنگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ۲ ہجری میں میدان بدر میں مکہ والوں کا یعنی شہری مملکت مکہ کا، اس شہری مملکت مدینہ کے مسلمانوں سے مقابلہ ہوا۔ انٹرنیشنل لاء میں چونکہ عموماً دو ہی چیزوں سے بحث ہوتی ہے: حالتِ جنگ اور حالتِ امن وغیروں کے ساتھ ہمارے تعلقات۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت امن کے صرف چند مہینے ملے اور اس کے بعد یہ جنگ پیش آئی۔

انٹرنیشنل لاء کا دوسرا جز یعنی حالت جنگ کے قوانین کیسے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ہمیں اس کی نظیریں ملنے لگتی ہیں۔ یعنی اعلانِ جنگ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ جنگ میں صرف بالغ مردوں کو قتل کیا جائے جو ہتھیار اٹھا کر حملہ کرتے ہیں یا دشمن کے ہر فرد کو، بچے کو بھی، بیمار کو بھی، غلام کو بھی قتل کر سکتے ہیں؟ صرف میدانِ جنگ میں قتل کیا جائے یا میدان جنگ کے باہر بھی اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح اگر مثلاً دشمن کے آدمیوں کو ہم جنگ میں گرفتار کرلیں تو ان جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ کیا انہیں قتل کر دیا جائے؟ یا انہیں مفت رہا کر دیا جائے؟ یا انہیں فدیہ لے کر رہا کیا جائے یا انہیں تبادلۂ اسیران کے طور پر یعنی ہمارا جو قیدی ان کے پاس ہے اس کے معاوضے میں دشمن کا قیدی جو ہمارے پاس ہے رہا کریں وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں تفصیلیں جو قانونِ جنگ سے متعلق ہیں۔ اس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا، کبھی تو قولی حدیث کے ذریعے سے اور کبھی فعلی حدیث کے ذریعے سے۔ بہر حال دونوں طریقوں سے اسلامی قانون بنتا گیا اور انٹرنیشنل لاء کا اسلامی تصور وجود میں

آیا۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا کہ غیر مسلم اجنبی کس مذہب کا ہے، یہودی ہے، بت پرست ہے، لامذہب ہے، اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا، سب کے ساتھ معینہ قواعد برتے جاتے تھے۔ مثلاً اعلانِ جنگ کی ضرورت ہے تو یہ اعلانِ جنگ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا جس کا کوئی مذہب ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو بت پرست ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو کسی چیز کی قائل نہیں ہے وغیرہ۔

غرض اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی اسلامی انٹرنیشنل لاء کے اکثر قواعد کو معین و مدون کرنے کا باعث بنی۔ چنانچہ جب اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو مسلمان مصنف حسب معمول کچھ قرآن کی طرف دیکھتے، قرآنی آیات کا ذکر کرتے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بحث میں لاتے کہ فلاں موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا تھا، لہٰذا وہ اسلامی قانون ہے۔ یہ اسلامی انٹرنیشنل لاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ مکی زندگی کی طرف ہم کم ہی رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ وہ مملکت در مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ چاہے مسلمانوں کو اذیت دہی کے سلسلے میں قتل کیا جاتا رہا، لیکن جنگ نہیں ہوئی تھی۔

اس کے بعد مسلمانوں میں فقہ کی ترقی ہوئی جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جب مسلمان علماء فقہ پر کتابیں لکھنے لگے تو ان کا تصور مغربی تصور کے مقابلے میں بہت وسیع رہا۔ کسی بھی مغربی قانونی کتاب کو آپ اٹھا کر دیکھیں، ان میں عبادات کا ذکر نہیں ہوتا۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو زیادہ جامع بنانے کے لیے پہلے ہی دن اس کو دین و دنیا دونوں کا حامل بنایا اور اس میں صلوٰۃ، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی عبادتوں کا بھی ذکر کیا، تجارتی معاملات اور وراثت کا ذکر بھی کیا اور اس میں انٹرنیشنل لاء کا بھی ذکر کیا۔ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان فقہاء کا تصور یہ رہا کہ انٹرنیشنل لاء کوئی انٹرنیشنل چیز نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی چیز ہے۔ ہماری چیز اس معنی میں کہ اجنبی ممالک سے، حالتِ امن یا حالتِ جنگ میں جس قاعدے پر ہم عمل کریں، وہی ہمارا انٹرنیشنل لاء ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو اوروں کے مشورے اور رضامندی سے مدون کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک

اسلامی انٹرنیشنل لاء، اسلامی انٹرنل لاء کا ایک جزو تھا۔ اسی لیے جب مسلمان فقہاء مجموعۂ قوانین مدون کرنے لگے تو انہوں نے اس میں عبادات، معاملات، ازواج اور وراثت وغیرہ کے ساتھ ساتھ انٹرنیشنل لاء کا ذکر بھی ضروری سمجھا۔ اس کو بظاہر انہوں نے ''سیر'' کا نام دیا۔

اگرچہ انٹرنیشنل لاء کا ذکر سب سے پہلے زید بن علی کی ''کتاب المجموع'' میں آیا ہے، لیکن اس کتاب کا صرف ایک باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب سب سے پہلے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف کی اور یقیناً وہ اپنے معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس بھی دیتے رہے ہوں گے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے خیالات بیان کرتے، پھر اپنے شاگردوں سے بحث بھی کرتے اور پوچھتے کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس بحث کی وجہ سے مختلف پہلو واضح تر ہو جاتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لیکچروں کے اقتباسات کی مدد سے ایک وسیع تر اور جامع کتاب لکھی جا سکتی تھی اور غالباً ایسا ہوا ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ بیس پچیس صفحوں کا رسالہ ہوگا لیکن ان کے شاگردوں میں سے امام محمد شیبانی، امام زفر اور امام ابراہیم الفزاری کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ کم از کم دو کی یعنی امام شیبانی اور امام فزاری کی کتابیں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہیں۔ میرا خیال ہے، ممکن ہے صحیح نہ ہو، کہ جب امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کتاب کا درس دیتے تو اس درس کے نوٹس کتابی صورت میں مدون ہوئے جو بعد میں شاگردوں کی طرف منسوب ہو گئے۔ ان میں سے امام الفزاری کی کتاب ایک مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کو پڑھنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ یہ کوفی خط میں ہے اس لیے بڑی مشکل سے صرف چند صفحے پڑھے اس کے بعد اسے التواء میں ڈال دیا۔ اب تک اس کے فوٹو میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امام محمد شیبانی نے، جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے، اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں، کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے

انہوں نے السیر الصغیر لکھی تو امام اوزاعی نے طنزاً کہا کہ عراق والوں کو اس موضوع پر لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی جب کہ وہ علم حدیث سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر امام شیبانی نے کتاب السیر الکبیر کے نام سے ایک جامع تر کتاب لکھی اور اس کا ایک ایڈیشن تیار کیا جو اتنا بڑا تھا کہ اسے جب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تحفہ دینے کے لیے لے جایا گیا تو گاڑی میں ڈال کر لے جانا پڑا۔ بہرحال کتاب السیر الکبیر ہمارے پاس اب پہنچی ہے، اپنی ایک شرح کی صورت میں۔ اس کو شرح سے الگ کر کے ہم دوبارہ مرتب کر سکتے ہیں لیکن شرح بھی بہت اچھی ہے۔ امام سرخسی نے جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ گزرے ہیں، اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ امام سرخسی کی تالیف ''شرح السیر الکبیر'' کے بارے میں ایک بڑی عبرت ناک بات آپ سے عرض کرتا چلوں۔ امام سرخسی ایک بہت ہی ذہین، حق گو اور بے باک فقیہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کو قید کر دیا گیا تھا۔ میرے استاذ محترم، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ غالباً امام سرخسی کو ایک فتویٰ کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ان کے زمانے میں جو قلعہ خانی حکمران تھے، انہوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لگا دیے تھے۔ حکومت کی آمدنی حکمران کی فضول خرچی کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی تو روز بروز نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ امام سرخسی نے فتویٰ دیا کہ ظالمانہ ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کون سا حکمران ہے جو اس گستاخی کو معاف کر سکتا ہے؟ لیکن وہ بہت بڑے فقیہ تھے اس لیے یہ جرأت نہیں ہوئی کہ انہیں سزائے موت دی جائے بلکہ ان کو ایک اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا۔ اس قید کے چودہ سال کے دوران میں کسی طرح انہیں حکمران یا جیلر صاحب سے یہ اجازت مل گئی کہ ان کے شاگرد کنویں کی منڈیر پر آ کر بیٹھیں اور استاذ کے ارشادات کو نوٹ کرتے رہیں۔ جیلر صاحب کی اس علم دوستی کا میں بھی ممنون ہوں، یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں باآواز بلند املا کرانے کے ذریعے سے امام سرخسی نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی فہرست دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو جاتا ہوں۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ ''کتاب المبسوط'' تیس (۳۰) جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب کنویں کے اندر سے املا کرائی گئی۔ شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے وہ بھی اس قید خانے سے املا کرائی گئی۔ اس طرح شرح الفلاں، فلاں کوئی

درجن بھر کتابیں ہیں، جو اس قید کے زمانے کی تالیف ہیں۔ خدا جل شانہ نے ہمیں آزادی نصیب کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور اس عالم سے سبق لیں جس نے قید خانے کے اندر، جہاں ایک بھی کتاب ان کے پاس نہیں تھی، اپنا علمی کام جاری رکھا اور علم کی وہ خدمت انجام دی کہ بڑے سے بڑے عالم بھی اس کے عشر عشیر پر فخر کریں۔

بہر حال ان تالیفوں میں سے ایک شرح السیر الکبیر ہے۔ یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دوں کہ کیا کوئی شخص کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر جیسی ضخیم کتابیں بغیر مواد سامنے موجود ہوئے اِملا کرا سکتا ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ اُستاذ کے پاس کتابیں نہیں تھیں لیکن شاگردوں کے پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ کوئی کتاب لائیں اور پڑھیں، اُستاد اس کی شرح کرے۔ چنانچہ کتاب المبسوط جو تیس جلدوں میں لکھی گئی ہے وہ اصل میں کتاب الکافی کی شرح ہے۔ سات آٹھ سو صفحوں کا اس کا مخطوطہ میں نے استنبول میں دیکھا ہے۔ اسے غالباً شاگرد پڑھتے تھے۔ شاگردوں کی آواز وہ کنوئیں کے اندر سے سن سکتے تھے اور اندر سے جملہ بہ جملہ اس کی شرح کرتے جاتے تھے اور شاگرد نوٹ کرتے جاتے تھے۔ غرض شرح السیر الکبیر اس طرح تالیف ہوئی اور میری دانست میں آج کی دنیا میں اس موضوع کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم امام ابرہیم الفزاری کے رسالہ کو کتاب قرار دیں تو وہ ابھی تک چھپی نہیں۔ یہ کتاب تقریباً ستر، اسی سال پہلے حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی تھی، لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کا کوئی نیا ایڈیشن نہیں آیا۔ مصر میں اس کے نئے ایڈیشن کی کوشش شروع ہوئی لیکن آدھے سے بھی کم حصہ تک چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، باقی حصہ ابھی تک چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کی اہمیت دیکھ کر یونسکو نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کام میرے سپرد ہوا اور میں نے اس کا ترجمہ مکمل بھی کر دیا، لیکن ابھی تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال اس ترجمہ کے سلسلے میں میرے سامنے حیدر آباد دکن دائرۃ المعارف کا ایڈیشن بھی رہا اور صلاح الدین منجد کا شرح کردہ نیا ایڈیشن بھی میرے سامنے رہا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ناکافی ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے استنبول جانے کا سالہا سال تک موقعہ ملتا رہا اور وہاں تین تین مہینے رہ کر استنبول کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقعہ پاتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب کے ترجمہ میں جہاں کہیں

مجھے کوئی دشواری نظر آئی میں ان مخطوطوں کی طرف رجوع کرتا جو استنبول میں ہیں۔ ایک مخطوطہ مجھے بیروت میں بھی ملا اور ایک پیرس میں بھی ملا جو سب سے قدیم نسخہ ہے اور ان مخطوطوں کی مدد سے میں، ان مقامات کا جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا، صحیح لفظ معلوم کر سکا اور اس طرح یہ ترجمہ مکمل ہوا۔

انٹرنیشنل لاء کی تاریخ میں، جیسا میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، یہ کتاب جو امام محمد شیبانی نے لکھی ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہم عصر لوگوں میں ابراہیم الفزاری جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں بعض اور ممتاز اور مشہور فقہاء نے بھی اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بدقسمتی سے اب یہ کتاب بھی ناپید ہے۔ ان کی کتاب الموطا میں مشکل سے آدھے صفحے کا ایک باب ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں کے لیے کارآمد نہیں۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر، مشہور مؤرخ واقدی نے بھی ''کتاب السیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے لیکن امام شافعی کی ''کتاب الام'' میں ''سیر الواقدی'' کے نام سے ایک بہت طویل اقتباس ہے تقریباً پچاس ساٹھ بڑی تقطیع کے صفحوں کا۔ اس موضوع پر یہ ابتدائی کتابیں تھیں اور آخری کتابیں بھی یہی ہیں یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں، پھر اس کے بعد شاید اس کی ضرورت نہ رہی اور یکا یک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی برقرار رہی اس معنی میں کہ فقہ کی جتنی کتابیں ابتداء سے لے کر آج تک لکھی گئیں، چاہے وہ کسی بھی مذہب اور فرقے کی ہوں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعی یا فاطمی وغیرہ، ان سارے مؤلفوں کی کتابوں میں ''کتاب السیر'' کا باب ضرور ملتا ہے۔ مجھے کچھ مقابلہ کرنے کا موقع ملا تا کہ یہ معلوم کروں کہ شیعہ، سنی اور فاطمی وغیرہ مؤرخوں کے خیالات میں اس موضوع سے متعلق کوئی فرق ہے یا نہیں؟ حیرت ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ہم عقائد کی بنا پر ضرور جھگڑیں گے، سنی شیعوں سے، شیعہ سنیوں سے لیکن ان کی فقہ میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا کہ یہ شیعہ قانون ہے، یہ سنی قانون ہے سبھی اپنے آپ کو اولاً قرآن اور ثانیاً سیرت پر مبنی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں کیا فرق ہوگا۔

تاریخی واقعات میں چاہے ایک کا راوی فلاں اور دوسری کا راوی فلاں دوسرا صحابی ہو لیکن جس چیز کا ذکر ہوگا اس چیز میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گذشتہ تیرہ سو سال سے جو فقہ کی کتابیں چار دانگِ عالم میں لکھی جاتی رہیں اور مختلف مذہبوں کے مؤلفوں کے قلم سے نکلی ہیں، ہم ان میں ہر جگہ ''کتاب السیر'' کو پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو کتاب کتابوں کا اقتباس کہی جاتی ہے یعنی ''فتاوائے عالمگیری'' اُس میں بھی اس پر ایک باب ہے۔ بہت سی دلچسپ معلومات اس میں ملتی ہیں خصوصاً اس بنا پر کہ بعض ایسی کتابیں جن سے عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں استفادہ ممکن تھا، اب نایاب ہو گئی ہیں اور ان کے اقتباسات اس میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو سلسلہ شروح جاری رہا وہ ایک معنی میں شرح اور تمثیل ہو سکتا تھا یعنی اصولوں کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثالیں زیادہ دی جاتی ہیں تفسیریں زیادہ کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مجھے ایسا نظر آیا کہ بعض ممالک کی خصوصیات کی وجہ سے بعض چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو بعض دیگر ممالک کے لوگ بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر امام سرخسی اپنی کتاب کے دوران میں بیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ بیلوں پر بیٹھ کر دشمن سے جنگ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی ملک میں ہوگا جہاں بیل ہوتے ہیں ورنہ اور ملکوں میں مثلاً عرب میں بیلوں کا ذکر نہیں آئے گا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مؤرخ اور مؤلف جن کا تعلق شمالی افریقہ سے ہے اور ان کے تعلقات سپین وغیرہ سے زیادہ قریبی رہے، اکثر زہریلی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں یعنی تیر میں زہر شامل کیا جاتا تھا تاکہ اگر دشمن زخمی ہو تو اس کا زخم اچھا نہ ہو پائے۔ اس کا ذکر مجھے اور مقاموں کی کتابوں میں نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی کتابوں میں سامان کو لانے اور لے جانے کے لیے گاڑیوں کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے مؤلفوں کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان کے زمانے میں جانور پر سامان لاد دیا جاتا تھا۔ گاڑی کے اندر سامان رکھ کر اس کو جانور کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا رواج ان ملکوں میں نہیں تھا۔ غرض بہت سی مخصوص معاشرتی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں۔

یہ چند تفصیلیں انٹرنیشنل لاء کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیں۔

اب کچھ مختصراً اس کے مندرجات کا آپ سے ذکر کروں گا کہ انٹرنیشنل لاء میں کیا چیزیں بیان

ہوتی ہیں۔ آج کل ہمارے زمانے میں "Public International Law" اور "Private International Law" دو مختلف فن اور مختلف علم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے فقہاء کی کتابوں میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ ایک ہی کتاب میں دونوں علوم کے احکام بیان کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دے کر واضح کروں گا کہ ان دونوں علوم میں کیا فرق ہے۔ "Private International Law " میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری سلطنت کی رعیت سے ہوتے ہیں اس کے برخلاف "Public International Law" میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت سے ہوتے ہیں اس کی رعیت سے براہ راست تعلقات نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی فرق ہے میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً شہریت (Nationality) کا قانون کہ ایک شخص کو کس شہریت کا حامل سمجھا جائے گا یا وہ اپنی شہریت کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بدل سکتا ہے تو کن احکام وقواعد کے ذریعے سے؟ اس کا ذکر پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں آئے گا، پبلک انٹرنیشنل لاء میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس طرح اور بھی چیزیں ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان مؤلفوں کے تصور کے مطابق اس پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں مسلمانوں کے اندرونی تعلقات کا ذکر بھی آجاتا ہے، مثلاً شیعہ اور سنی فرقوں کے تعلقات پر قانونی نقطۂ نظر سے بحث ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک حاکمِ عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مرنے والا مذہباً شیعہ ہے اور اس کی بیوی جو وارث بنی ہے، وہ سنی ہے۔ کس قانون کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے؟ اس مسئلے کا تعلق مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء سے ہوگا۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک مسلمان فرد رعیت نے کسی اجنبی ملک کے فرد رعیت سے کاروبار اور تجارت وغیرہ کے سلسلے میں معاہدہ کیا۔ اجنبی ملک کا قانون حکم دیتا ہے کہ جو شخص سرکاری طور بالغ نہ ہو یعنی اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے معاہدہ کرنے کا حق نہیں، اس کا کیا ہوا معاہدہ لغو سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون میں عمر کا تعین نہیں ہے بلکہ جسمانی بلوغ دیکھا جاتا ہے جو ممکن ہے اٹھارہ سال سے کم عمر میں ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی جھگڑے کی وجہ سے مقدمہ عدالت کے سامنے آتا ہے اور وکیل صاحب کہتے ہیں کہ میرے مؤکل نے جب معاہدہ کیا تھا، وہ نابالغ تھا، اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لہٰذا معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے جو مسائل ہوتے ہیں ان کا تعلق پرائیویٹ

انٹرنیشنل لاء سے ہوتا ہے اور اس کے قواعد مقرر ہیں کہ مدعا علیہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے گا، مدعی کے قانون کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برخلاف پبلک انٹرنیشنل لاء میں تین چیزوں: قانون امن، قانون جنگ اور قانون غیر جانبداری سے بحث ہوتی ہے۔ قانون غیر جانبداری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں ہماری حکومت مثلاً غیر جانبدار ہے تو اس کے تعلقات دونوں فریقین جنگ کے ساتھ کس طرح کے ہوں گے یا فریق جنگ کے تعلقات ان ملکوں سے جو جنگ میں شریک نہیں ہیں، کس طرح کے ہوں گے؟ اس کی کچھ تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ قانون امن میں زیادہ تر تین چار چیزوں سے بحث ہوتی ہے۔ Sovereignty یعنی حاکمیت سے، کہ کس مملکت کو خود مختار سمجھا جائے۔ انٹرنیشنل لاء کی جدید کتابوں میں، واقعتاً خود مختار سلطنتوں کے علاوہ باغیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے، مگر اس وقت جب ان کی بغاوت ترقی کر کے ایک حد تک مستحکم ہو جائے، اور وہ کسی علاقہ پر خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس میں Sovereignty کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ کن کن چیزوں میں Sovereignty کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ برٹش انڈیا میں انگریزی دور میں ایک علاقہ تھا جس پر انگریز براہ راست حکومت کرتے تھے۔ لیکن کچھ ریاستیں بھی تھیں جیسے بہاول پور، حیدر آباد اور کشمیر وغیرہ۔ آیا ان ریاستوں کو انٹرنیشنل لاء کی اغراض کے لیے مملکت تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر کیا جائے گا تو اس کے کیا قواعد ہوں گے؟ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ریاست سو فی صد خود مختار نہ ہو لیکن اسے ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو مثلاً اُسے اس کی اجازت ہو کہ اپنا ایک سفیر رکھے، چاہے ساری دنیا کی مملکتوں میں نہیں، صرف ایک ہی سلطنت میں، تو بھی ہم اُسے انٹرنیشنل لاء کا موضوع قرار دیں گے۔ غرض اس طرح کی تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔

ایک دوسرا باب جائیداد (Property) سے متعلق ہے جس میں زیادہ تر فتوحات سے بحث ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسری سلطنت کا کچھ علاقہ فتح کر لیں تو کیا وہ خود بخود ہماری سلطنت کا جزو بن جاتا ہے یا اس کے لیے کوئی رسمی کارروائی درکار ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہوتی ہے؟ اس طرح جائیداد کے فروخت کرنے کے متعلق بھی اس میں بعض دل چسپ چیزیں ملتی ہیں یعنی کبھی تو فتح کے ذریعہ سے کسی علاقہ پر قبضہ ہوتا ہے، کبھی تبادلۂ علاقہ کے ذریعہ سے ایک

علاقہ دوسری سلطنت کو دیا جاتا ہے یا کبھی تحفہ کے طور پر۔ اس کی بہت سی مثالیں اسلامی تاریخ ہند میں ملتی ہیں۔ دو حکمرانوں میں ایک علاقہ کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے، بالآخر اس بات پر مصالحت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹی کا نکاح تمہارے بیٹے سے ہو جائے تو میں جہیز میں وہ علاقہ تمہیں دے دوں گا، ہار مان کر نہیں دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ میں پیش آتی رہی ہیں۔ جائیداد سے متعلق جو قواعد ہیں ان کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا ہے۔

اس میں ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے: jurisdiction یعنی دائرۂ اختیار کے متعلق کہ ایک ملک کے قواعد دوسرے ملک کی رعیت پر چلیں گے یا نہیں، اور چلیں گے تو کس حد تک چلیں گے اور کون سا قانون نافذ ہوگا؟ اس سلسلے میں میں ایک چھوٹی سی چیز آپ کے سامنے عرض کروں۔ امام محمد شیبانی کی ''السیر الکبیر'' میں ایک باب بہت دل چسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غیر ممالک کے لوگ ہمارے ملک میں آئیں اور ہماری عدالت سے رجوع کریں تو ہمارا قاضی ان پر انہی کا قانون نافذ کرے گا۔ فرض کیجیے دو ہندو پاکستان آئے۔ ان میں آپس میں جھگڑا ہوا اور وہ ہماری عدالت سے رجوع کرتے ہیں تو ہندوؤں یا ہندوستان کا قانون ان پر نافذ ہوگا، پاکستانی قانون کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء اور ہمارے قاضیوں کو غیر ملکوں کے قانون سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ غالباً عہد نبوی کی بعض مثالوں سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں چند یہودی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نوجوان جوڑے کو پکڑ کر کہا کہ انہوں نے آپس میں زنا کیا، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ توریت میں زنا کا کیا حکم ہے؟ شروع میں انہوں نے کہا کہ ان کے منہ پر کالک لگائی جائے اور انہیں گدھے پر اس طرح سوار کرایا جائے کہ گدھے کی منہ کی طرف اُن کی پیٹھ ہو، گدھے کی دم کی طرف اُن کا منہ ہو اور انہیں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے گھمایا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو! پھر کہا کہ توریت کا نسخہ لاؤ اور جب نسخہ لایا گیا تو ایک نومسلم یہودی، حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا کہ اس کی یعنی عبداللہ بن سلام کی موجودگی میں پڑھو۔ یہودی نے

پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقام پر انگلی رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ عبداللہ بن سلام نے کہا یہ انگلی ہٹا کر نیچے کی عبارت پڑھو۔ وہاں لکھا تھا کہ زنا کی سزا رجم ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو رجم کرایا۔ یہ نظیر بتاتی ہے کہ اجنبیوں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا، بلکہ انہی کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کئی صفحوں کی طویل بحث میں بتایا ہے کہ اجنبیوں پر اجنبیوں کا قانون ہماری عدالت میں کس انداز سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح انٹرنیشنل لاء کے قانون امن کا تعلق سفارت سے ہے۔ قدیم زمانے میں سفیر مستقل نہیں ہوتے تھے، بلکہ معینہ غرض کے لیے، معینہ مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے اور کام سرانجام دینے کے بعد واپس آجاتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر علی نے History of Saracens میں لکھا ہے کہ مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے دوسو سال پہلے مسلمانوں سے ہوا۔ یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ قانون جنگ میں جن مسائل پر بحث ہوتی ہے، وہ یہ ہیں کہ انسانوں کے متعلق قانون جنگ کیا ہے؟ جائیداد کے متعلق قانون جنگ کیا ہے؟ جنگ کے خاتمے پر جو معاہدہ یا صلح نامہ ہوتا ہے، اس میں کن عناصر و شرائط کا ہونا ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ انٹرنیشنل برتاؤ یعنی ایک مملکت کے دوسری مملکت سے باہمی تعلق میں جن اصول وضوابط پر عمل کیا جاتا ہے، اُس کا مجموعہ انٹرنیشنل لاء کے نام سے موسوم ہے۔

5

عقائد و عبادات

پہلے ایمان اور عقائد کو لیجیے۔ اس کے بہت سے اجزاء اور عناصر ہیں۔ مثلاً توحید الٰہی پر ایمان، اللہ جل شانہٗ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آخرت اور روزِ جزاء پر ایمان، خیر و شر کے منجانب اللہ جل شانہٗ ہونے پر ایمان، وغیرہ۔ اگر ہم ان عقائد کا دیگر مذاہب کے مماثل عقائد سے مقابلہ کریں تو اسلام کی امتیازی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور ایسے نکتے نظر آتے ہیں جن پر واقعی آدمی سر دھننے لگتا ہے۔ عقائد کے سلسلے میں پہلی چیز اللہ جل شانہٗ پر ایمان ہے، بعض ادیان اللہ جل شانہٗ کے ایک ہونے کے قائل ہیں اور اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان بھی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عیسائی بھی، جن کے متعلق عام طور پر یہ تصور ہے کہ وہ تثلیث پر ایمان رکھنے کے باعث ایک نہیں بلکہ تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ اسی طرح پارسی بھی خدا کے ایک ہونے پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بھی بعض فرقے ایسے ہیں جو توحید ربانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ توحید، بہ نسبت اور دینوں کی تعلیم کے، زیادہ معقول، زیادہ سادہ اور زیادہ اچھا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیوں کے ہاں، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، تثلیث کا تصور پایا جاتا ہے۔ لیکن کسی عیسائی سے پوچھو اور اس سے کہو کہ تم تین خداؤں پر ایمان رکھتے ہو تو وہ تم سے لڑ پڑے گا، کہے گا قطعاً نہیں، ہم ایک ہی خدا کو مانتے ہیں: باپ، بیٹا اور روح القدس، یہ تینوں ایک ہی خدا کے مظہر ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف چند اشارے کروں گا کہ ان کا یہ بیان، کہ تثلیث سے مراد توحید ہی ہے، داخلی تضاد کے باعث ہمارے لیے ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں

کوئی سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا پیرس میں پروٹسٹنٹ چرچ (Protestant Church) کی طرف سے مجھے دعوت ملی کہ کسی اسلامی موضوع پر لیکچر دوں اور اس میں اسلامی عقائد کا ذکر کروں۔ وہاں میرا تعارف کراتے ہوئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا ریکٹر (Rector) نے بظاہر مجھ کو سمجھانے کے لیے اصرار اور تکرار سے کہا کہ عیسائی تین خداؤں کو نہیں مانتے ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر شروع کی اور اس کا مجھے جواب دینا ایک لحاظ سے ضروری ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اگر عیسائی واقعی صرف ایک خدا کو مانتے ہیں تو بسروچشم، لیکن عیسائیوں کے ہاں ایک طرف اصرار کے ساتھ یہ ادعاء ہے کہ خدا ایک ہے اور دوسری طرف ان کے ہاں اٰمنت باللّٰہ کی طرح کی جو creed پائی جاتی ہے اس میں ایسی چیزیں بیان ہوتی ہیں جو اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔ غالباً آپ کو علم ہو گا کہ جس طرح مسلمانوں کے ہاں اٰمنت باللّٰہ و ملائکتہ و کتبہ ورسلہ کی طرح ایک (creed) پائی جاتی ہے، اسی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی ہے، جس کے الفاظ کم وبیش اس طرح ہوتے ہیں کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں اور خدا کے اکلوتے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا ہوں جنکو فلاں بادشاہ کے زمانے میں تکلیف دے کر صلیب پر مارا گیا۔ پھر وہ جہنم میں گئے، تین دن وہاں رہے اس کے بعد آسمان پر گئے وہاں خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آئندہ زمانے میں وہ دوبارہ آئیں گے تا کہ زمین پر زندوں اور مردوں کا حساب دیں۔ پھر اس کے بعد کچھ اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں کہ خدا کی عظمت ہے جو ہمیشہ جاری رہے گی، وغیرہ۔ تو میں نے اشارہ کیا کہ اگر یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جانے کے بعد خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں تو کوئی شخص خود اپنے داہنے ہاتھ پر نہیں بیٹھتا۔ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام الگ ہیں اور خدا الگ ہے۔ وہ خدا کے معزز مہمان ہو سکتے ہیں کہ خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ خود خدا نہیں ہو سکتے۔ اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں توحید کا تصور ہونے کے باوجود اس کا اظہار (formulation) اس طرح ہوتا ہے جو قابل قبول نہیں رہتا بلکہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔

غرض توحید کے متعلق مسلمانوں کا تصور اتنا سادہ ہے اور اس قدر پُرزور ہے کہ اس

کی طرح کی کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی۔ ابھی میں نے پارسیوں کے مذہب کا ذکر کیا ہے۔ زرتشت بھی خدا کے ایک ہونے کا قائل ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہاں ثنویت یعنی دو خداؤں کا تصور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ زرتشت کہتا ہے کہ برائی کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف یہ کہ خدا خود بُرا کام نہیں کرتا بلکہ یہ بھی کہ بُرائی کا پیدا کرنے والا بھی خدا نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی ذات کے منافی ہے کہ خدا جیسی پاک ہستی بُرائی کو پیدا کرے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ ایک بُرائی کا خالق ہے اور ایک بھلائی کا خالق ہے۔ اس طرح دو الگ خالق یا خدا ہیں۔ یہ نظریہ تو نیک نیتی پر مبنی ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا احترام کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ خدا بُرائی پیدا نہیں کرتا لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں چونکہ اکثر اوقات بُرائی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور بھلائی کو شکست ہوتی ہے، گویا کہ بھلائی کا خدا مغلوب ہو جاتا ہے اور بُرائی کا خدا غالب آ جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ذات مغلوب ہو جائے، کیا ہم اسے خدا تسلیم کریں گے؟ علمی نقطۂ نظر سے یہ دشواریاں جو اس طرح کے تصورات سے پیدا ہوتی ہیں وہ اسلامی تعلیم توحید میں بالکل نہیں۔ اسلامی عقیدۂ توحید میں زور دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ایک طرف کامل نفی ہے۔ دوسری طرف استثناء کے ذریعے سے محدود بھی کر دیا گیا ہے کہ صرف یہ ہی اللہ جل شانہٗ ہے۔ یہ زور بیان کسی اور مذہب کی تعلیم میں نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ یہودیوں کے ہاں بھی صرف اتنا ہے کہ خدا ایک ہے لیکن یہ زور کہ لا الہ الا اللّٰہ (کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے) وہ امر ہے جو یہود کی تعلیم میں بھی نہیں ملتا۔

اس کے بعد دوسرا عقیدہ فرشتوں سے متعلق ہے۔ اس کو بھی اکثر مذہب قبول کرتے ہیں۔ پارسی، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن وقت کی کمی کے سبب میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔

اس کے بعد عقائد کا ایک اور اہم جزو کتابیں ہیں یعنی میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ اتنا اہم کلمہ ہے کہ اس کے مماثل ہمیں کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی، وہ اس طرح کہ اگر یہاں یہ کہا جاتا: ''میں کتاب پر ایمان لاتا ہوں'' یعنی قرآن مجید پر تو یہ صرف ایک کتاب ہوتی لیکن ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک

کتاب پر نہیں بلکہ خدا جل شانہٗ کی بھیجی ہوئی ساری کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس عقیدے میں ایک طرف فراخ دلی اور وسیع القلبی کا پہلو ہے اور دوسری طرف اسلام کے عالمگیر ہونے اور ابتدا سے لے کر قیامت تک مسلسل جاری رہنے کا تصور بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتابوں پر ایمان لائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنی بھی کتابیں آئی ہیں وہ سب مختلف لوگوں کی نہیں ہماری اپنی کتابیں ہیں۔ مثلاً توریت یہودیوں ہی کی کتاب نہیں ہماری کتاب بھی ہے۔ انجیل عیسائیوں ہی کی کتاب نہیں ہماری کتاب بھی ہے۔ ایسی تعلیم ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر دوسرے مذاہب والے یہ کہتے ہیں کہ سارے مذاہب غلط ہیں، انہیں چھوڑ دو، صرف ہمارا مذہب سچا ہے۔ میں بھی بطور مسلمان کے یہی کہوں گا کہ میرا دین سچا ہے لیکن دوسرے مذاہب بھی اللہ جل شانہٗ کی طرف سے بھیجے ہوئے سچے اور الٰہی مذاہب ہیں، اگرچہ میں ان پرانے مذاہب پر عمل نہیں کرتا۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں خدا جل شانہٗ کا حکم ہیں اور اسی بنا پر ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ مگر اس اصول کی بنا پر کہ آخری احکام واجب التعمیل رہتے ہیں اور اس سے پہلے کے احکام منسوخ سمجھے جاتے ہیں، ہم آخری کتاب پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کی کتابوں پر عمل تو نہیں کرتے لیکن ان کو تسلیم ضرور کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں ایک نفسیاتی فائدہ اور بھی ہے۔ اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹا ہے۔ تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کر لے۔ تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں، تو اسے دکھ ہوگا۔ اور غالباً وہ جوشِ غضب سے اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر میں اس سے یہ کہوں کہ تمہارا دین بھی سچا ہے۔ تمہارے ہاں کی کتاب بھی سچی ہے۔ وہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے اور وہی اللہ جل شانہٗ، جس نے تمہیں یہ کتاب دی، اُس نے ایک آخری کتاب بھی بھیجی ہے۔ تم اس کو پڑھو اور غور کر کے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے، وہ نسبتاً زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور غور کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ اسی طرح اللہ جل شانہٗ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی وہی

فراخ دلی، وسیع القلبی تحمل اور رواداری کا پہلو نظر آتا ہے۔ میں نے مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث پڑھی ہے جو دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اللہ جل شانہٗ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں، جن میں سے ۳۱۵ رسول تھے۔ گویا ۳۱۵ صحیفے نازل ہوئے۔ باقی ایک لاکھ تیئس ہزار چھ سو پچاسی پیغمبروں نے اپنے اپنے پیش رو نبی کی کتاب پر عمل جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے پیغمبر مختلف زمانوں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں آئے ہوں گے۔

پیغمبر کے منصب اور مقصد کے بارے میں بھی مختصراً کچھ عرض کردوں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس بارے میں مختلف مذاہب میں کچھ تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے، بعض مذاہب میں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ انسان کے قالب میں جنم لیتا ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ جل شانہٗ حلول کرجاتا ہے اس کا ہر قول اللہ جل شانہٗ کا قول اور ہر فعل اللہ جل شانہٗ کا فعل ہوتا ہے۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ یہ پیغام اس تک مختلف طریقوں سے پہنچایا جاتا ہے۔ کبھی تو اللہ جل شانہٗ کی آواز براہِ راست اس نبی کے کان تک پہنچتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ خدا جل شانہٗ نے ان سے بات کی، کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغام ایک فرشتہ لاتا ہے اور انسان تک پہنچاتا ہے۔ فرشتے کا لفظ فارسی مصدر ''فرستادن'' کا اسم مفعول ہے یعنی بھیجا ہوا۔ اس سے مراد وہ نوری مخلوق ہے جو اللہ جل شانہٗ کا پیغام انسان تک پہنچاتی ہے۔ ان فرشتوں میں یہ خامی نہیں ہوتی کہ پیغام کا کوئی جزو بھول جائیں یا اس کے پہنچانے میں کوئی غلطی کریں۔ فرشتے خدا جل شانہٗ کا جو پیغام لاتے ہیں، اس کو ہم اصطلاحاً ''وحی'' کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، اور اسلام پر اعتراض کرتے رہے ہیں، وہ وحی پر بھی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک بیماری ہے۔ گزشتہ صدی کا ایک مشہور جرمن مستشرق شپرنگر برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں رہا تھا۔ اس نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی دان بھی تھا۔ چنانچہ اس نے سیرت النبیؐ پر اپنی کتاب میں عربی ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وحی کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری معلوم ہوتی ہے۔ نزول وحی کے متعلق عربی کی کتابوں میں

جو روایات اور بیانات ہیں کہ جب وحی آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو جاتا، آپ پسینے پسینے ہو جاتے اور سکتے کا عالم طاری ہو جاتا، تو شپرنگر کہتا ہے کہ یہ علامات مرگی کی بیماری کی ہیں۔ چونکہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کہہ نہیں سکتا کہ اس کا یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ بہر حال اس نے یہ اعتراض کیا ہے، لیکن اس کے متعلق اگر میں اپنی رائے ظاہر کر سکوں تو وہ یہ ہے کہ شپرنگر نے وحی کے بارے میں اور وحی کی کیفیت سے متعلق ساری معلومات جمع نہیں کیں، بلکہ صرف چند چیزیں لیں اور ان کی اساس پر کہا کہ یہ فلاں بیماری کی علامات ہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح علمی اور دیانتدارانہ طریقہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے وہ حدیثیں جمع کیں جن میں وحی کے نزول کے وقت کا مشاہدہ مختلف صحابیوں سے مروی ہے۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ فلاں دن یکایک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت متغیر ہو گئی۔ وحی نازل ہونے لگی اور اس وقت کی یہ کیفیت چند لمحوں کے بعد دور ہو گئی اور رسول اللہ اپنی نارمل حالت میں آ گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی جو حدیثیں میں نے جمع کیں ان میں ایک بات غیر معمولی ہے، جس کی طرف شپرنگر کے بیان میں کوئی اشارہ تک نہیں، چہ جائیکہ وہ اس کی توجیہ یا اس سے استدلال کی کوشش کرتا۔ وہ یہ ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تو وہ تمام صحابہ جن کو اس کا مشاہدہ ہوا تھا، کہتے ہیں: کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے بوجھل ہو جاتے کہ اس بوجھ کا تحمل تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ چنانچہ اگر آپ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹنی آپ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتی اور مجبور ہو جاتی کہ بیٹھ جائے۔ اگر وہ بیٹھنا نہ چاہتی یا بیٹھ نہ سکتی تو اس کے پاؤں سیدھے ہو جاتے اور اکڑنے لگتے، گویا کہ وہ اب چیخ کر ٹوٹ جائیں گے، اس کی ہڈیاں اور اس کی ٹانگیں چٹخنے لگتیں۔ ایک اور روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی کثرت تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زانو میرے زانو پر تھا۔ آپؐ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اتنا بوجھ محسوس ہوا کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران کی ہڈی چیخ کر ٹوٹ جائے گی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو میں چیخ کر اپنا پاؤں کھینچ لیتا۔ میرے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ میں آپؐ کا بوجھ سہار سکوں۔

بہر حال وحی کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح ہمارے لیے ناممکن ہے کیونکہ وحی ہم میں

ہے کسی پر نہیں آتی۔ وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت جیسی ہوتی تھی اسے ہم، لوگوں کے مشاہدے کے حوالے سے بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ مشاہدے تو وہ ہیں جو میں نے آپ سے بیان کیے۔ کچھ یہ ہے کہ ایک صحابی نے جرأت کر کے ایک مرتبہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر جب وحی نازل ہوتی ہے تو اس وقت آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ وہ جواب بھی دلچسپ ہے۔ اس جواب کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض اوقات میرے کانوں میں گھنٹی بجتی ہے اور بہت سخت تکلیف کی حالت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ اس وقت میں کچھ آوازیں سنتا ہوں۔ وہ آوازیں میرے دماغ میں پتھر کی طرح نقش ہو جاتی ہیں۔ اس حالت کے ختم ہونے کے بعد وہ مجھے ایسی ہی یاد ہوتی ہیں گویا کہ مجھے زبانی یاد تھیں۔ تو لوگوں کے سامنے دہراتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات کوئی شخص نظر آتا ہے، یا تو آدمی کی شکل میں اور اس وقت وہ آدمی کی طرح مجھ سے بولتا ہے۔ بعض اوقات وہ پرندے کی شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک ایسا انسان جس کے پر بھی ہوں اور وہ فضا میں اڑتا رہتا ہے یا کھڑا رہتا ہے اور وہ مجھے مخاطب کر کے کچھ چیزیں پڑھتا ہے اور میں انہیں سنتا ہوں۔ میں بھول نہیں سکتا۔ وہ میرے حافظے میں نقش ہو جاتی ہیں، اور پھر میں انہیں دہراتا ہوں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے۔ یہ الفاظ کافی اہم ہیں کہ اتنی شدید تکلیف ہوتی ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس کرتے تھے۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ آپؐ کا وزن بھی اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ کسی اونٹنی کو بھی اس کا تحمل ممکن نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود محسوس کرتے تھے کہ یہ غیر معمولی حالت ہے۔ یہ ہے وحی کی کیفیت اور اس سے زیادہ ہم کوئی اور چیز بیان نہیں کر سکتے۔ یہ خصوصی کیفیت ہے جو اللہ جل شانہٗ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتی ہے اور ہم اس کو عام انسانوں کی کیفیتوں اور ڈاکٹروں کے مرض کی تشخیص سے حل نہیں کر سکتے۔

اسلامی عقائد: آمنت باللّٰہ وملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ کے بعد والیوم الآخر ہے، یعنی آخرت کا ذکر آتا ہے۔ عقائد کے نقطۂ نظر سے آخرت پر ایمان تو ہمیں لانا ہی ہے لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات بڑی اہم ہے کہ ہر انسان سے اس کے اعمال

کے متعلق حساب و کتاب لیا جائے گا اور ان کے نیک و بد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔ آخرت اور یوم حساب پر ایمان، جزاء کی اُمید، اور سزا کا خوف، یہ ایسے تصورات ہیں جو انسان کو اچھے کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور بُری باتوں سے روکتے اور بچاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز میرے ذہن میں آتی ہے۔ ہم سب اللہ جل شانہٗ کے بندے ہیں۔ وہ ہمارا آقا ہے۔ اگر وہ ہمیں کچھ حکم دے تو مالک ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر حکم دے سکتا ہے اور ہمارا فریضہ ہوگا کہ ہم اسے انجام دیں۔ اگر ایک ملازم اس سے بھی بڑھ کر ایک غلام اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرے تو اس کو کسی جزاء کے پانے کا، کسی شاباشی کے حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی غلام اپنے آقا کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا تو وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی اصولاً کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف دوزخ کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ جل شانہٗ کے بندے ہیں، اللہ جل شانہٗ کی اطاعت نہ کریں تو اللہ جل شانہٗ ہمیں سزا دے سکتا ہے۔ اسے اس کا کامل حق ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے احکام کی صرف تعمیل کریں تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اللہ جل شانہٗ ہمیں جنت دے۔ اس کے باوجود یہ اللہ جل شانہٗ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ وہ ہمیں جنت بھی دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تشویق بھی ہے اور تہدید و تنبیہ بھی ہے۔

اب میں جنت اور دوزخ کے متعلق چند الفاظ آپ سے بیان کروں گا۔ ہندوؤں کا تصور اور بدھ مت والوں کا تصور اس کے بارے میں کچھ اور ہی ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا وجود ازل سے ابد تک صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک بلبلے کا وجود، جو دریا میں پیدا ہوتے ہی آن کی آن میں ٹوٹ کر دریا کے پانی میں غائب ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہستی بھی اس کائنات میں محض اس بلبلے کی طرح ہے۔ اس لیے ان کا تصورِ تناسخ یہ ہے کہ اگر آدمی اچھا کام کرے تو اسے جزا ملے گی، میں ابھی بیان کروں گا کہ کیا ملے گی، اور اگر بُرا کام کرے گا تو اُسے سزا ملے گی۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ ہے کہ وہ سزا اس بُرائی کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ اگر اس نے تھوڑی بُرائی کی ہے، مثلاً وہ بادشاہ ہے تو وہ مرنے کے بعد غلام کے طور پر پیدا ہوگا۔ اگر

اس نے اس سے بھی زیادہ بُرائی کی ہے تو مرنے کے بعد کتا یا بلی بن جائے گا۔ اُس کی بُرائی اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو وہ درخت بنے گا۔ اس سے بھی بڑی بُرائی ہے تو وہ پتھر بن جائے گا۔ جمادات، نباتات، حیوانات یہ سب ارتقائی مدارج ہیں۔ اس لحاظ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو پتھر بننے کی سزا دی گئی ہے تو اس پتھر کو ارتقاء کے ذریعے سے صدیوں کی مدت کے بعد درخت بننے کا موقع ملے گا۔ اگر درخت اپنی مدت حیات میں مفید کام کرتا رہے تو اس درخت کو صدیوں بعد جانور بننے کا موقع ملے گا۔ وہ جانور اگر اچھے کام کرتا رہے تو اسے ادنیٰ ترین قسم کا انسان یعنی شودر بننے کا موقع ملے گا۔ اگر شودر کی حیثیت سے انسان اچھے کام کرتا رہے اور اپنے فرائض انجام دیتا رہے تو مرنے کے بعد وہ ویش بنے گا۔ اس کے بعد کھتری بنے گا، اس کے بعد برہمن بنے گا۔ اگر برہمن کی حیثیت سے اپنی زندگی اچھی طرح گزاری تو مرنے کے بعد دوبارہ خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔ جس طرح کہ وہ بلبلہ دوبارہ پانی میں گرا اور پانی بن گیا، تو برہمن دوبارہ خدا بن جائے گا۔ اگر برہمن نے زندگی بُرائی کے ساتھ گزاری تو اسے وہی سزا ملے گی اور دوبارہ اس کو جانور اور درخت اور پتھر وغیرہ بننا پڑے گا، اور اس طرح ہزاروں لاکھوں سال گزر جائیں گے۔ یہ ان کا آواگون یا تناسخ کا تصور ہے۔ مسلمانوں کا تصور اس بارے میں جنت اور دوزخ کا ہے۔ خود قرآن میں اور حدیث میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھانے کو ملے گا۔ وہاں شراب کی، شہد کی اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔ تو اس کا مفہوم یہ لینا پڑے گا کہ ہمارے عرفان و شعور کے مطابق، ہمارے ذہن میں آسائش اور لذت کا جو تصور ہے اس تصور کے مطابق بتایا گیا ہے کہ جنت میں یہ نعمتیں ہوں گی۔ ورنہ قرآن مجید میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جن کا تمہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ جب ہمیں ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، جیسے کہ حدیث میں صاف الفاظ ہیں کہ جنت میں وہ چیزیں ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھا، نہ کسی کان نے کبھی سنا، نہ کسی کے دل و دماغ میں ان کا خیال تک بھی گزرا، پھر اسے ہم کیسے سمجھائیں گے۔ انسانی زندگی میں انسان چاہتا ہے کہ اس کو خوبصورت بیوی ملے۔ اچھی غذائیں ملیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن مجید میں سمجھانے کے لیے ایسی ہی چیزوں کا ذکر آیا ہے جو انسان کو فطرتاً مرغوب ہیں۔ بہر حال حور و قصور کی

حقیقت تو اللہ جل شانہٗ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں نہ بھی ہوں تو بھی کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ قرآن خود کہتا ہے کہ تمہیں وہاں پر تمہاری خواہش کی ہر چیز ملے گی، اور حدیث میں صراحت ہے کہ وہاں جو چیزیں ہیں ان کا تمہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا، تو دونوں احکامات باقی رہتے ہیں۔

عقائد کے سلسلے میں آخری چیز، کہ بُرائی اور بھلائی دونوں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہیں، بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں ایک طرف تو پارسیوں کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نیکی کا خدا الگ ہے اور بُرائی کا خدا الگ ہے۔ اس نظریے میں منطقی اعتبار سے یہ خامی ہے کہ اگر نیکی کسی وقت مغلوب ہو جائے تو دوسرے معنوں میں اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ نیکی کا خدا مغلوب ہو گیا اور اس کے باوجود ہم اسے خدا مانتے رہیں، اسے عقل قبول نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف اسلام کہتا ہے کہ "والقدر خیرہ وشرہ من اللّٰہ تعالیٰ" یعنی خیر و شر دونوں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سزا کیوں دی جاتی ہے؟ جبر و قدر کا مسئلہ بھی بڑا پیچیدہ ہے۔ اس پر دنیا کے ہر مذہب میں صدیوں سے بحث ہوتی آ رہی ہے اور اب تک اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ اگر ہم ایک جواب دیں کہ انسان مجبور ہے اور وہی کرتا ہے جو خدا جل شانہٗ نے مقرر کر رکھا ہے تو اس پر کچھ اعتراض ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم یہ کہیں کہ انسان قادر ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے تو اس پر کچھ اور اعتراض ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوہری مشکل (dilemma) ہے، یعنی دونوں صورتیں قابل اعتراض ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی سے تاکید کی کہ اس بحث میں نہ پڑو۔ تم سے پہلے کی قومیں اس مسئلے پر بحث کرنے لگیں اور گمراہ ہو گئیں۔ ان حالات میں اصولاً مجھے مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے، لیکن میں تھوڑی سی توضیح کرتا ہوں۔ جیسا میں نے آپ سے کہا کہ اگر انسان کو مجبور قرار دیا جائے یعنی وہ ایک مشین کی طرح وہی کام کرتا ہے جو خدا جل شانہٗ نے مقرر کر رکھا ہے، تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم بُرائی کریں تو سزا کیوں دی جاتی ہے؟ یہ اعتراض اور یہ سوال ٹھیک ہے۔ لیکن یہی بھلا مانس انسان یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر میں بھلائی کرتا ہوں تو وہ بھی خود بخود بلا ارادہ ہو گی۔ پھر مجھے جنت کا کیا حق ہے؟ اس پر وہ کبھی دھیان نہیں کرتا۔

دونوں چیزیں بے اختیار اور بلا ارادہ ہی ہوں گی، بھلائی کا کام بھی بُرائی کا کام بھی۔ اس کے برخلاف اگر ہم یہ کہیں کہ خدا جل شانہٗ کی طرف سے وہ چیزیں ہمارے ذہن میں نہیں آتیں بلکہ ہم خود طے کرتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو معلوم نہیں کہ انسان کیا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ عالم الغیب ہے۔ ساری اگلی اور پچھلی چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے سے جانتا ہے۔ اگر ہم انسان کو قادر قرار دے دیں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کو علم نہیں ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور اللہ جل شانہٗ ہمارے اس کام کو، جو ہم کرنے والے ہیں، خود پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ ہم پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ دوہری مشکل (dilemma) جس کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بحث میں نہ پڑو۔ حقیقت میں یہ دونوں مختلف سطحوں کی مختلف درجات کی چیزیں ہیں۔ انسان کی ذمے داری اور جواب دہی، مذہبی تصور ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی قدرت، اللہ جل شانہٗ کا مقرر کرنا، یہ آسمانی تصور ہے۔ ان دونوں میں کسی طرح کے تصادم کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ گویا میں اپنے ہر کام کا ذمہ دار ہوں، اور ہر چیز خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں ہے۔ یہ اس تصور کا خلاصہ ہے۔

ایک آخری چیز پر میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ ایک دن یکایک میرے ذہن میں ایک انکشاف سا ہوا اور یہ عجیب وغریب انکشاف تھا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے انسان کو اپنا خلیفہ کیوں بنایا؟ ہم میں دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کوئی خاص فوقیت نہیں، کیا یہ استبدادی فیصلہ ہے؟ یا انتخاب ہوا ہے؟ میری توجہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف مبذول ہوئی: انا عرضنا الا مانة علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً (۳۳:۷۲) [ہم نے ایک امانت پیش کی، آسمان اور آسمانوں پر رہنے والوں کے سامنے، زمین اور زمین پر رہنے والوں کے سامنے۔ حتیٰ کہ پہاڑوں کے سامنے بھی۔ مگر کسی کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس امانت کو قبول کرے سبھی ڈرے اور سبھوں نے انکار کر دیا اور قبول کیا تو انسان نے، جو ظالم بھی ہے اور جاہل بھی ہے] میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جب خلیفہٗ

اللہ کا عہدہ پیش کیا گیا تو ہر مخلوق نے چاہا ہوگا کہ وہ عہدہ مجھے مل جائے۔ سب نے پوچھا ہوگا کہ کس شرط پر یہ عہدہ مل سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تقدیر تو میں کروں گا اور ذمہ دار تم ہو گے۔ سب نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تقدیر تو کرے اور ذمہ دار ہم ہوں۔ سب ڈرے اور کسی نے قبول نہ کیا سوائے انسان کے، جو ایک ظالم اور جاہل مخلوق ہے، کہا یا رب میں قبول کرتا ہوں۔ اس کا یہ بھولا پن اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ کہا کہ اچھا میں تجھے خلیفہ بناتا ہوں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ انسان اتنا جاہل نہیں تھا جتنا ہمیں نظر آتا ہے۔ انسان نے غالباً یہ سوچا کہ خدا ظالم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ مجھے اس چیز کی سزا نہیں دے گا جو میں نے نہیں کی۔ لاؤ، عہدہ قبول کر ہی لیں، پھر دیکھا جائے گا۔ وہ غفور و رحیم ہے۔ تقدیر و تدبیر کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ جب انسان نے یہ قبول کیا کہ تقدیر اللہ جل شانہٗ کرے اور ذمہ دار میں رہوں تو اب اُسے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ مجھے سزا کیوں دی جاتی ہے۔

یہ عقائد کے متعلق مختصر سی گفتگو تھی۔ اب میں مختصراً عبادات کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔ اسلام اپنے محدود معنی میں اطاعت کرنے اور اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ جب جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا۔ نماز کا مقابلہ اگر ہم دوسری قوموں اور دوسری ملتوں کی عبادت سے کریں تو ہمیں اسلام کی بڑی فوقیت نظر آتی ہے۔ یہودیوں کی عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی معبد کو جاتے ہیں اور ان کا امام توریت کھول کر گھنٹے دو گھنٹے تک مسلسل تلاوت کرتا ہے اور سارے لوگ مرد اور عورتیں ادب کے ساتھ سنتے ہیں۔ پھر تلاوت ختم ہو جاتی ہے۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کی طرح رکوع وسجدہ، قیام وقعود وغیرہ نہیں ہوتا۔ پارسیوں کے ہاں آپ نے سنا ہوگا، آتش پرستی ہوتی ہے۔ اس کی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا، صرف اشارۃً آپ سے ذکر کرتا ہوں۔ اس کی تھوڑی سی توجیہ بعد میں کروں گا۔ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک طرح سے صلیب کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ بظاہر یہودی اور پارسی اور عیسائی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ صاحب عقل

وفہم بھی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کیا بات ہے کہ وہ ایسی جاہلانہ حرکات کرتے ہیں کہ آگ کی پوجا کرتے ہیں، لکڑی کی پوجا کرتے ہیں اور گائے (جانور) کی پرستش کرتے ہیں۔ ایک دن میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ غالباً یہ پوجا رمزیہ انداز رکھتی ہے۔ مثلاً جس زمانے میں پارسی مذہب وجود میں آیا، اس وقت انسان نے آگ کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ آگ سے فائدہ اٹھانا اور اس کی ہلاکتوں سے بچنا، انسان نے سیکھ لیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا کہ یہ اللہ جل شانہٗ کی قدرت کے مظاہر اور شواہد ہیں۔ سب سے طاقتور چیز آگ ہے۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جو بھی اس کے قریب جاتا ہے وہ جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پارسی مذہب کے بانیوں نے کہا کہ ہم خدا کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بہترین مظہر یعنی آگ کی پرستش کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں جب آریہ آئے تو انہوں نے اپنی زرعی معیشت میں گائے کو سب سے زیادہ مفید اور منفعت بخش پایا، تو خدا کی اس سب سے بڑی نعمت کے گن گانے لگے، اور خدا جل شانہٗ کی ایک علامت کے طور پر اس کا احترام بھی کرنے لگے۔ اللہ جل شانہٗ ایک منعم ہے، لہٰذا اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ اس کی سب سے اچھی نعمت کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں۔ یوں بالواسطہ وہ اللہ جل شانہٗ کا ادب کرنا چاہتے ہیں، اللہ جل شانہٗ کی تعریف کرنا چاہتے ہیں-- یہودیوں کے ہاں اپنی عبادت میں صرف توریت کی تلاوت کی جاتی ہے۔ جس کو وہ خدا جل شانہٗ کا کلام کہتے ہیں۔ خدا جل شانہٗ کے کلام کی تلاوت اُن کے نزدیک عبادت ہے۔ کلام اللہ جل شانہٗ کی تلاوت کے معنی ہیں کہ ہم اللہ جل شانہٗ کے احکام سے واقفیت حاصل کریں، اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق اس تک پہنچیں۔ یہ رمز توریت کی تلاوت میں یہودیوں کے نزدیک مضمر ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک طرف تو واحدانیت کا تصور بھی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ان لوگوں کو اس پر اصرار بھی ہے۔ ان کے ہاں عبادت کے مراسم میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ ایک طرف تو وہ یہودیوں ہی کی طرح سے انجیل کے اقتباسات کو عبادت کے وقت تلاوت کرتے ہیں دوسری طرف وہ صلیب کا بھی احترام کرتے ہیں۔ تیسری چیز ہے جسے کمیونین کا نام دیا جاتا ہے۔ کمیونین، پروٹسٹنٹ لوگوں کے ہاں نہیں ہے زیادہ تر کیتھولک اور آرتھوڈکس فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز یعنی عبادت کی تکمیل ہونے کے بعد ان کا

پادری انہیں روٹی کا ایک ٹکڑا دیتا ہے جسے وہ کھاتے ہیں اور شراب کے چند گھونٹ دیتا ہے جسے وہ پیتے ہیں اور تصور یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی ذات میں مدغم ہو گئے ہیں، کیوں؟ انجیل میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب رومیوں نے گرفتار کیا اور انہیں سولی پر چڑھایا جانے والا تھا تو آخری رات کو جب وہ اپنے حواریوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے تو انہوں نے یکا یک ایک روٹی اٹھائی اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا کر کہا کہ اسے کھاؤ یہ میرا وجود ہے۔ پھر ایک گلاس اُٹھایا اور کہا کہ اسے پیو یہ میرا خون ہے۔ انجیل کے اس بیان کردہ واقعہ کو عیسائیوں کے ہاں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم روٹی کھائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم بن جاتے ہیں اور شراب پئیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خون بن جاتے ہیں۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اس لیے روٹی کھانے اور شراب پینے سے ہم خدا کے اندر مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ تصور بھی رمز کی حد تک قابل قبول ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اسلام میں عبادت کا کیا طریقہ ہے۔ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جس میں اللہ جل شانہٗ کی حمد وثنا ہے یعنی گویا ہم براہ راست حمد وثنا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ضرورت نہیں کہ کسی رمز کے ذریعے سے اللہ جل شانہٗ کی حمد کریں۔ دونوں چیزیں حمد کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اور اسلام نے چاہا کہ اللہ جل شانہٗ جو مجرد ذات ہے اس کی تعریف بھی مجرد ہی ہونی چاہیے۔ بہرحال اسلام نے بتایا کہ اللہ جل شانہٗ کی تعریف خود اللہ جل شانہٗ کے بتائے ہوئے الفاظ کے ذریعے سے کریں۔ یہودیوں کے ہاں جو تصور ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا کلام ہمارا راہنما ہے ہم اس کی تلاوت کریں۔ اپنی نماز میں ہم بھی قرآن مجید یا کلام اللہ ہی پڑھتے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں کمیونین کا جو تصور ہے کہ ہم خدا کی ذات میں ضم ہو گئے، وہ مسلمانوں کے ہاں ایک اور صورت سے آتا ہے یعنی ہمارے ہاں تشہد ہے۔ نماز کے اختتام کے وقت ہم اپنے آپ کو اس بات کے قابل تصور کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ جل شانہٗ کے حضور میں باریابی ہو رہی ہے۔ جب کسی چھوٹے کو بڑے کے حضور میں باریابی کا موقع ملتا ہے تو چھوٹا سلام کرتا ہے اور بڑا مہربانی سے جواب دیتا ہے۔ التحیات کے معنی ہیں آداب عرض کرنا۔ یہ چیز معراج کے واقعے سے لی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے

موقعے پر اللہ جل شانہٗ کے حضور میں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات کیا۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے مہربانی سے جواب دیا: ''السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ وبرکاتہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کا بھی خیال فرمایا اور فوراً ہی کہا: ''السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین'' ہم سب کو بھی، ان برکات میں جو اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی تھیں، شامل کرلیا۔ اسے ہم نے رمز کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اللہ کی ذات میں مدغم ہو جانے کا تصور ہمارے نزدیک نا قابل قبول ہے۔ اس کی جگہ ہم اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اس کے حضور میں حاضر ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ وہ ہمارے سلام کو قبول کرتا ہے اور ہم پر رحمت و برکت نازل کرتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبادت ایک طرح سے سارے مذاہب عالم کے طریق ہائے عبادت کا خلاصہ ہے بلکہ ساری کائنات کے طریق ہائے عبادت کا خلاصہ بھی اس کے اندر موجود ہے۔ کائنات میں تین طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں: نباتات، جمادات، حیوانات۔ جمادات کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی حرکت نہیں کرتے۔ بلکہ ساکت رہتے ہیں۔ نماز میں ہم پہلے بے حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں، گویا جمادات کی عبادت کا طریقہ ہماری عبادت میں شامل ہو گیا۔ حیوانات ہمیشہ رکوع کی حالت میں رہتے ہیں یہ ان کی عبادت ہے۔ ہماری نماز میں رکوع کی حالت اسی کے مماثل ہے۔ درخت اپنی جڑوں کی طرف جھکے ہوئے سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔ لہٰذا اسلامی عبادت میں جمادات کی عبادت بھی شامل ہے، نباتات کی عبادت بھی شامل ہے اور حیوانات کی عبادت بھی۔ اور اس میں کچھ انسانی خصوصیات بھی جیسے التحیات۔ مختصراً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبادت ساری کائنات کی عبادت سے برتر و بہتر ہے کہ وہ سب کا مجموعہ ہے۔

اب میں روزے کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ حال ہی میں پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے یورپین غیر مسلم غالباً کیتھولک ڈاکٹر ''جوفرے'' نے لکھا ہے۔ اس کا عنوان ''روزہ'' ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے بعض عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ روزہ طبی نقطۂ نظر سے بھی انسانوں کے لیے مفید ہے۔ وہ ایک دلچسپ انکشاف کرتا ہے کہ روزہ انسانوں میں ہی نہیں بلکہ کائنات کی اور چیزوں مثلاً، درختوں اور

حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تاہم آپ کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا ہوں۔ جہاں تک حیوانوں کا تعلق ہے اُن کے متعلق اس نے ذکر کیا ہے کہ ایسے وحشی جانور جو بالکل فطری حالت میں رہتے ہیں، جس زمانے میں برف باری ہوتی ہے، انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی اور بعض اوقات اس کا سلسلہ کئی کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ جنوبی علاقوں میں برفباری کم ہوتی ہے وہاں ہفتے ہفتے تک زمین پر برف پڑی رہتی ہے لیکن شمال کی طرف جتنا آپ آگے جائیں برفباری شدید ہوتی جائے گی۔ وہاں برف کی وجہ سے مہینوں تک زمین نظر نہیں آتی۔ اس صورت میں ایسے جانور جو اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں، انہیں کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی نہ پینے کو، اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔ اُس نے لکھا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جانور، پرندے، سانپ وغیرہ سب پہاڑوں کی غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں اس کو HIBERNATION کہتے ہیں۔ یعنی سردی کے زمانے کی نیند۔ اس کا سلسلہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ یہ نہ کھانے اور نہ پینے کی حالت، یعنی روزے کے باعث ان جانوروں میں نئے سرے سے جوانی آ جاتی ہے۔ جب سردیوں کا زمانہ ختم ہوتا ہے اور بہار کا موسم آنے لگتا ہے تو ایسے پرندے، جو ان غاروں میں ہیں، اُن کے پرانے پر جھڑ جاتے ہیں اور نئے پر نکل آتے ہیں۔ جن کی طراوت اور رنگوں کی خوشنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سانپ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ اس کی جھلی جھڑ جاتی ہے اور اس کو ایک نئی کھال یا نیا چمڑا ملتا ہے جو چمک دمک میں پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ان جانوروں میں واقعی ایک جوانی سی آ جاتی ہے۔ انہیں اپنی تعداد بڑھانے کے لیے نر کو مادہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں ان روزہ رکھے ہوئے جانوروں میں پہلے زیادہ قوت اور پہلے سے زیادہ جوانی آ جاتی ہے۔ اسی طرح درختوں کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ سردیوں، خصوصاً برفباری کے زمانے میں، درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں انہیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا۔ ان کی کسی قسم کی آبپاشی نہیں ہوتی۔ گویا وہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزے کی مدت ہفتوں اور مہینوں تک چلتی ہے۔ یہ روزہ ختم ہونے پر ان درختوں کو ایک نئی جوانی حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جو نئے

کونپلیں ان میں پھوٹتی ہیں اور نئے پھول اور پھل لگتے ہیں وہ ان درختوں کی نئی جوانی، نئے حسن اور نئی قوت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر جوفرے کا کہنا ہے کہ انسانوں کو بھی ہر سال روزے رکھنے چاہئیں۔ ان کی صحت کے لیے بہتر ہوگا۔ یہ ان کو نئی توانائی اور نئی جوانی عطا کریں گے۔ اس نے بہت سی لمبی بحثیں کی ہیں۔ آج کل بہت سے بیماریاں ایسی ہیں جن کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ ان کا علاج طویل یا مختصر فاقہ کشی، یعنی روزے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ انسانوں کو سات ہفتے لازماً روزہ رکھنا چاہئے اور ہر ہفتے میں ایک دن روزہ چھوڑ دینا چاہئے۔ اس طرح اسے (۷×۶=۴۲) بیالیس روزے رکھنے چاہئیں۔ اسے ہم اپنا چلہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کی رائے میں انسان کی صحت کو محفوظ رکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

عہد قدیم سے دنیا کے ہر ملک اور ہر تمدن میں اللہ جل شانہٗ کے حضور اپنے مال کا ۱۰/۱ حصہ پیش کرنے کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اس کی طرف لطیف سا اشارہ ملتا ہے "من جآء بالحسنة فله عشر امثالها" (جو شخص ایک نیکی کرتا ہے۔ اللہ اُس کو دس گنا فائدہ پہنچاتا ہے) دوسرے الفاظ میں اگر ہم اپنی جائیداد کا ۱۰/۱ حصہ اللہ جل شانہٗ کی خدمت میں پیش کریں یعنی خیرات کریں تو گویا ہم اپنی جائیداد اللہ جل شانہٗ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ تصور بہت قدیم زمانے سے دنیا کی ساری قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اس کا جتنا اچھا اطلاق روزے پر ہوتا ہے اور کسی عبادت پر نہیں ہوتا۔

عیسائیوں کے ہاں بھی یہ دستور ہے اور غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ عیسائی مذہب کے لحاظ سے، ان کے قدیم ترین تصوراتِ مذہبی کے مطابق، انسان کو چالیس دن روزے رکھنے چاہئیں۔ انہیں وہ Lent کے روزے کہتے ہیں۔ ان Lent کے روزوں میں وہ اتوار کو خارج رکھتے ہیں۔ یعنی چالیس دن میں جتنے اتوار آئیں اُس دن وہ روزہ نہ رکھیں۔ باقی چونتیس دن وہ روزے رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارا روزہ خدا کی خدمت میں ہماری غذا کا ۱۰/۱ حصہ پیش کرتا ہے۔ مگر وہ ایک رمزی چیز ہی رہتی ہے حقیقی نہیں۔ ان معنوں میں کہ چونتیس (۳۴) دن کو اگر ہم دس سے ضرب دیں تو ۳۴۰ دن ہوں گے۔ ۳۴۰ دن قمری سال کے ہوتے ہیں اور نہ شمسی سال کے۔ اس کے برخلاف مسلمان

ایک مہینہ روزے رکھتے ہیں۔ اگر صرف اتنا ہوتا تو ان کے روزے بھی انتیس یا تیس دن کے لحاظ سے ۲۹۰ یا ۳۰۰ دن ہوتے جو یقیناً سال کا دسواں حصہ نہ ہوتے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد آنے والے مہینے یعنی شوال میں چھ دن روزے رکھے، وہ گویا سارا سال روزے رکھتا ہے۔ انتیس دن اور چھ دن، پینتیس دن ہوں گے۔ ان کو دس سے ضرب دیں تو ۳۵۰ دن بنیں گے۔ اس طرح اگر رمضان شریف تیس دن کا ہوا تو تیس دن اور چھ دن، چھتیس دن یعنی ۳۶۰ دن ہوئے ۳۵۰ اور ۳۶۰ کا درمیانی حصہ ۳۵۵ دن ہوں گے، اور قریباً اتنے ہی قمری سال کے دن بنتے ہیں۔ گویا رمضان اور شوال کے روزے ملا کر سال کا ۱۰/۱ حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کو ایک اور طرح سے بھی دیکھ سکتے ہیں جو زیادہ سہل، آسان اور عام فہم ہے۔ ایک مہینہ روزے رکھیں تو دس مہینوں کے برابر ہوں گے۔ اور آگے چھ دن روزے رکھیں تو ساٹھ دن یعنی دو مہینوں کے برابر اس طرح پورا سال ہو گیا۔ اگر ہم ہر سال رمضان اور شوال کے فرض کیے ہوئے پورے روزے رکھیں تو اس طرح پورا سال اور پوری عمر، خدا کے حضور اپنے جسم کی اور اپنی غذا کی خیرات پیش کرنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روزے کا مختصر ذکر تھا۔

دوسری قوموں کا حج یا تو اپنے کسی بزرگ، کسی ولی، کسی بانیٔ مذہب کی قبر کی زیارت کرنا ہے، یا مظاہرِ قدرت اور عجائبات میں سے کسی بہت سی عجیب چیز کی زیارت کرنا ہے چنانچہ ہندو دریائے گنگا کے منبع کی زیارت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ہے۔ دریائے گنگا اور جمنا کا سنگھم جو الہ آباد کے مقام پر ہے، اس کی زیارت میں بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو مبینہ قبر ہے، ہر چند کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جا چکے ہیں اور قبر خالی ہے، لیکن ان کے نزدیک اس قبر کی زیارت کرنا بہت ثواب کا کام ہے۔ عام عیسائی جو بیت المقدس میں جا سکتے ہیں وہ سینٹ پیٹر کی قبر، جو ویٹی کان اٹلی میں ہے اس کی زیارت کرنا ثواب سمجھتے ہیں۔ اور تو اور مذہب کے نام تک سے نفرت کرنے والے کیمونسٹ جب انگلستان جاتے ہیں تو، ان کے نہایت ہی محترم افراد مثلاً وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بھی، کارل مارکس کی قبر کی زیارت

کوظہور جاتے ہیں۔ گویا ان کے ہاں بھی حج پایا جاتا ہے لیکن یہ سارے حج یا تو مظاہرِ قدرت کے کسی مقام کی زیارت یا اپنے کسی مقدس آدمی کی قبر کی زیارت پر مشتمل ہیں۔ مسلمانوں کا حج ان سب سے مختلف ہے اور وہ ہے اللہ جل شانہٗ کے گھر کی زیارت۔ اس کے حضور میں، اس کے مکان میں حاضر ہو کر باریابی حاصل کرنا۔ کعبے کو علامتی طور پر بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک رمز ہے جس کی توجیہ ان جوانوں کے لیے شاید دلچسپی کا باعث ہو جنہوں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ اللہ جل شانہٗ کے اسماء الحسنہ ننانوے (۹۹) ہیں۔ قرآن مجید میں کچھ اور نام بھی ہیں جو اللہ جل شانہٗ کی صفات کے مظہر ہیں مثلاً رازق، خالق وغیرہ وغیرہ، ان ناموں میں سے جو نام میری رائے میں انسان اور خدا جل شانہٗ کے تعلقات کی سب سے بہتر نمائندگی کرتا ہے وہ نام ہے ''ملک'' بادشاہ۔ جب ایک نام کسی ایک غرض کے لیے منتخب کر لیا گیا تو انسانی سوسائٹی میں اس نام کے ساتھ جو لوازم ہیں ان کو بھی قبول کرنا ہوگا۔ بادشاہ سے کچھ چیزیں خاص طور پر منسوب ہیں مثلاً بادشاہ کا ایک تخت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے خدا جل شانہٗ کا عرش ہے۔ عرش کے معنی تخت کے ہی ہیں۔ بادشاہ کے پاس فوجیں ہوتی ہیں۔ '' و للّٰہ جنود السمٰوات و الارض'' (۴:۴۸) [آسمانوں اور زمینوں کی فوجیں اللہ ہی کی ہیں۔] بادشاہ کے پاس خزانے ہوتے ہیں: ''وللّٰہ خزائن السمٰوات والارض'' (۷:۶۳) [زمین اور آسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں]۔ بادشاہ کے پاس ملک ہوتا ہے: و للّٰہ ملک السمٰوات و الارض''. (۳:۱۸۹) جب سلطنت کا رقبہ بہت وسیع ہو تو بادشاہ پایۂ تخت یا صدر مقام تجویز کرتا ہے۔ پایۂ تخت کے لیے انگریزی زبان کے اس لفظ سے آپ واقف ہوں گے (Metropolis)۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی شہروں کی ماں کے ہیں۔ اس معنی میں عربی زبان کا لفظ ہے ''اُم القریٰ''۔ شہر مکہ اُم القریٰ کے نام سے مشہور ہے، گویا اللہ کی سلطنت کا وہ صدر مقام ہے۔ جب ایک میٹروپولس یا اُم القریٰ ہو تو وہاں بادشاہ کا محل بھی ہوگا۔ چنانچہ بیت اللہ الحرام، اللہ کا مکان یا اللہ کا گھر وہاں موجود ہے۔ گویا کعبہ جو بیت الحرام ہے، یہ اس بادشاہ کا محل ہے۔ کسی ملک میں بادشاہ ہو تو یہ ہمیشہ سے رواج رہا ہے کہ رعایا کے نمائندے پایۂ تخت کو جا کر بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اسے اپنی اطاعت کا

یقین دلاتے ہیں۔ حج کے سلسلے میں جب لوگ مکہ معظمہ جاتے اور کعبے کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو وہ حجراسود پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں اور حجراسود یا اپنے ہاتھ کو بوسہ دے کر طواف کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کو ہمارے فقہاء دو ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اسے استیلام بھی کہتے ہیں اور بیعت بھی کہتے ہیں۔ بیعت کے معنی ہیں اپنے آپ کو بیچ دینا۔ اپنے آپ کو (اللہ جل شانہ' کے ہاتھ) فروخت کر دینا اور کہہ دینا کہ اے اللہ میں اپنی ذات کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ ہم اللہ جل شانہ' سے ایک معاہدہ کرتے ہیں اور اس معاہدے کی تکمیل کرتے ہیں۔ معاہدے کی تکمیل کا ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا چنانچہ ہم اپنا ہاتھ اللہ جل شانہ' کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔ اس لفظ سے آپ گھبرائیے نہیں کہ اللہ کے ہاتھ پر ہم اپنا ہاتھ رکھتے ہیں۔ ایک متواتر حدیث ہے جسے پانچ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: "الحجر الاسود یمین اللّٰہ فی الارض" (حجراسود زمین پر اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے) چنانچہ اللہ کے دائیں ہاتھ پر ہم معاہدہ کرتے اور بیعت کرتے ہیں۔ جب اپنی بیعت کے ذریعے سے اپنے بادشاہ کو ہم اطمینان دلا دیتے ہیں کہ ہم اس کے سچے اور مخلص مطیع ہیں تو سب سے بڑا اعزاز، وہ مالک جو ہم کو عطا کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے گھر کی پاسبانی کے لیے ہمیں اپنا سنتری بنائے۔ کعبے کے اطراف ہم طواف کرتے ہیں یعنی بادشاہ کے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ ساری عمر یا روزانہ چوبیس گھنٹے پہرہ دینے کے بجائے سات مرتبہ طواف کرنا کافی قرار دیا گیا ہے۔ سات کا عدد رمزیہ یا علامتی (symbolic) ہے۔ چنانچہ وقت جس کی ابتدا معلوم ہے، نہ انتہا، اس لامحدود شئے کو جب ہم نے شمار کی غرض سے محدود کرنا چاہا تو ہم نے سات کا ہی عدد استعمال کیا۔ ہفتے میں سات دن ہوں گے۔ وہی سات دن بار بار اپنے آپ کو دہراتے رہیں گے۔ اور بہت سی چیزیں ہیں مثلاً سبع السمٰوات وغیرہ۔ سات کا ہندسہ غیر محدود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ جل شانہ' کے گھر کی پاسبانی کے لیے اگر ہم سات مرتبہ اس کے اطراف چکر لگائیں تو یہ ابدی طور پر اپنے فریضے کی انجام دہی کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔ یہ گفتگو حج کے ایک جزو یعنی کعبے کی زیارت اور کعبے کے طواف کے متعلق تھی۔

لیکن حج میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا اور چکر لگانا۔

اسی طرح عرفات کو جانا اور پھر منیٰ کو آنا۔ چند الفاظ ان کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ ان میں کیا رمز پایا جاتا ہے۔ صفا اور مروہ کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے اور جاتے وقت صرف ایک مشکیزہ پانی اور تھوڑی سی کھانے کی کوئی چیز دے گئے۔ دو ایک دن بعد جب پانی اور غذا کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو دودھ پیتا بچہ، (حضرت اسماعیل علیہ السلام) پیاس سے بے قرار ہو کر رونے چلانے لگا۔ حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ کسی طرف بھی پانی کے آثار نظر نہیں آتے۔ قریب ہی ایک چٹان تھی سوچا کہ اگر میں چٹان پر چڑھوں تو شاید ذرا دور تک جائزہ لے سکوں، صفا کا پہاڑ ایک چھوٹی سی چٹان کی صورت میں اب بھی موجود ہے، اس پر چڑھتی ہیں۔ آس پاس نظر ڈالتی ہیں، کہیں پانی نظر نہیں آتا۔ پھر دیکھتی ہیں کہ آگے ایک اور چٹان ہے جسے مروہ کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ دوڑتی ہوئی اس کے اوپر چڑھتی ہیں۔ آس پاس دیکھتی ہیں تو وہاں بھی کچھ نہیں۔ ماں کی ممتا مایوس نہیں ہوتی۔ واپس آتی ہیں بچے کو دیکھتی ہیں پھر صفا پہاڑ پر چڑھتی ہیں پھر مروہ پر چڑھتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح سات مرتبہ چکر لگاتی ہیں۔ وہی سات کا ہندسہ جو ابدیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ساتویں مرتبہ جب بچے کے پاس آئیں تو دیکھا کہ بچے نے جہاں پیاس سے مجبور ہو کر اپنے ننھے سے پاؤں زمین پر رگڑے تھے، وہاں سے چشمہ پھوٹ پڑا ہے اور پانی نکل آیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل غیر ضروری ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ارکان حج میں اس لیے شامل کیا گیا کہ یہ واقعہ ماں کی ممتا کی یادگار ہے اور ماں کی ممتا اس بے پناہ شفقت و محبت کی علامت ہے جو خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد حاجی مکے سے عرفات کو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں روایت کے مطابق جنت سے زمین پر اُترنے کے بعد مدت کے بچھڑے ہوئے آدم علیہ اسلام اور اماں حوا کی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ نسل آدم کے لیے ان کے جدِ اعلیٰ کی یہ سب سے اہم یادگار ہے۔ اُس کے بعد منیٰ آتے ہیں۔ منیٰ کے متعلق روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل وہاں پر کی تھی۔ لکھا ہے کہ وہ مکے سے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلے اور اللہ جل شانہٗ کے حکم سے بڑھتے بڑھتے مکے سے آگے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ پہنچے۔ شیطان نے جب اللہ جل شانہٗ کے بندوں کو رضائے الٰہی کی طلب میں سخت آزمائشوں سے گزرتے دیکھا تو وہ انہیں بہکانے کے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اولاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم نے خواب کی بات پر کیسے یقین کر لیا کہ اللہ جل شانہٗ ایسا حکم دے رہا ہے۔ ممکن ہے خواب میں شیطان آیا ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فراست نبوی سے فوراً پہچان جاتے ہیں کہ یہ شیطان ہے۔ چنانچہ مٹھی بھر سنگریزے زمین سے اُٹھا کر اس کو بھگانے کے لیے پھینک مارتے ہیں۔ شیطان غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نئی شکل میں پھر آتا ہے اور اس بار حضرت ہاجرہؓ کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے مائی! تیرا شوہر تیرے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ تو کیوں نہیں کہہ دیتی کہ میں اجازت نہ دوں گی۔ یہ ایک نئی صورت تھی، پہلے سے بھی زیادہ مشکل۔ لیکن حضرت ہاجرہؓ بھی شیطان کو پہچان جاتی ہیں۔ وہ بھی پتھر اٹھا کر مارتی ہیں۔ اور اُسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شیطان غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اس ننھے بچے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس آ کر کہتا ہے کہ منے! تیرا باپ تیری گردن پر چھری پھیرنا چاہتا ہے۔ اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ باپ سے کہہ دو میں مرنا نہیں چاہتا۔ کم عمری کے باوجود حضرت اسماعیل علیہ السلام میں نبوت کی فراست تھی۔ انہوں نے بھی شیطان کو پتھر پھینک کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعے سے آپ واقف ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو زمین پر لٹاتے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر ایک پٹی باندھتے ہیں اور پورے عزم و استقلال سے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دیتے ہیں۔ پھر پٹی کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹا تو کھڑا مسکرا رہا ہے اور اس کی جگہ ایک بھیڑ یا بکری تھی، جو ذبح ہو گئی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لینا مقصود تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں رضائے الٰہی پر ہر چیز قربان کر دوں گا۔ اللہ جل شانہٗ نے انہیں سخت ترین آزمائش میں ڈالا کہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد تقریباً سو سال کی عمر میں جو پہلا بیٹا ہوا، اُسی کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ بندگی

اور حق پرستی کا یہ کمال دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آزمائش میں بھی پورے اُترے۔ سنت ابراہیمی کی ادائیگی کے لیے منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں یہ بھی ارکان حج میں شامل ہے۔ جن تین مقامات پر شیطان پر پتھر پھینکے جاتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں اپنے آپ کو سپرد کردیئے یا بیعت کرنے کا سمبل ہے اور خدا جل شانہٗ کی نوازشوں کا اعتراف بھی۔

زکوٰۃ کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنے کا موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی کہوں گا کہ زکوٰۃ ارکانِ عبادات میں سے ایک ایسا رکن ہے جو مال کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔ اسلام ذین اور دنیا کا جامع ہے اور "فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ میں بھی مالی ایثار کے ذریعے اصلاح باطن کا پہلو اور معاشرے کی مادی فلاح و بہبود کا پہلو بھی موجود ہے۔



6

مملکت اور نظم ونسق

جس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اس وقت مکہ کی چند خصوصیتیں ہمیں حیرت انگیز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ مکہ نہ صرف بہت مالدار اور تجارتی شہر تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے نظم ونسق کے لیے ایک حکومت بھی پائی جاتی تھی۔ جس میں بارہ وزیر ہوا کرتے تھے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ میں اس کا حال مختصر طور پر آپ سے بیان کروں گا۔ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بہت پہلے، نسلاً بانسل کے انتظامات کا نتیجہ تھی۔ قرآن مجید کی ''سورۃ القریش'' سے آپ واقف ہیں جس میں مکے والوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہی نے تمہیں سردی اور گرمی کے سفر کے ذریعہ مال بھی دیا اور خوف سے بھی تم کو بچالیا لہٰذا اس اللہ جل شانہٗ کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے۔

جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے مکہ ایک اہم مقام تھا کہ عرب کے شمال اور جنوب کے لوگ جب تجارت کے لیے جاتے تھے تو انہیں مکہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی تجارت ہندوستان سے مکہ کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مکہ کی جغرافیائی اہمیت کیا تھی۔ اس زمانے میں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ غذا، پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کا بندوبست کریں۔ مکہ میں جو زمزم کا چشمہ یا کنواں تھا وہ ایسی چیز تھی کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا تمام قافلے وہاں سے گذار کرتے تھے۔ مکے کی اس تجارتی حیثیت کو اور بھی مستحکم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد نے ایک مرتبہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو قیصر کے پاس بھیجا، دوسرے

کو کسریٰ کے پاس بھیجا۔ تیسرے کو نجاشی کے پاس اور چوتھے کو یمن کے حکمرانوں کے پاس بھیجا اور ان سے معاہدہ یہ کیا کہ ہمیں اس بات کی اجازت ہو کہ ہم تجارتی قافلے تمہارے ملک میں لائیں۔ اپنا مال وہاں فروخت کریں اور تمہارے ملک کی پیداوار ہم خرید کر اپنے ملک کو لے جائیں۔ اس تجارتی معاہدے کو ان حکمرانوں نے بھی پسند کیا اور قبول کرلیا۔ اس کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی معلومات ہیں لیکن اس وقت میں ان کو بیان نہیں کروں گا۔

مکے والوں نے یہ سوچا کہ ممکن ہے لٹیرے بدوؤں کے قبیلے تجارتی قافلوں کو اپنے علاقوں سے گزرتے دیکھ کر چھاپہ ماریں اور انہیں لوٹ لیں، اس لئے مکے کی زیارت گاہ اور مال و تجارت کی حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مکے کے افسروں نے ان تمام قبائل کے سرداروں سے جو کاروانِ تجارت کے راستوں پر پڑتے تھے، گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ان تجارتی قافلوں سے ہمیں جو منفعت ہوگی اس میں سے کچھ حصہ تمہیں بھی دیا جائے گا۔ اس لالچ میں انہوں نے قبول کیا کہ ہم تمہارے کاروانوں پر حملہ نہیں کریں گے لیکن ہمیں آزادی رہے گی کہ دوسرے کاروانوں کو لوٹیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکی سرداروں نے کہا کہ اگر تمہارے پاس کچھ فروخت کرنے کا سامان ہو، مثلاً بھیڑ بکریوں کے چمڑے یا زیتون کا تیل وغیرہ، تو وہ ہمیں دے دو، ہم اسے فروخت کریں گے اور پورا منافع بغیر کسی معاوضے کے تمہیں پہنچا دیا کریں گے۔ غرض ان قبائلی سرداروں سے معاشی معاہدوں اور ہر طرف سے حفاظتی انتظامات کے باعث مکہ معظمہ عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور انتہائی مال دار شہر بن گیا تھا۔ اس کی دولت مندی کا اس سے اندازہ لگایئے کہ مدینے کے ابتدائی زمانے میں ایک اسلامی دستے نے مشرکین مکہ کے ایک کاروان پر چھاپہ مارا تھا اور اس میں جو مال غنیمت ملا، اس کی مالیت ایک لاکھ درہم تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ درہم کی قیمت آج کل کے کروڑوں روپے کے برابر تھی۔ یہ ایک کاروان کا سرمایہ تھا، اس سے ہم قریش کی دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ معاشی نقطہ نظر سے مختلف ملکوں کے تجارتی قافلوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریش نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ ان کا کوئی آدمی بطور محافظ قافلے کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا۔

جہاں تک سیاسی نظم و نسق کا تعلق ہے، شہر مکہ ایک شہری مملکت تھی جس کا رقبہ (حدود

حرم کی اساس پر) تقریباً ایک سوتیس مربع میل تھا۔ وہاں بادشاہت کی جگہ ایک طرح کی سیلف گورنمنٹ تھی، یعنی ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ دار تھی۔ اس کی تفصیلیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی مختصراً ذکر کروں گا کہ اس میں دیوانی مقدمات اور فوجداری مقدمات کے لئے الگ الگ وزیر تھے، کعبہ کے انتظام کے لئے، یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لئے ایک وزیر تھا، اس طرح وہاں غیب دانی کے لئے یعنی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے، ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے جن سے وہ فال نکالا کرتے تھے۔ ان تیروں کی نگرانی کرنے والا ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اس طرح کعبے میں باہر سے آنے والے زائرین چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے، ان چڑھاووں کی حفاظت کے لئے ایک اور وزیر مقرر تھا۔ اسی طرح ٹیکسیشن کے لئے بھی ایک وزیر تھا۔ یعنی شہر مکہ کے باشندے ہر سال اپنے افسر متعلقہ کو کچھ رقم بطور ٹیکس دیتے تھے جس کا اولاً مقصد بیان کیا گیا تھا کہ اگر کوئی حاجی کسی نہ کسی وجہ سے مکہ میں اپنے آپ کو بے بس پائے یا اس کے پاس پیسے بالکل نہ رہیں، یا اس کی سواری کا اونٹ مر جائے تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کے لئے اور حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی ضیافت اور مہمانداری پر خرچ کرنے کی غرض سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کا انتظام، ظاہر ہے کہ ایک خصوصی وزیر کے سپرد ہوتا تھا۔

ایک اور ادارہ تھا جس کو دارالندوہ کہنا چاہئے۔ جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ مثلاً کسی دشمن کے حملے کا خطرہ یا کوئی اور معاملہ درپیش ہوتا تو سارے باشندوں کی جگہ ان کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تھی۔ لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال ہو جاتی، وہ خود بخود اس مجلس مشاورت یا اس پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دو آدمیوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا یعنی ان کو چالیس کی عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا رکن بنا لیا گیا تھا۔ ان میں ایک ہمارے ''دوست'' ابوجہل صاحب بھی تھے۔ ان کی فراست اور عقلمندی کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ ان کو نوجوانی میں ہی اس کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور شخص کا بھی ذکر آتا ہے۔ سب سے عجیب وغریب جوبات ہمیں نظر آتی ہے، وہ وزارت خارجہ کا بھی عہدہ ہے۔ وزارت خارجہ کا دائرہ کار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی بیرونی قبیلے سے گفتگو کی ضرورت پیش آتی، کسی جھگڑے کا تصفیہ اور مصالحت کرانی ہوتی یا دشمن کے

مطالبات کو نہ ماننے کی صورت میں اعلان جنگ کرنا پڑتا ہو تو ایسے تمام خارجہ معاملات کے انتظام وانصرام کے لئے بھی ایک عہدہ دار پایا جاتا تھا، یہ تمام وزراء عہد نبوی تک پائے جاتے تھے۔ان میں سے اکثر نام بہت مشہور و معروف ہیں مثلاً دیوانی مقدمات حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے سپرد تھے، وزارتِ خارجہ کا منصب حضرت عمرؓ کے سپرد تھا، اس طرح فوج کا جھنڈا حضرت ابوسفیانؓ کے سپرد تھا۔ یہ تمام نام تاریخ اسلام میں آتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی مشہور شخصیتیں تھیں اور مکے کی حکومت میں ان کو خاصا مقام حاصل تھا۔دوسرے لفظوں میں شہر مکہ میں ایک مملکت پائی جاتی تھی اور یہ مملکت ایک شہری مملکت تھی ۔اس کا انتظام بجائے ایک فرد کے ہاتھ میں ہونے کے ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔یہ ہے مختصر خلاصہ اس سیاسی نظام کا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت شہر مکہ میں پایا جاتا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوتی ہے۔ابتدائی چالیس سال تک وہ اس شہر کے شہری باشندے رہے۔کوئی ایسی بات ہمیں نظر نہیں آتی جو قابل ذکر ہو، بجز اس کے کہ اور قبیلوں کی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان بنی ہاشم بھی اس نظام حکومت میں شامل تھا، یعنی ایک وزارت اس خاندان کے بھی سپرد تھی، وہ وزارت زمزم کے کنویں کے انتظام کے متعلق تھی۔اس میں منفعت بھی زیادہ تھی۔اگرچہ ہمیں صراحت سے معلوم نہیں ہوتا لیکن اور مقاموں، مثلاً شام وغیرہ میں اس کا پتا چلتا ہے کہ عبادت گاہ کے کنویں کا پانی حاجیوں کو دیا جائے تو انعام یا ٹیکس کے طور پر اس پانی دینے والے کو لوگ اپنی طرف سے رقم دیا کرتے تھے۔اگر مکے میں بھی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس سے کافی منفعت ہوتی ہوگی۔یہ کنواں چونکہ بڑی مدت کے بعد عبد المطلبؓ نے دریافت کیا تھا، اس لئے انہی کی نگرانی میں رہا اور غالباً ان کی خاطر شہری مملکت کے نام میں ایک نئی وزارت کا اضافہ کر دیا گیا۔حضرت عبد المطلبؓ کی وفات کے بعد یہ انتظام ان کے بیٹے ابو طالب نے سنبھالا۔ابو طالب بہت فراخ دل تھے لیکن ان کی مالی حالت خراب تھی اور اکثر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔چنانچہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے بھائی حضرت عباسؓ سے کچھ رقم قرض لی اور کہا کہ ایک سال بعد ادا کر دوں گا ایک سال بعد آپ رقم ادا نہ کر سکے تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ

اگر تم مزید مہلت چاہتے ہو تو میں اس شرط پر آمادہ ہوں کہ زمزم کی نگرانی مجھے دے دی جائے۔ اس طرح چاہِ زمزم حضرت ابو طالب کی جگہ حضرت عباسؓ کے قبضے میں آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، فتح مکہ کے وقت بھی وہی اس کے مالک تھے اور اس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توثیق بھی کی۔ غرض یہ کہ بنی ہاشم کو بھی مکہ شہر کے انتظام میں دستوری طور سے ایک مقام حاصل تھا۔ بعد کے زمانے میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نظم ونسق میں کیا حصہ لیا اور مکہ شہر میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ شہر مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوتے رہے ان کی تعداد بہت ہی آہستہ آہستہ بڑھی، لیکن وہ تھے سارے ہی قبیلوں کے، اور انہوں نے مملکت کے اندر ایک مملکت بنا لی۔ وہ مکہ شہر میں رہتے تھے لیکن اگر انہیں عدالتی مسئلے کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ ان افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے، جن کے پاس عدل گستری کا کام تھا۔ اگر انہیں فوجی دفاع کے سلسلے میں ضرورت پیش آتی تو ان کو مکہ والوں سے امداد کی توقع نہ تھی۔ غرض وہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے جو ان کے قانون ساز بھی تھے، کمانڈر انچیف بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ جلد ہی مسلمانوں کو مکہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مکہ کے اکثر مسلمان بھی ہجرت کر کے مدینے میں جا بسے۔

مدینے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مہاجرین کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے مواخات کا انتظام کیا۔ اس کے بعد جو کام ہوا، اس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے یعنی مملکت کا قیام۔ مدینے میں کسی شہری مملکت کا وجود نہیں تھا۔ یہاں پر اسلام سے پہلے کئی قبیلے آباد تھے اور ان قبیلوں میں بھی آپس میں خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ آخری جنگ ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی جس میں بہت ہی شدید خون ریزی ہوئی اور اس کے اثرات خود اسلامی معاشرے پر بھی پڑے اشارۃً میں دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب مدینے کے کچھ لوگ ''اوس'' قبیلے میں سے اور کچھ لوگ ''خزرج'' قبیلے کے بھی مسلمان ہوئے تو چونکہ ان دونوں قبیلوں میں جھگڑا تھا، اگر امام ''خزرجی'' ہوتا تو ''اوسی'' مسلمان اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے اور اگر ''اوسی'' امام ہوتا تو ''خزرجی'' لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے۔ اس لئے

ضرورت پیش آئی کہ مکے سے ایک امام بھیجا جائے تا کہ اس کے پیچھے ''اوسی'' اور ''خزرجی'' دونوں نماز پڑھ سکیں۔ ایک اور واقعہ جس کو ہم اس سے بھی زیادہ افسوس ناک کہہ سکتے ہیں، یہ نظر آتا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں میں سعد ابن معاذؓ ایک بہت ہی اچھے، راسخ العقیدہ اور اسلام کے لئے سرگرم کار مسلمان تھے وہ ''خزرج'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے قبا پہنچے، تو ایسے بہت سے لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دیکھ چکے تھے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، سلام عرض کرتے ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے ہیں، لیکن ان میں سعد ابن معاذؓ نظر نہیں آتے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پوچھا کہ سعد ابن معاذؓ کہاں ہیں تو قبا کے باشندے ''اوسیوں'' نے شرمندگی کے انداز میں کہا کہ گزشتہ جنگِ بعاث میں انہوں نے ہمارے بعض سرداروں کو قتل کیا تھا، اس لئے انہیں جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ ہمارے علاقے میں آئیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں حکومت کرنے کے لئے کن دشواریوں کا سامنا تھا۔ بہرحال اسی رات کا کافی حصہ گزرنے پر ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے بھیس بدلے ہوئے، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتا ہے تو نقاب اٹھاتا ہے۔ یہ تھے سعد ابن معاذؓ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیرت سے پوچھتے ہیں کہ تم کیسے آئے؟ انہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں اور میں نہ آؤں، یہ ناممکن تھا۔ جان پر کھیل کر حاضر ہوا ہوں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کرتے ہیں کہ قبیلہ ''اوس'' ان کو باقاعدہ طور پر پناہ دینے کا اعلان کرے تا کہ اگر وہ آئیں کھلم کھلا آسکیں اور انہیں کوئی ''اوسی'' شخص نہ ستائے۔ مگر وہ ہچکچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ حکم دیں گے تو ہم تعمیل کریں گے لیکن ہم خود پناہ دینا نہیں چاہتے۔'' بالآخر ایک ''اوسی'' سردار نے اس کو قبول کیا۔ چنانچہ وہ سعد ابن معاذؓ کے مکان پر گئے۔ ان کو ساتھ لے کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ہیں اور ''اوسی'' قبیلے کے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کے سردار نے سعد ابن معاذؓ کو پناہ دی ہے۔ پھر اس کے بعد

سے امن قائم ہوتا ہے۔ تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدینے میں حکومت کرنا کتنا مشکل کام تھا اور کن تدبیروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آہستہ ان مشکلوں کو دور کیا۔

اس ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تجویز پیش کی کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مملکت قائم کی جائے۔ لیکن ابتدا ہی میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگِ بعاث کے بعد مدینے والوں نے یہ سوچا تھا کہ آئے دن کی جنگ ہم سب کے لئے نقصان کا باعث ہے، اس کو ختم کرنا چاہیے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ختم کریں؟ اگر کوئی بادشاہ بنایا جائے تو وہ کس قبیلے کا ہو جس کی اطاعت ''خزرجیوں'' اور ''اوسیوں'' میں سبھی کو قبول ہو۔ خزرجی قبیلے کا ایک سردار عبداللہ بن ابی بن سلول بہت مالدار اور صاحب اقتدار تھا۔ خزرجیوں کو توقع تھی کہ ''اوسی'' بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے، چنانچہ اس کے لئے تاج شہریاری تیار ہونے لگا۔ اس اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ''اوسی'' اور ''خزرجی'' مسلمانوں کو اب عبداللہ بن ابی بن سلول سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت پیدا ہوگئی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غاصب ہیں، میرے اقتدار اور میری بادشاہت میں حارج ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص ساری عمر منافق رہا اور آئے دن اسلام کے لئے دشواریاں پیدا کرتا رہا۔ ''واقعہ افک'' میں حضرت عائشہؓ پر جو الزام لگایا گیا، وہ بھی انہی صاحب کی کارگزاری تھی۔ جنگِ تبوک کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی ایک سازش ہوئی تھی، اس میں بھی اس کا دخل تھا۔ بہر حال ایک طرف عبداللہ بن ابی کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی نظم و نسق میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ علاوہ ازیں ''اوس'' قبیلے کے ایک عیسائی، ابو عامر راہب نے دوسرا فتنہ کھڑا کیا۔ اس کو بائبل کے مطالعے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا امکان ہے، چنانچہ اس نے سوچا کہ خود نبوت کا دعویٰ کرے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو وہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتا ہے، کہتا ہے کہ تم جھوٹے نبی ہو (نعوذ باللہ)، نبی موعود تو میں ہوں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو شروع ہی

سے بہت سی دشواریاں پیش آتی رہیں۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا کی بجائے اس مقام پر رہنا پسند کیا جو ''اوسیوں'' کے نہیں ''خزرجیوں'' کے علاقے میں تھا۔اس کی وجہ امام بخاریؒ نے یہ بیان کی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔عبدالمطلب کی ماں قبیلہ خزرج سے تھیں۔چنانچہ قبا سے نکل کر،اس مقام پر قیام کیا جہاں بنونجار کا قبیلہ رہتا تھا اور جلد ہی وہاں ایک جلسہ طلب کیا گیا۔شہر مدینہ کی آبادی کے جو مختلف عناصر تھے،ان سب کے نمائندوں کو بلایا اور ان کے سامنے حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔اس تجویز کو اکثریت نے قبول کیا۔لکھا ہے کہ صرف دو یا چار ''اوسی'' اشخاص نے انکار کیا۔اس طرح ایک مملکت قائم ہوتی ہے جو ایک شہر پر بھی نہیں بلکہ ایک شہر کے کچھ حصے پر مشتمل ہونے کے باوجود،علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔وہ یوں کہ ایک مملکت میں حکمران اور رعایا کے جو حقوق و فرائض ہوں گے،ان کو تحریری طور سے مرتب کیا گیا۔دوسرے الفاظ میں اس مملکت کا دستور مرتب کر کے سب کے سامنے پیش کیا گیا اور سب کے مشورے سے اسے لکھا گیا۔اس تاریخی دستاویز کی خاص قابل ذکر اہمیت یہ ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ''امی'' شخص کے ہاتھوں وجود میں آتا ہے۔(اس دستور پر ایک جداگانہ،مفصل مقالہ اس کتاب میں شامل ہے۔مدیر)

اس دستور کی ساری دفعات کی تشریح شروع کر دوں تو اس کے لئے کم از کم مجھے ایک پورا دن درکار ہوگا۔مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ اس طرح تو یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مملکت ایک مستقل اور خود مختار مملکت ہوگی اور یہ بھی صراحت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہوگی۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ''للمسلمین دینھم ولليھود دینھم ''یعنی مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے۔یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے ان کو دینی آزادی کا اطمینان دلایا گیا تھا۔اس طرح دفاع کے سلسلے میں جو انتظام کیا گیا وہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔لیکن اس پہلو پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکومت کا صدر تسلیم کیا گیا۔غالباً خالص دنیوی نقطہ نظر سے ہم اس پر غور کریں تو وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ''اوسیوں'' کا

کوئی بادشاہ مقرر کیا جاتا تو ''خزرجی'' اس کو قبول نہ کرتے اور اگر ''خزرجیوں'' میں سے منتخب کرتے تو ''اوسی'' اس کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ سوائے اس کے کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا آپس میں لڑنے والے قبائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد رکھتے اور آپ کو نبی مانتے تھے۔ آپؐ کی غیر جانبداری آپ کی عدل گستری، آپ کا تحمل وتدبر اور آپ کی فیاضی کا چند مہینوں کے عرصے میں سب لوگوں کو تجربہ ہو چکا تھا۔

دفاع کے سلسلے میں، اس دستور میں جو صراحتیں ہیں، ان میں سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن اور جنگ نا قابل تقسیم چیز ہوگی، یعنی اگر امن ہو تو اس سلطنت کے سارے باشندوں کے لئے ہوگا اور جنگ ہو تو سارے باشندوں کے لئے۔ صلح وجنگ کی مرکزیت اور نا قابل تقسیم ہونا ایک اہم بات تھی۔ پھر اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ اگر جنگ کے لئے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہوگا کہ کون فوج میں شریک رہے اور کون فریق فوج میں نہ رہے۔ گویا آپ کو کمانڈر انچیف سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ آپ کو اختیار تھا کہ اپنی فوج سے ان تمام لوگوں کو خارج کر دیں جو مشتبہ ہوں اور جو فوج کے اندر رہ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہیں۔ گویا آپؐ نہ صرف جنگی انتظامات کے مالک تھے بلکہ جنگ کے سیاسی پہلوؤں پر بھی آپؐ ہی کا دخل تسلیم کیا گیا۔ البتہ یہ صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہر محلہ براہ راست مدافعت کرے گا اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اور یہ بھی کہ فوج میں جو اخراجات ہوں وہ ہر محلہ یعنی ہر قبیلہ خود برداشت کرے گا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی سرکاری خزانہ نہیں تھا۔ لہٰذا مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ لوگ رضا کارانہ اور بلا تنخواہ فوج میں داخل ہوں۔ لیکن فوج کی باگ ڈور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اور فوجی انتظامات خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے ہیں۔ اسی طرح دستور میں عدل گستری کا بھی ذکر ہے کہ ابتدائی عدالت تو قبیلہ وار ہوگی یعنی قبیلے کے دو افراد میں جھگڑا ہو تو لوگ اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کریں گے۔ لیکن اگر فریقین دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا پڑے گا۔ اگرچہ انہیں اختیار تھا کہ کسی اور شخص کو بھی اپنا حاکم بنا لیں

لیکن آخری حاکم عدالت بالفاظِ دیگر عدالتِ اپیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہو گی ۔مسلمانوں کے لئے صراحت ہے کہ قانون سازی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے ۔دیگر تفصیلیں جو اس دستور میں آئی ہیں ان کے سلسلے میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حکمرانوں کو کیا اختیارات حاصل ہیں اس دستور میں ایک چیز جو غیر معمولی اور غیر متوقع کہی جا سکتی ہے وہ بیمے کا انتظام ہے ۔اس کی تفصیل پہلے کسی جگہ آ چکی ہے ۔یہاں اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر فدیہ یا خون بہا کی گراں قدر رقم کوئی شخص ادا کرنے سے معذور ہو تو اس کے قبیلے کی انجمن یا ہمسایہ قبیلے کی انجمن ،ورنہ بالآخر مرکزی انجمن ،اس رقم کی ادائگی کا انتظام کرے گی ۔اسی طرح یہودیوں کے متعلق بھی تفصیل ہے کہ ان پر کیا واجبات و فرائض ہوں گے ۔اس کا بھی ذکر ہے کہ جو مشترکہ دشمن ہیں یعنی قریش مکہ وغیرہ ان کے ساتھ اس مملکت کے باشندوں کا کیا طرز عمل ہو گا۔

یہ تھا وہ نظام جو عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع ہوا،اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ مملکت ابتداء میں ایک شہری مملکت نہیں تھی بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی ،لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوتی ہے ۔اس توسیع کا آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں بلکہ ایک وسیع سلطنت کا دارالسلطنت تھا ۔اس وسیع سلطنت کا رقبہ ،تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا ۔سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پُرامن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات وسرایا سے متعلق دیگر تفصیلات کے عَلاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں ۔تین ملین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لئے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں ،ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں تھی ۔دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے ۔دشمن کے مقتولین کی تعداد اس سے کم تھی ۔مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمنوں سے بھی کم تھی ۔مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان جنگ احد میں ہوا کہ ستر آدمی شہید ہوئے اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا ۔بہرحال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے

میں دو سے بھی کم ہے، جس سے ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اسوۂ حسنہ بن کر دنیا بھر کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔ مقصد یہ کہ دشمن جو آج غیر مسلم ہے ممکن ہے کل وہ مسلمان ہو جائے یا اس کے بیوی بچے اور اس کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں لہٰذا اس امکان کو زائل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے پچھتانے کی ضرورت پیش آئے۔

ہمارے موضوع کا ایک پہلو تو حکومت کے قیام اور سلطنت کی توسیع سے متعلق تھا۔ دوسرے پہلو کا تعلق حکومت کے نظم ونسق سے ہے ہم یہاں یہ دیکھیں گے کہ نظم ونسق کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اقدامات کئے اور ان کے کیا نتائج نکلے۔ جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ قائم فرمائی۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پرانے انتظامات وراثت میں بالکل نہیں ملے۔ فوج، خزانہ اور عدلیہ اور انتظامیہ کے اداروں میں سے کوئی چیز وہاں نہیں تھی ۔ ہر چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ہی نقطہ صفر سے پیدا کرنی اور ترقی دینی تھی۔ اس زمانے میں اتنے دفتر اور اتنے محکمے نہیں ملیں گے جو آج بیسویں صدی میں ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں مثلاً آج کل آپ کو سڑکیں بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عرب میں کہیں سڑکیں نہ تھیں سڑکوں اور شاہراہوں کی جگہ عام خود ساختہ گزرگاہیں تھی۔ سڑک کی تعمیر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اس کے لئے نہ ناظم تھا، نہ محکمہ تعمیرات۔ البتہ اس کے باوجود کچھ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو شہری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کارآمد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شہر کے اندر تم گلیوں کو اتنا چوڑا رکھو کہ دو لدے ہوئے جانور بآسانی گزر سکیں، گویا آج کل کے الفاظ میں آسانی کے ساتھ دو موٹریں آجا سکیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قانون سازی صرف دینی معاملات تک ہی محدود نہیں تھی اس میں دینوی مسائل پر بھی توجہ دی گئی ہے حتیٰ کہ اس میں مکانوں کے درمیان کا راستہ بھی شامل ہے۔ اہم ترین انتظامات میں سے چند کاتبوں پر مشتمل ایک دفتری نظام (سیکریٹریٹ کا) بھی تھا۔ چنانچہ مسعودی اور دیگر مؤلفوں نے بتایا ہے کہ ان کاتبوں کے

فرائض مختلف تھے۔ کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی لکھا کرتے تھے۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کے اندراجات کرتے، یعنی رقم کس سے وصول ہوئی اور کس پر خرچ کی گئی۔ جنگوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا، اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ سب کو جمع کر کے، اس میں سے سارے فوجیوں کو برابر حصہ دیا جائے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مالِ غنیمت کی جمع و تقسیم کا حساب رکھا جائے۔ اس کے لئے بھی خصوصی کاتب مقرر تھے۔ اسی طرح کوئی دس بارہ مدوں کی تفصیل دی گئی ہے کہ ان کے لئے الگ الگ کاتب مقرر کیے گئے تھے۔

ایک چیز اور جس کا تعلق فوجی نظام سے اور ساتھ ہی مالی نظام سے ہے، اس کا بھی میں ذکر کرتا چلوں۔ اس پر آپ کو حیرت بھی ہوگی۔ عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دیوان قائم ہوا۔ اور دیوان کا منشا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سرکاری خزانے سے سپاہیوں کو پنشن دی جاتی تھی، اس شرط پر کہ وہ چوبیس گھنٹے تیار رہیں کہ جب حکومت انہیں بلائے تو وہ اسی وقت گھربار اور کاروبار چھوڑ کر فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی طرف سے منسوب ہے اور اس کے لئے حضرت عمرؓ نے جو دیوان قائم کیا تھا اس کی بہت سی تفصیلیں ہمیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کا آغاز بھی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے۔ چنانچہ "السیر الکبیر" میں آیا ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک کاتب کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرست مرتب کرے جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انہیں بلایا جائے، فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کو بیت المال سے مستقل وظیفہ ملتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قائم کردہ نظام کو مزید ترقی دی۔ ان کے زمانے میں حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا وظائف بھی زیادہ دیئے جانے لگے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر مسلموں کو بھی وظائف دیئے جاتے تھے۔ غرض دیوان یا سیکریٹریٹ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا۔ بعض چیزوں کا انتظام حسب ضرورت رضاکارانہ ہوتا تھا، مثلاً شروع میں اذان نہیں ہوتی تھی۔ جب نماز کے لئے لوگوں کو ایک مؤذن کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ طے پایا کہ اذان دی جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا، کیونکہ ان کی آواز سریلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اذان کا طریقہ سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ کس لفظ کو کھینچو، کس کو مختصر کرو، گویا موسیقی کی سُر یں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سکھائیں۔ اسی طرح ایک اور مؤذن بھی مقرر کیا گیا تا کہ ایک ہی آدمی پر اس کی ذمہ داری نہ رہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہمیں مذہبی نظام کے سلسلے میں ملتی ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر صفائی کی ضرورت تھی۔ ایک حبشی مسلمان عورت نے رضا کارانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ روزانہ مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور قندیل میں لگائے ہوئے چراغ جلاتی۔ اس طرح کے انتظامات کا بھی ہمیں پتا چلتا ہے جو بالکل ابتدائی حالت میں تھے، اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ ان نظامات میں سے ایک نظام فوج کا بھی ہے۔ دفاع کے لئے فوج کی ضرورت تھی۔ شروع میں اسلامی حکومت کے پاس مال و دولت نہ تھا۔ اس کا حل خدائے حکیم نے یوں کر دیا کہ جہاد کو مسلمانوں کا ایک فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر شخص پر واجب تھا کہ اسلام کے دفاع کے لئے اپنی جان اور اپنے مال کو قربان کرے۔ یہ نہیں کہ سو فیصد مسلمان جنگوں میں حصہ لیں، لیکن بوقت ضرورت ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلوبہ تعداد میں لوگوں کو چن لیتے تھے، اور انہیں مہم پر روانہ کر دیتے تھے۔

اس سلسلے میں ''صفہ'' کا بھی ذکر کرنا چاہئے جس کا تعلق تعلیم و تربیت کے علاوہ فوج سے بھی ہے۔ بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اطلاع آتی کہ فلاں کارروائی کے خلاف تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، یعنی دشمن کو سزا دی جائے یا اس کا تعاقب کیا جائے۔ مثلاً کسی نے مدینے کے ایک گھر پر چھاپا مارا تو ضرورت تھی کہ فوراً ہی اس کے تعاقب کے لئے فوج کا کچھ حصہ روانہ کیا جائے۔ ایسی ہنگامی ضرورت کے لئے ''صفہ'' کارآمد ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان ہوتے ہی کہ ایک مہم کے لئے اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے، فوراً اصحاب صفہ کی ایک جماعت اس مہم پر روانہ ہو جاتی۔ ان کو دن یا رات میں کسی وقت بھی بلایا یا بھیجا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بڑی مہم بھیجنی ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے تیاریاں کرنی ہوتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبے میں یا کسی نماز کے بعد یا غیر معمولی اجتماع کر کے فرماتے کہ اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے تو لوگ رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز ہے کہ ان کے نام

اور پتے نوٹ کیے جاتے تھے اور بعد میں اس کے مطابق انہیں اطلاع دی جاتی تھی کہ تم سب لوگ فلاں مقام پر، فلاں وقت اپنے ہتھیار اور ضروری سامان کے ساتھ جمع ہو جاؤ۔ صرف یہی نہیں، فوجی نظام کے سلسلہ میں اور بھی بے شمار باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو ورزش کی ترغیب دیتے تھے، نشانہ بازی کی مشق کی بھی ہمیشہ تشویق فرماتے۔ خود بھی وہاں جاتے اور اپنے سامنے گھڑ دوڑ کراتے، اونٹوں کی دوڑ کراتے، آدمیوں کی دوڑ کراتے، کشتی کے مقابلے کرواتے اور لوگوں کو انعامات دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آج بھی شمالی دروازے کے پاس ایک مسجد ہے، جس کا نام مسجد سبق ہے۔ سبق کے معنی مسابقت میں جیتنا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے، بلندی پر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب گھوڑے دوڑتے ہوئے آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فیصلہ فرماتے کہ کونسا نمبر ا ہے اور کونسا نمبر ۲ اور نمبر ۳ وغیرہ۔ 'مقریزی' نے بیان کیا ہے کہ پانچ اوّل آنے والے گھوڑوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انعام دیا کرتے تھے اور یہ انعامات کبھی کھجور کی صورت میں ہوتے، کبھی کسی اور چیز کی صورت میں۔

غرض ایک تو فوجی خدمت کو لازمی قرار دیا جاتا، دوسرے فوج کی تربیت، یہ دو انتظامات تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کے زیر اہتمام فوجی ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا۔ مثلاً ہتھیار خریدنا، گھوڑے اور اونٹ خریدنا، ان کو سرکاری چراگاہ میں رکھنا، تا کہ بوقت ضرورت اگر سپاہیوں کے پاس ان کی ضرورتوں کی چیزیں ناکافی ہوں تو سرکاری طور سے بھی ان کو مدد دی جائے۔ تا کہ فوج کے انتظامات ناکافی ہونے کی وجہ سے فوج کو نقصان اور تکلیف نہ ہو۔ ایک اور چیز جس کا نظام قائم کیا گیا اور جس کا تعلق سیکریٹریٹ سے ہے وہ بیرونی قبائل اور حکمرانوں کو خط لکھنا اور معاہدات کو لکھنا۔ چنانچہ بیرونی حکمرانوں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے، ان مکتوبات نبوی کا سب سے قدیم ذخیرہ یا مجموعہ، جو تیار ہوا تھا، اس کو ابو جعفر دیبلی (ایک پاکستانی) نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد اور لوگ بھی اس میں حصہ لیتے رہے اور انہوں نے بھی مکتوبات نبوی کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بیرونی حکمرانوں سے مراسلت ہی نہیں، بلکہ ان کے پاس

سفیروں کو بھیجنا بھی ضروری تھا۔ اس کا تعلق بھی سیکریٹریٹ سے تھا اور ہمیں ایسے متعدد لوگوں کے نام ملتے ہیں جو سفیر بنے۔ اس سلسلے میں ایک چیز جو دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ غیر مسلموں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ غالباً غیر مسلموں میں سے بعض قابل اعتماد شخصیتوں کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو سفیر بنایا جاتا تھا۔

سلطنت کے جو مختلف انتظامات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ان میں مالیے کے ذکر کی ضرورت ہے، تعلیم کے ذکر کی بھی ضرورت ہے اور عدل گستری کے انتظام کا ذکر بھی لازمی ہے اور بھی انتظامات تھے لیکن یہ تین چیزیں زیادہ اہم ہیں (اس لئے آئندہ تین ابواب ان موضوعات کے لئے مختص ہیں ___ مدیر)

7

نظامِ تعلیم

آج کا موضوع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نظامِ تعلیم اور علوم کی سرپرستی بہت اہم موضوع ہے۔ مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو علمی ترقیاں کیں اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے، اس کی اساس، ظاہر ہے عہد نبوی کی تیار کردہ بنیاد ہی ہو سکتی تھی۔

مواد بہت ہے، اس کی ترتیب و تدوین کا کام بھی آسان نہیں اور مجھے دعویٰ نہیں کہ مجھے ان ساری چیزوں کا علم ہو چکا ہے۔ ایک چیز سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں اور یہ ایک نہایت ولولہ انگیز چیز ہے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلا جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ ہے کہ "اقرأ باسم ربك الذی خلق ٥ خلق الانسان من علق ٥ اقرأ وربك الاکرم ٥ الذی علم بالقلم ٥ علم الانسان مالم یعلم ٥ ......" (۹۶:۱،۵)۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پہلے جملے میں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ایک حکم آتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بھی اس وحی میں بیان کر دی جاتی ہے یعنی یہ کہ قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا ضامن ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان وہ چیزیں سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی علوم اور دیگر مخلوقات خاص کر جانوروں کے علم میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ حیوانات کا علم محض جبلی علم ہوتا ہے اسی لیے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسانی علم صرف جبلی نہیں ہوتا اور اس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے آباء واجداد کے تجربوں سے

بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی تجربوں سے بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔اور یہ سارا علم اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

پہلی ہی وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کے بارے میں حکم دینا ایسی بات ہے، جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے نبی امی کو کیوں پہلے ہی حکم میں اس کی طرف متوجہ کیا گیا اور اس کے بعد جو تیئیس سالہ عرصہ گزارا، اس میں کچھ نہیں تو بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں جس میں علم کی تعریف اور علم کی اہمیت سمجھائی گئی ہے اور اس میں عجیب وغریب چیزیں نظر آتی ہیں مثلاً ایک طرف یہ کہا جائے گا: "و ما اوتیتم من العلم الاقلیلا" (۸۵:۱۷)[اور تمہیں علم نہ ملا مگر تھوڑا]۔دوسری طرف یہ بھی کہا گیا: "قل رب زدنی علماً" ۲۰:۱۱۴)[اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم زیادہ دے]۔اسی طرح کی شاید ایک ضرب المثل بھی مشہور ہے "اطلبوا العلم من المھد الی اللحد" [گہوارے سے قبر تک یعنی پیدا ہونے سے موت آنے تک علم سیکھتے رہو]۔

ایک اور چیز ہے جس کی صحت کے متعلق ہمارے محدثین ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے اعتراض کریں گے، لیکن بہر حال وہ بھی اثر انگیز چیز ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ علم سیکھو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔عقلی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مجھے اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔بہر حال اس سلسلے میں پہلا سوال ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چین کا علم کیسے ہوا؟ جب کہ عرب ایشیا کے انتہائی مغرب میں ہے اور چین، ایشیا کے انتہائی مشرق میں ہے اور ان دونوں ممالک میں کسی طرح کا کوئی ربط یا تعلق نظر نہیں آتا۔ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے علم ہوا کہ چین میں علوم وفنون پائے جاتے ہیں؟ سوال معقول ہے لیکن اگر ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور ہمیں اپنی علمی میراث سے ذرا زیادہ واقفیت ہو تو پھر یہ سوال باقی نہیں رہتا بلکہ خود بخود حل ہو جاتا ہے مثلاً "مسعودی" کی "مروج الذہب" (اُس کی مشہور کتاب ہے) کے نام سے ہمارا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔وہ بیان کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے چینی بصرہ تک آتے تھے بلکہ عمان تک بھی پہنچتے تھے اور یوں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے لیے چین اور چینی اجنبی نہیں تھے۔
اس سے بھی زیادہ قابلِ غور واقعہ ایک اور ہے کہ محمد بن حبیب البغدادی نے، جو ابن قتیبہ کا

بھی استاد ہے، اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے کہ ہر سال فلاں مہینے میں ''دباء'' نامی مقام پر ایک میلہ لگتا تھا جس میں شرکت کے لیے سمندر پار سے بھی لوگ آیا کرتے تھے ان لوگوں میں ایرانی بھی ہوتے تھے، چینی بھی ہوتے تھے، ہندی اور سندھی بھی ہوتے تھے، مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے، مغربی لوگ بھی ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دباء کی اہمیت کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کو یاد دلاؤں۔ جب عمان کا علاقہ اسلام قبول کرتا ہے تو عمان میں ایک گورنر ہوتا ہے، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور گورنر کا تقرر صرف بندرگاہ کے امور کے لیے فرماتے ہیں۔ اس سے اس مقام کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس انٹرنیشنل میلے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہوں گے، تجارتی جھگڑے، کاروباری معاملات وغیرہ۔ اس لیے عہد نبوی میں خصوصی افسر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان دو واقعات کے بعد مسند احمد بن حنبل پر نظر ڈالیے، جس کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسعودی کے بیان کے مطابق چینی تاجر اپنے جہازوں میں سمندری راستے سے عمان کے علاوہ ابلہ بلکہ بصرہ تک جاتے تھے۔ اس دوسری روایت میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ دباء نامی بندرگاہ میں، جو جزیرہ نمائے عرب کی دو سب سے بڑی بندرگاہوں میں سے ایک بندرگاہ تھی، ہر سال میلہ لگتا تھا، وہاں پر ہر سال چینی لوگ آتے تھے۔ ان دو چیزوں کو ذہن میں رکھ کے مسند احمد بن حنبل کو پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ، جو عمان و بحرین میں رہتے تھے، مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ ایک چھوٹی سی چیز پر آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں وہ یہ کہ اس میں بحرین کا جو لفظ آیا ہے، اس روایت میں اس سے مراد وہ بحرین نہیں ہے جسے ہم آج کل بحرین کہتے ہیں اور جو جزیرہ نمائے عرب میں خلیج فارس کے اندر واقع ہے۔ اس زمانے میں اس جزیرہ کا نام ''مساء اوال'' دیا جاتا تھا اور بحرین کا لفظ اس علاقے کو ظاہر کرتا تھا جسے آج کل ہم ''الدوماء'' اور ''الخطیف'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہرحال اس میں لکھا ہے کہ بحرین کے لوگ جن کا نام قبیلہ عبدالقیس ہے، اسلام لانے کے لیے مدینہ آتے ہیں۔ اس میں اس بات کی بھی تفصیل ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ مثلاً فلاں شخص ابھی زندہ ہے؟ یا کیا فلاں سردار

زندہ ہے؟ فلاں مقام کا کیا حال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سوالات کو سن کر وہ لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو ہم سے بھی زیادہ ہمارے ملک کے شہروں اور باشندوں سے واقف ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ ان لوگوں کے ایسے سوالات کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاؤں تمہارے ملک کو بہت عرصے تک روندتے رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں میں وہاں بہت دنوں تک مقیم رہا ہوں۔ اس صراحت کے بعد ہمیں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غالباً شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مالِ تجارت لے کر نہ صرف شام جاتے ہیں، جس کی صراحتیں موجود ہیں بلکہ مشرقی عرب کو بھی جاتے ہیں تاکہ دباء کے میلے میں شرکت کر سکیں اور کوئی تعجب نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں پر چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو اور ممکن ہے ان سے کچھ گفتگو بھی کی ہو۔ کیونکہ اگر چینی وہاں آیا کرتے تھے تو انہیں کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی آ جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ وہاں پر یقیناً ایسے مترجم ہوتے ہوں گے جو چینی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ بہر حال اس کا امکان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چینیوں سے ملاقات کی اور میرا گمان ہے کہ ان کے ریشمی سامان پر خاص کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہوئی ہو گی، کیونکہ چین کا ریشم نہایت ہی مشہور چیز تھی۔ ممکن ہے ان کی صنعت و حرفت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی اچھا تاثر لیا ہو اور ان سے پوچھا ہو کہ تمہارے ملک سے یہاں تک آنے میں کتنے دن لگتے ہیں اور مثلاً انہوں نے کہا ہو کہ چھ مہینے لگتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے یہ کافی تھا اور اس روشنی میں اب اس حدیث کو پڑھیے، علم سیکھو چاہے چین ہی جانا پڑے جو دنیا کا بعید ترین ملک ہے کیونکہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ غرض ان ابتدائی چیزوں کے عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ قرآن مجید و حدیث شریف میں علم حاصل کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے کیونکہ یہ انسانوں کے لیے نہایت مفید چیز ہے اور اسلام سے زیادہ فطری مذہب کونسا ہو سکتا ہے جو انسانوں کو ان کے فائدے کی چیز بتائے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے متعلق کیا کام کیا؟ کوئی مدرسہ قائم کیا یا مدرس مامور کیے؟ اس کا پتا چلنا آسان نہیں

ہے۔ غالباً ایسا ہوا بھی نہیں۔ لیکن ایک چیز قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ہمارے مؤرخین کے مطابق عربی زبان طویل عرصے تک صرف بولی جانے والی زبان رہی تھی، تحریری زبان نہیں تھی۔ لکھنے کا رواج مکہ معظمہ میں، حرب کے زمانے میں ہوا۔ یہ ابوسفیانؓ کے والد تھے یعنی یہ دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوجوانی کا دور ہے۔ جو لوگ آپؐ سے معمر تر تھے، شہر مکہ میں ان کے زمانے میں پہلی مرتبہ خط و کتابت ہونے لگی۔ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص عراق کے علاقے حیرہ سے وہاں آیا تھا۔ اس نے مکہ معظمہ میں حرب کی بیٹی سے شادی کی اور اظہار شکر گزاری کے لئے انہیں یہ راز بتلایا کہ ایسی کام کی باتیں، جنہیں تم بھول جاتے ہو اور جنہیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے، انہیں کسی طرح لکھ لیا کرو۔ یہ روایت ہمیں مختلف کتابوں میں ملتی ہے، مثلاً قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج اور اس کے شاگرد بلاذری کی فتوح البلدان وغیرہ میں۔ دوسرے الفاظ میں مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبوی سے کچھ ہی پہلے شروع ہوا تھا اور بلاذری کو تو اصرار ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز پر وہاں سترہ سے زیادہ آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ممکن ہے یہ مبالغہ ہو یا کسی خاص عہد کا ذکر ہو اور بعد میں اس صورت حال میں ترقی ہوئی ہو اور زیادہ لوگ لکھنا پڑھنا جان گئے ہوں لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، البتہ یہ امر ضرور قابل ذکر ہے کہ قبل از اسلام مکے میں عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ شفاء بنت عبداللہؓ جو حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں، ان کو لکھنا پڑھنا آتا تھا اور اسی واقفیت کے سبب سے بعد میں، جب وہ ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو، ابن حجر کے بیان کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ کے ایک بازار میں ایک عہدہ پر مامور کیا۔ چونکہ انہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا، اس لئے کوئی ایسا ہی کام ان کے سپرد کیا گیا ہوگا جس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہو۔ ایک امکان میرے ذہن میں آتا ہے کہ اس بازار میں عورتیں ہی سامان تجارت لاتی ہوں گی لہٰذا ان کی نگرانی، ان کی مدد اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی عورت ہی کو مامور کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال لکھنے پڑھنے کا رواج عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز کے زمانے میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے عرب کی سب سے پہلی لکھی جانے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس سے پہلے کوئی

کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔صرف چند ایک چیزیں ہیں مثلاً سبعہ معلقات، جن کو لکھ کر بطور اعزاز واحترام کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا۔اسی طرح دوسرے معاہدے بھی لکھے جاتے ہوں گے۔الفہرست میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ یا ایک کاغذ کا پرچہ تھا جس میں ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی۔لکھا ہے کہ عورتوں کے خط سے مشابہ تھا اور کہا ہے کہ وہ عبدالمطلبؓ کا خط تھا وغیرہ۔

ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہو رہا تھا اور ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ حیرہ سے آنے والا شخص وہی خط سکھائے گا جو حیرہ میں رائج ہے۔یہاں کی زبان میں کل چوبیس حرف ہیں جب کہ عربی میں حروف کی تعداد اٹھائیس ہے۔ظاہر ہے کہ حیرہ میں رائج خط اس زبان کے لئے ناکافی ہوگا۔اس کے علاوہ حیرہ میں رائج خط کے ذریعہ صرف نقطوں کی مدد سے عربی زبان کے تعداد میں زیادہ حروف میں امتیاز کرنا بھی دشوار تھا۔عربی زبان کے حروف میں امتیاز قائم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ مختلف حروف کے سلسلہ میں ایک نقطہ نیچے لگا کر ''ب'' بنائیں اور اسی حرف پر ایک نقطہ اوپر لگا کر ''ن'' بنائیں وغیرہ وغیرہ۔اس سلسلے میں خطیب البغدادی وغیرہ متعدد لوگوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ غالباً اس کوتاہی کو دور کرنے کا کام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا تھا۔روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ حضرت معاویہؓ نے ایک کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں کچھ لکھواتا ہوں، املا کراتا ہوں، اسے لکھو اور رقش کرو۔''غیان'' کہتا ہے کہ ''رقش'' کیا چیز ہے؟ وہ تبسم کر کے کہتے ہیں کہ میں ایک دن مدینہ منورہ میں تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حیثیت سے مجھے یاد فرمایا اور حکم دیا لکھو اور رقش کرو۔میں نے بھی پوچھا تھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رقش کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ حروف پر جہاں ضرورت ہو، نقطے لگاؤ۔اس چھوٹی سے روایت سے، جو ہمیں کئی کتابوں میں ملتی ہے، گمان ہوتا ہے کہ نقطے لگا کر حروف میں امتیاز پیدا کرنا بہت بعد کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہے۔ہمارے پرانے مؤرخوں کے ہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ اس کی تائید میں اب کچھ اور چیزیں بھی ہمیں مل گئی ہیں۔پہلی چیز یہ ہے کہ طائف کے مضافات میں ایک کتبہ ملا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں انہیں کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا، اس پر ایک کتبہ لگایا گیا۔ اس کتبے کے کئی حروف پر نقطے ہیں۔ یہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے، بعد کی جعل سازی نہیں ہو سکتی۔ اس کتبے کے سب حروف پر نقطے نہیں ہیں بلکہ صرف چند حروف پر ہیں۔ یہ ذرا پرانی دریافت تھی اب ایک اور نئی چیز ہمارے سامنے آئی ہے جو اس سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔ مصر میں کچھ پارچمنٹ دریافت ہوئے ہیں جن پر کچھ تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں حضرت عمرؓ کی خلافت ، ۲۲ ہجری کے زمانے کے دو خطوط ہیں۔ ان میں بھی نقطوں کا اہتمام نظر آتا ہے۔ یعنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ایک حد تک نقطے لگانے کا رواج تھا۔ اسے حجاج بن یوسف یا اس کے بھی بعد کی چیز قرار دینا درست نہیں۔

بہر حال خط کے سلسلے میں ایک طرف تو یہ بنیادی اصلاح ملتی ہے کہ حروف پر نقطے لگا کر ان میں امتیاز پیدا کرو۔ دوسری طرف کچھ اور حدیثیں بھی ملتی ہیں جو اگرچہ مسلم و بخاری جیسی کتبِ حدیث میں تو نہیں آئیں لیکن لائق توجہ ہیں۔ مثلاً ایک حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہے، جس میں آیا ہے کہ جب تم کوئی خط لکھو تو اسے فوراً تہہ نہ کرو بلکہ اس پر ریت ڈال کر پہلے اسے خشک کیا کرو، اس کے بعد اس کو بند کرو۔ یہ ایک عقل مندی کی بات ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی دلیل ہے۔ کیونکہ بعض وقت جلدی میں خط بند کر دیتے ہیں اور روشنائی گیلی رہتی ہے، جس کے باعث تحریر پر نشان پڑ جاتے ہیں اور وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز دلچسپ ہے جو ابن اثیر نے لکھی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم لکھو تو ''س'' کو ایک لمبے خط کی طرح نہ لکھو بلکہ اس میں شوشہ کا اہتمام کرو، ورنہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ ''بم'' ''ب'' اور ''م'' کا مجموعہ ہے یا ''س'' اور ''م'' کا۔ خط کے سلسلے میں یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک آخری بات پر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ جب ہجرت کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو ''صفہ'' کا مدرسہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں کے اور مدرسوں میں ایک مدرس لکھنے پڑھنے کا کام بھی جانتے تھے۔ اس کے سوا ان کا کوئی کام نہیں تھا۔ ان کا کام ہی طالب علموں کو خطاطی کی مشق کرانا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مدرس کی طرف توجہ رہتی۔

ہجرت سے پہلے مکے میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کی دو تین اور مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ مشہور صحیفہ ہے جس کے مطابق مکہ والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا بائیکاٹ کیا تھا کہ کوئی شخص نہ اپنی بیٹی نکاح کے لئے دے اور نہ کوئی ان کی بیٹی لے، نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچے اور نہ ان سے کچھ خرید کرے، حتی کہ ان سے بات چیت تک نہ کرے۔ اس معاہدے کو لکھ کر کعبہ کے اندر لٹکایا گیا تھا تاکہ اس پر سنجیدگی سے عمل کیا جائے۔ مزید صراحت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس معاہدے میں جو صرف مکے والوں نے کیا تھا، ایک مزید حصہ دار کے طور پر بنو کنانہ کے لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔ اس معاہدے کی طرف اشارہ کرنے والی، بخاری وغیرہ میں ایک حدیث بھی ملتی ہے۔ حجتہ الوداع یا شاید فتح مکہ کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم ایک ایسے مقام سے گزریں گے جہاں ایک زمانے میں ظلم کی اعانت کی گئی تھی۔ اس سے مراد یہی تھا کہ بنو کنانہ کے لوگ اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے خلاف کیے جانے والے معاہدے میں اہل مکہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آپ اس سے واقف ہیں کہ کس طرح، اس تحریر کے باوجود، دیمک چاٹنے کی وجہ سے یہ معاہدہ بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت تمیم الداری کے متعلق ہے۔ وہ ہجرت سے پہلے مکہ آ کر مسلمان ہوئے اور اپنی بہت سی داستانیں بھی سنائیں جن کا صحیح مسلم میں ذکر ہے، جن میں جہاز رانی وغیرہ کی کہانیوں کا ذکر ہے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے سیاحت کے دوران میں فلاں فلاں مقامات اور چیزیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ بہر حال انہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملک شام سے آ رہا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ جب مسلم سپاہ شام فتح کر لیں، اس وقت شام کے فلاں گاؤں جاگیر کے طور پر مجھے دے دیئے جائیں اور اس کے لئے آپ مجھے ابھی پروانہ دے دیجئے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط ہمیں ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر بیت مرطوم، جبرون، فلاں فلاں مقام فتح ہوں تو وہ تمیم الداری کو دے دیئے جائیں۔ یہ خط اصل ہے یا بعد میں تمیم الداری کی اولاد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے، اس سلسلے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ لیکن امام ابو یوسف کی

''کتاب الخراج'' میں اس کا ذکر ملتا ہے، اور یوں یہ تحریر و کتابت کی دوسری مثال ہمارے سامنے آتی ہے۔

ایک اور چیز کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو سراقہ بن مالکؓ کا واقعہ پیش آتا ہے، جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے اہل مکہ کے سپرد کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعض معجزات پیش آئے جن کے باعث سراقہ بن مالکؓ نے معافی مانگی۔ معافی حاصل کرنے اور مدینہ کی جانب سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سہولت کی خاطر اپنے علاقے سے گزرتے ہوئے بعض آسانیاں فراہم کرنے کی پیش کش کے بعد سراقہ بن مالکؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مجھے ایک پروانہ امن دے دیجیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہؓ کو حکم دیتے ہیں کہ ایک پروانہ امن لکھو۔ گویا سفر میں آپ کے ہمراہ اور چیزوں کے علاوہ قلم، دوات اور کاغذ بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج ترقی کرنے لگا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اہمیت سے خاص کر واقف تھے۔ مدینہ آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام عبادت گاہ کی تعمیر کے سلسلے میں کیا۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''قباء'' میں پہنچے تو یہاں پر ایک مسجد بنائی گئی۔ جب قباء سے نکل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنونجار کے علاقے میں آئے تو وہاں پر مسجد نبوی کی تعمیر ہونے لگی۔

اس مسجد کی تعمیر میں کچھ عرصہ لگا۔ لیکن یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مسجد کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ اسی مقام کو ہم ''صفہ'' کا نام دیتے ہیں۔ صفہ پلیٹ فارم، ڈائس یا بلند مقام کو کہتے ہیں۔ یہ مقام اس غرض کے لئے مخصوص کیا گیا کہ دن کو درسگاہ کا کام دے اور رات کو ان لوگوں کے لئے جن کا کوئی گھر نہیں ہے، سونے کا کام دے۔

ایک زمانے میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کے سلسلے میں مجھے تمنا ہوئی کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی تھی، اس کا نقشہ بناؤں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس امر میں ایک الجھن پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر ہوئی تو قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا اور کچھ عرصہ، شاید ۱۷ ماہ بعد جیسا کہ تاریخ میں ذکر

آتا ہے، قبلہ کعبۃ اللہ قرار پایا، جس کے بعد مسجد میں تبدیلی ضروری تھی۔ یوں اگر آج مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صفہ کا مقام قبلہ کے جنوب میں نظر آتا ہے تو عہد نبوی یعنی ہجرت کے ابتدائی ایام میں شمال میں ہونا چاہیئے اور جب قبلہ کا رخ بدلا تو صفہ جو مسجد کے پچھلے حصے میں تھا، سامنے کے حصے میں آ گیا۔ اس لئے اسے ختم کر دیا گیا اور وہاں نماز پڑھی جانے لگی، جب کہ وہ حصہ جہاں پہلے نماز ہوتی تھی وہ پچھلے حصے میں آ گیا اور وہاں نئے سرے سے ''صفہ'' بنایا گیا۔

یہ ''صفہ'' جیسا کہ میں نے گزشتہ لیکچروں میں اشارہ کیا، وہ مقام ہے، جسے موجودہ زبان میں "Residential University" کہتے ہیں یعنی طلباء کے رہنے کا بھی انتظام ہے اور تعلیم کا بھی۔ رہنے کے سلسلے میں ہمیں کئی اور وضاحتیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ اہل مدینہ اپنی انتہائی فیاضی کے باعث یہ کرتے کہ جب انصار کی کھجوروں کی فصل تیار ہوتی تو ہر شخص کھجوروں کا ایک ایک خوشہ تحفے کے طور پر لاتا اور اسے مسجد نبوی کے اندر ''صفہ'' میں لٹکا دیتا۔ جب کوئی کھجور پک کر گرتی تو صفہ میں رہنے والے غریب مسلمان اسے کھاتے۔ ان خوشوں کی حفاظت کے لئے بھی ایک شخص مقرر کیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ جب اپنی انتہائی فیاضی کے سبب مقروض ہو گئے اور قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں انہیں اپنا مکان تک فروخت کر دینا پڑا، تو انہیں بھی رہنے کے لئے ''صفہ'' میں جگہ دی گئی اور علاوہ اور چیزوں کے ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ ان خوشوں کی نگرانی کریں۔ بہر حال آپ Residential University کا بھاری بھرکم لفظ قبول کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صفہ میں تعلیم پانے والے طالب علم دو قسم کے تھے۔ کچھ تو وہ تھے جو شہر میں رہتے تھے اور پڑھ کر چلے جاتے تھے، لیکن کچھ ایسے تھے جن کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتے تھے۔ ان کی تعداد ظاہر ہے گھٹتی بڑھتی رہتی ہوگی۔ ان طالب علموں میں ہمیں حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوگا کہ حضرت عمرؓ کے بیٹے ''صفہ'' میں کیوں رہتے تھے؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے مواخاتی بھائی کے ہاں قیام کیا ہوگا اور ان کے ہاں اتنی جگہ نہ ہوگی، کہ ان کے مواخاتی بھائی اور ان کے خاندان کے ساتھ حضرت عمرؓ اپنی بیوی کے علاوہ اپنے جوان اور

بالغ بیٹے کو بھی جگہ دلا سکیں۔ ان حالات میں ایک دوسری تاویل یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خود علم کے شوق کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ قباء میں رہیں جو مدینہ سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ آنے جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ سارا وقت وہ مدینے میں گزارنا چاہتے ہوں گے تاکہ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ سے استفادہ کرسکیں۔ بہرحال وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جو صرف دن کو تعلیم پاتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو تعلیم بھی پاتے تھے اور رات کو رہتے بھی تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کچھ تو ان چیزوں پر بسر اوقات کرتے تھے، جو انہیں بطور تحفہ دی جاتی تھیں، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے، کبھی مختلف صحابہ کرامؓ کی فیاضیوں کے باعث۔ مثلاً ایک بار کا ذکر ہے کہ اہل صفہ کے اسی (۸۰) آدمیوں کو حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک دن اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اس سے دو چیزیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو وہ تعداد جو کم و بیش صفہ میں موجود ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان کے گزر بسر کا کیا انتظام تھا اور وہ کس طرح کھاتے پیتے تھے۔ ان دو باتوں کے علاوہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے سرکاری خزانے سے انتظام فرماتے اور صحابہ کرامؓ کی فیاضی کے سبب ان کو مختلف اشیاء ملتیں، ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت کرتے تھے۔ یہ محنت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ پیسے جمع کرسکیں یا مالدار بنیں بلکہ صرف اس لئے کہ اپنا رزق حاصل کریں اور باقی پورا وقت علم کے حصول میں صرف کریں۔ ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ صفہ میں رہنے والے ایک طالب علم کی وفات ہوئی۔ جب اسے غسل دیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے پاس دو دینار ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بہت ناراض ہوئے کہ ایسے شخص کو، جس کے پاس دو دینار جیسی خطیر رقم تھی، خیرات پر پرورش پانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بہرحال انسانی فطرت کی ایسی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔

صفہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم تھی، جس کے لئے میں "Primitive" کا لفظ استعمال کرسکتا ہوں۔ مدرسہ میں جن چیزوں کی تعلیم ہوتی تھی، اس میں متعدد شعبے، متعدد لوگوں کے سپرد تھے۔ کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سکھائے، کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ جو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں، انہیں اس وقت تک کی نازل شدہ قرآنی

آیات سکھائیں۔ شاید کسی شخص کا یہ کام بھی ہو کہ وہ فقہی احکام، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نماز وعبادات وغیرہ کا درس دے۔ یہ اہتمام خاص طور پر ان لوگوں کے لئے کیا جاتا ہوگا جو وقتاً فوقتاً کچھ عرصے کے لئے مدینے آتے ہوں گے تاکہ اپنے نئے دین کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک حدیث کا ذکر کیا جو عبدالقیس کے لوگوں کی مدینہ آمد سے متعلق تھی۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انصار کے سپرد کر دیا کہ تم ان لوگوں کی مہمان نوازی کرو۔ صبح کو ان لوگوں سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ تمہارے میز بانوں نے کیسا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے ہمیں کھانے کے لئے نرم روٹی اور سونے کے لئے نرم بستر دیے اور صبح کو انہوں نے عبادت کے طریقے، قرآن شریف کی سورتیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق چیزیں سکھائیں۔ یہ اسی کی بناپر تھا جو میں نے آپ سے عرض کیا کہ صفہ میں تعلیم کے مختلف شعبے تھے۔ ایک چیز کا امکان ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا کہ وقتاً فوقتاً خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو درس دیتے ہوں گے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی فرصت ملتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں درس دیا کرتے تھے اور بہت سے لوگ جنہیں فرصت ہوتی، اس درس میں شریک ہو جاتے۔ ایک دلچسپ حدیث ہے کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر اذکار کرنے میں مشغول تھا۔ دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں لیکن وہ گروہ بہتر ہے۔ جو تعلیم کا کام کر رہا ہے۔ پھر آپ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ بھی روایت ملتی ہے کہ صفہ کے بعد جلد ہی اور مدرسے قائم ہوئے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینے میں عہد نبوی میں نو مساجد تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے محلے کی مسجد میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو۔ سب کے سب مرکزی مسجد میں نہ آیا کریں کیونکہ اس طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، جس سے سب کی تعلیم متاثر ہوتی اور ناکافی اساتذہ کے باعث بچوں کے تعلیم پانے کا موقعہ نہ مل سکتا۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ

تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو باہر بھی بھیجا کرتے تھے۔ غالباً ایسا ان علاقوں کے لئے ہوتا ہوگا جہاں کے باشندے رفتہ رفتہ مسلمان ہوتے گئے اور مسلمان ہونے کے بعد مطالبہ کرتے کہ ہماری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ غالباً کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ایسا ہی ایک واقعہ ہجرت سے قبل بھی پیش آیا تھا، جب خود مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک معلم دیا جائے تو مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا گیا اور وہ اہل مدینہ کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد آتی ہے۔ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ میں مسلمان ہونے والے اہل مدینہ کو اس وقت تک نازل شدہ قرآن شریف کا ایک تحریری نسخہ بھی دیا تھا جسے وہ اپنے محلے کی مسجد میں باآواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے مورخ اس میں یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ مسجد میں باآواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا آغاز پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں ان انصار سے ہوا تھا۔

غرض ایک طرف ہمیں ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان تر ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ جنگ بدر میں بہت سے کافر قیدی ہوئے۔ ان قیدیوں میں سے جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مالی فدیہ طلب کرنے کی بجائے، یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ تعلیم کے انتظامات کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل غور ہے۔ اسی طرح ایک اور بات پر غور کرنے اور اس سے نتائج استنباط کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق جب حضرت معاذ بن جبل یا عمرو بن حزم کو (نام مجھے ٹھیک سے یاد نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ان کا فریضہ یہ تھا کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں اور ایک کمشنری سے دوسری کمشنری میں جائیں اور وہاں تعلیم کا انتظام کریں۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کی تقرری کے وقت، ان کو جو ہدایت نامہ دیا گیا، اسے بھی تاریخ نے

محفوظ کر لیا۔ اس میں ہمیں ٹیکس، انتظامی معاملات اور عدل و انصاف وغیرہ کے متعلق ہدایات کے علاوہ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرو۔ گویا گورنر کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اپنی حدود (jurisdiction) کے دائرے میں رہنے والے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اسلامی تعلیم ہی ہوگی اور اس کا انتظام صرف مسلمانوں کے لئے کیا جاتا ہوگا، کیونکہ غیر مسلموں کی تعلیم کی بوجوہ ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن مجید کے احکام کے مطابق تمام مذہبی گروہوں کو کامل داخلی خودمختاری عطا کی گئی تھی۔ جس طرح غیر مسلم اس خودمختاری کی بنا پر اپنے دیگر معاملات میں آزاد تھے، اسی طرح تعلیم کی صورت بھی رہی ہوگی۔ ان حالات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی تعلیم کا انتظام اسلامی حکومت کرتی تھی یا نہیں۔ اگر وہ کرتی ہو اس میں کوئی امر مانع بھی نہیں تھا لیکن چونکہ عہد نبوی میں اس خصوصی نظام کے تحت ہر اقلیت کو کامل داخلی خودمختاری عطا کی گئی تھی، اس لیے انہیں اپنی تعلیم کی بھی آزادی تھی اور وہ خود اسے بہتر طور پر انجام بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک عیسائی بچے کو اسلامی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم دینے والا عالم تو مل جائے گا لیکن انجیل پڑھانے والا استاد میسر نہیں آسکے گا۔ اس لیے اُن کے حق میں یہی بات زیادہ سودمند تھی کہ اُن کا مدرسہ ہی الگ ہو اور وہ اپنے مذہب کی تعلیم اپنے ہی اساتذہ کی مدد سے حاصل کریں۔

اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھی یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کسی علمی مسئلے کے سلسلے میں جھگڑا بھی کرتے۔ اس سے جو بعض نہایت کارآمد نتائج نکلتے ہیں اُن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک مرتبہ یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نوجوان جوڑے کو لائے اور کہا کہ ہم نے ان لوگوں کو قابل اعتراض حالت میں پایا ہے، آپ کے پاس لائے ہیں تاکہ آپ انہیں سزا دیں۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بجائے اپنی صوابدید کا فیصلہ کرنے یا اسلامی قانون نافذ کرنے کے خود ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری دینی کتاب توریت میں اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟ انہوں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ توریت کا حکم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا منہ کالا کر کے انہیں اس طرح گدھے پر بٹھایا جائے کہ ان کے منہ گدھے کی دم کی طرف ہوں، پھر سارے شہر میں ان کی تشہیر کرائی

جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایسا نہیں ہے۔ توریت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ توریت لاؤ۔ چنانچہ توریت لائی گئی۔ اس میں رجم کی سزا نکلی اور اس کے مطابق مجرموں کو رجم کرایا گیا۔ اس کے متعلق مزید لکھا ہے کہ توریت کو پہلے ایک یہودی نے پڑھا اور اُس آیت کو چھوڑ دیا جس میں رجم کا ذکر تھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن سلام نے، جو ایک نومسلم یہودی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس امر پر منعطف کرائی کہ یہاں کچھ اور آیات بھی ہیں جنہیں یہ چھپا رہا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ عبرانی رسم الخط سیکھو کیونکہ مجھے آئے دن یہودیوں سے خط و کتابت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ایسی تحریروں کو میں یہودیوں سے پڑھوا کر سنوں تو مجھے ان پر اعتبار نہیں، اس لیے تم خود سیکھ لو۔ دوسرے لفظوں میں اجنبی زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ فرمائی۔ دوسری زبانوں کے سیکھنے سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور علمی فوائد بھی۔ علمی فائدے کے متعلق ایک واقعہ ذہن میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، جو اپنے باپ سے پہلے مسلمان ہوئے، نہایت ذہین، دیندار اور متقی نوجوان تھے۔ ساری ساری رات نفل نمازیں پڑھتے۔ انہوں نے روزانہ روزہ رکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ یہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں دو انگلیاں چوس رہا ہوں۔ ایک سے تو شہد نکل رہا ہے اور دوسری سے دودھ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید اور توریت دونوں سے استفادہ کر سکو گے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بعد کے زمانے میں انہوں نے سریانی زبان کی بھی تعلیم پائی اور بائبل کا ترجمہ سریانی زبان میں پڑھتے۔ اسی طرح ایک دن وہ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے اور دوسرے دن توریت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ غرض اجنبی زبانیں سیکھنے کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو چلا تھا۔ لکھا ہے کہ زید بن ثابتؓ کو چار یا پانچ زبانیں آتی تھیں۔ عربی تو اُن کی مادری زبان تھی ہی، اس کے علاوہ انہیں عبرانی، قبطی اور فارسی زبانیں آتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ جملہ لکھا ہے کہ انہوں نے فارسی زبان بہت جلد اُس وقت سیکھ لی، جب ایک ایرانی وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یمن سے آیا۔ یہ وفد کچھ دن مدینے میں مقیم رہا۔ ان

لوگوں سے قریبی روابط کے باعث زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنی فارسی سیکھ لی کہ اس زبان میں روزمرہ کی گفتگو کر سکیں، ان کی ضرورتیں معلوم کر سکیں اور ان کے مختلف سوالوں کے جواب دے سکیں۔ بہرحال تعلیم کے متعلق ایک طرف اُن انتظامات کا پتہ چلتا ہے جو دارالسلطنت مدینہ منورہ میں کیے گئے، دوسرے وہ انتظامات ہیں جو اُن علاقوں کے لوگوں کو دین سے واقف کرانے کے لیے کیے گئے جو بہت تیزی سے اسلامی سلطنت میں شامل ہو رہے تھے۔

تعلیم کے متعلق ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ ویسے یہ میرا استنباط ہے، اس کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف علوم کی اہمیت سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ ان کے لیے الگ الگ درسی کتابوں کی بجائے ایک ہی درسی کتاب دینا پسند فرماتے اور چاہتے ہیں کہ ایک ہی شخص اس درسی کتاب کو ہمیشہ پڑھتا رہے، چاہے اس فن کی چیزوں سے اس کو دلچسپی ہے کہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص قرآن مجید کو بار بار پڑھے تو وہ اپنے فن کی چیزوں کو بھی پڑھے گا اور مجبور ہوگا کہ غیر فن کی چیزوں کو بھی، خواہ سرسری نظر ہی سے سہی، پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایسی معلومات، جو اگرچہ اس کے فن سے متعلق نہیں ہیں، کسی بھی وقت سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اس میں بے شمار علوم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں صرف دین و عقائد، عبادات اور متعلقہ اخلاقی چیزوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں اور علوم بھی نظر آتے ہیں۔ اگر میں توریت کو بنی اسرائیل کی تاریخ کہوں تو اس میں پہلے تمہیدی باب کے بعد، جس میں حضرت آدم علیہ السلام تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں، باقی سب چیزیں صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اسی طرح آپ انجیل کو پڑھیں تو وہ ایک ہی شخص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید نہ تو عرب کی تاریخ ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری، بلکہ پوری بنی آدم کی تاریخ ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار بادشاہوں، نبیوں اور قوموں کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ ان گزشتہ لوگوں کے اچھے یا بُرے انجام کو سامنے رکھ کر پوری ذمہ

داری کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ میں اُن مقامات کا شمار کروں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں مصر، بابل اور یمن وغیرہ کے علاوہ بہت سے ملکوں کا ذکر ہے۔ اس میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا ہے جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغمبر حضرت ذوالکفل ہیں۔ ان کے متعلق قرآن و حدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے۔ بعض محدثین ومفسرین نے اس سلسلے میں اگرچہ لکھا ہے، لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل ''کپل وستو'' کی معرب شکل ہے۔ یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوتے تھے۔ اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورۃ ''والتین'' کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ ''والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین'' میں تمام مفسرین کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو جبل زیتون سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں خدا جل شانہٗ نے انہیں توریت عطا کی۔ ''ہذا البلد الامین'' یعنی محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ لیکن پہلا لفظ ''والتین'' کیا ہے؟ اس میں مفسرین خیال آرائی کرتے رہے ہے۔ بعض لوگوں نے کہا، اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بعض نے اس سے کسی اور نبی کی جانب اشارہ مراد لیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگیوں میں انجیر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا ذکر ہے، وہاں

بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا۔

بہر حال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں۔ اس میں تاریخ

کا بھی ذکر ہے۔ اس میں اُن علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں، مثلاً علم نباتات، علم ہیئت اور ٹکنالوجی، یہاں تک کہ علم جنس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن شریف میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا اس جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے۔ میں نے کسی وقت آپ سے بیان کیا تھا کہ دو سال قبل پیرس میں ایک کتاب "Bible, Quran and Science" آئی ہے جو ایک مشہور سرجن ڈیکائی کی تصنیف ہے۔ ڈیکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں، اُن کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطباء کو تھا اور نہ زمانۂ حال کے یورپی لوگوں کو ہے، جنہوں نے سالہا سال تک اس موضوع پر ریسرچ کی۔ لیکن اب سے چودہ سو سال قبل، ایک بدوی اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہئے۔ قرآن کی اسی بات سے متاثر ہو کر اب سے دو ماہ پہلے ڈیکائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہمیں بیالوجی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حیوانات اور موتیوں کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

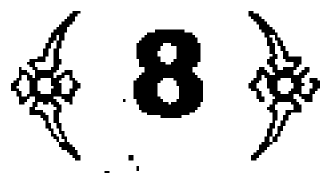
میرا گمان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو کچھ تو تعلیم بنیادی دی جائے جو لازمی ہے اور دیگر علوم کے بارے میں بھی اُس کے پاس کچھ نہ کچھ معلومات ہوں جو کسی بھی وقت اُس کے کام آسکتی ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ قرآن مجید کو پڑھو، کیونکہ اس میں تقریباً تمام علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجھے اپنے اس لیکچر کو اب یہیں روکنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر معلومات عہد نبوی کے تعلیمی انتظامات کے متعلق کافی ہیں۔ اب صرف ایک چھوٹا سا جز باقی ہے اور وہ عہد نبوی میں علوم کی سرپرستی سے متعلق ہے، جس کے بارے میں کچھ زیادہ آپ سے عرض نہیں کر سکوں گا، صرف چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔

عہد نبوی میں علوم وفنون زیادہ نہیں تھے لیکن جو فنون تھے، ترقی پذیر تھے اور ان کی ضرورت بھی تھی۔ ان میں سے ایک چیز طبابت ہے۔ اس کے متعلق ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ عہد نبوی میں طبیبوں کی حالت اور جراحی کرنے والے سرجنوں کے حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ایک حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی بیمار

ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمہارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان میں سے جو ماہر تر ہو اسے بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس بات کا خیال رکھا کہ Specialisation پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں۔ اس سے لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طبابت سے ناواقف شخص کو اس کی اجازت دینا نہیں چاہتے کہ وہ طبیب بن جائے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جس شخص کو علم طب سے کوئی واقفیت نہیں، اگر وہ علاج کرے تو اسے سزا دی جائے گی، کیونکہ اس کے اناڑی پن سے لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور علاج سادہ مفردات کے ذریعے ہوتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے شمار نسخے منسوب ہیں۔ لوگ آکر آپؐ سے کہتے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ تکلیف ہے تو آپ اس کے لیے تجویز فرماتے کہ فلاں چیز استعمال کرو وغیرہ۔ اب طب نبوی کا پورے کا پورا نظام اس طرح کی احادیث پر مشتمل ہو کر بن چکا ہے۔ زیادہ نہیں تو پندرہ بیس کتابیں میں دیکھ چکا ہوں۔

دوسرا علم جس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے، علم ہیئت ہے۔ اس کے فوائد خود قرآن حکیم میں بھی بتائے گئے ہیں۔ اس علم کے ذریعے رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ اوقات کا اور حج کے زمانے کا تعین ہوگا۔ علم ہیئت کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی اچھی واقفیت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی یا مسجد قباء تعمیر کی گئی تو قبلہ کے رُخ کا سوال تھا۔ محض اندازے کی بنا پر قبلے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علم ہیئت سے واقفیت کی بنا پر کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے کئی بار گزر چکے تھے۔ تجارت کے لیے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بصرہ تشریف لے گئے تو بیت المقدس سے بھی آگے تک گئے تھے۔ یہ سارا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا اور زیادہ تر

رات کے وقت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے تجربات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف جانے والوں کو کس ستارے کی مدد سے آگے بڑھنا چاہئے۔ اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی معلوم تھا کہ کس ستارے کی مدد سے رات کے وقت بیت المقدس سے مکے اور مدینے جانے والوں کو اپنا سفر کرنا چاہئے۔ اس علم کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی خاص دشواری کے قبلہ کے رُخ کا تعین فرمالیا۔ اس طرح کی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو علم ہیئت سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کا احادیث میں بھی ذکر ملتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنے انساب سیکھنے چاہئیں یعنی اپنے شجرہائے نسب معلوم کرنے چاہئیں۔ ان کی ایک عملی اہمیت یہ بھی ہے کہ کوئی محرم سے نکاح نہ کرے۔ عرب کے قبائلی نظام میں جس میں فلاں بن فلاں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، اس بات کی خاص اہمیت تھی۔ اس طرح کی چیزیں صرف تاریخی معلومات ہی کے لیے نہیں بلکہ دیگر امور کے لیے بھی کارآمد ہوسکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی میں کچھ علوم پائے جاتے تھے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرپرستی فرماتے تھے اور کچھ چیزیں مثلاً عسکریات وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کو ترغیب وتشویق دلاتے تھے۔ اسی پر میں آج کا موضوع ختم کرتا ہوں۔



8

نظامِ عدلیہ

ایک قابلِ ذکر بات، اسلامی قانون سازی کو ایک ایسا وسیلہ عطا کرنے کے متعلق ہے کہ وہ قیامت تک زندہ رہ سکے۔ یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہاء جو چار اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں اجماع عہد نبوی میں نہیں پایا جاتا۔ قیاس جس کو ہم اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، وہ عہد نبوی میں ہی وجود میں آچکا تھا، اور یہ عہد نبوی کے آخری زمانے کا واقعہ ہے۔ ۹ ہجری یعنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں ایک صحابیؓ کو قاضی بنا کر روانہ کیا۔ اُن کا نام معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ اُس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کر دیا جائے تو جانے سے پہلے آخر باریابی، آخری ملاقات کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُسے آخری ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا "فبما تحکم" (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے) ان کا جواب تھا "بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق)۔ قرآن میں جو احکام ہوں گے، ان کا نفاذ کروں گا، ان کی تعمیل کراؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فان لم تجد" (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً کہا "فبسنة رسول اللہ"۔ اس صورت کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا۔ لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے تو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے الفاظ یہ تھے "اجتھد برأی ولا آل جھداً" میں اپنی رائے کے ذریعے سے کوشش کروں گا (نیا حل تلاش کرنے کی) اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا"۔ دوسرے الفاظ میں میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم دوں گا، اور ایسی چیز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا جو میری دانست میں اللہ کو پسند ہو، معقول ہو اور عدل وانصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف کہتے ہیں: اے اللہ تو نے اپنے رسول کے رسول کو جس چیز کی ہدایت دی ہے، اس پر تیرا رسول خوش ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن وحدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اُسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن وحدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ، کوئی حکم پیش نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

اجتہاد کے ذریعے سے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خاص اس چیز کے لیے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لیے حکم ہے۔ فرض کیجیے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ تو ہمارا مجتہد قیاس کرے گا۔ چونکہ ایک قسم کی چوری کے لیے حکم ہے تو ایک دوسری قسم کی چوری میں بھی ہم اسی قسم کا استدلال کر سکتے ہیں۔ یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق توجہ سے کوئی دوسرا ہی قانون مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق توجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون کو بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیش نظر ہوتا ہے: وہ یہ کہ امت کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ فائدہ ہونا چاہیے لیکن اُمت کی فلاح، اُمت کی بہبودی، اور آسانی کے لیے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے اس کے لیے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے

مختلف لطیف فرق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہد نبوی سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث، خاص طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑتا ہے، جو قانون سازی کا ایک جز ہے۔ فرض کیجیے کہ قرآن و حدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی اجتہاد کر کے ایک حکم دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے، اس لیے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث وضع قانون کی صورت اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس فیصلے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچی یا یہ کہ فریق مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو فوراً اس گورنر یا قاضی کو ہدایت کی جائے گی، کہ یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف گورنروں کو ہدایتیں بھیجیں کہ یوں نہیں یوں کیا کرو۔ ایک مثال ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خون بہا میں سے اُس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے۔ خون بہا کو وراثت قرار دیا گیا۔ وراثت کی صورت میں بیوی کے، بیٹے کے، بیٹی کے، ماں، باپ کے یعنی ہر ایک کے قرآن میں حصے مقرر کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح خون بہا میں بھی اسی تناسب کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھی۔

اجماع کا قاعدہ عہد نبوی میں ناممکن تھا، وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس و

اجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔ ایسے قانون کو جس پر سب علماء متفق ہو جائیں، لازماً زیادہ قابل قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن کم از کم حنفی فقہا کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابل تبدیل نہیں ہے، بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ایک نبی کے احکام کو دوسرا نبی منسوخ کر سکتا ہے، اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک قدیم اجماع کو بدل کر دوسرا جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے خاص امام ابو یوسف البزدوی کی ہے۔ اصول فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ یہ قانون خدا جل شانہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں ہے، اس لیے اس کے ہمیشہ کے لیے پابند نہ ہو جائیں، بدلنے والے حالات کے تحت، بدلنے والی ضرورتوں کے تحت، ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے قانون کے ذریعے بدل سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی لیکن اس قاعدے کے تحت جو امام بزدوی نے بیان کیا ہے، اولاً کسی نہ کسی کو پرانے اجماع کے خلاف زبان کھولنی پڑے گی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہا اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے۔ جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

اب اپنے موضوع کے دوسرے جز پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہد نبوی کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کے اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عدل گستری کا کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہد نبوی میں کیا انقلاب آیا، کیا کایا پلٹ ہو گئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے۔ زمانۂ جاہلیت عرب میں کوئی حکمران، کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لیے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے

کا کوئی امکان نہیں تھا، مظلوم کیا کرے، ''دست خود بدھان خود'' ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اپنے ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی تر ہو تو کمزور کے لیے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورت حال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدھم روشنی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ کچھ کم ظالم شخص دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکم عدالت بنا لیا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔ اس کی کچھ مثالیں زمانۂ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ اس میلے کے لیے ایسے حکم مقرر کیے جاتے تھے جو دو تین دن کے لیے عارضی طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا، اس وقت تک اُن کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے، اُن کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون حَکَم ہے۔ اس لیے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حَکَم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے۔ میلے کے حَکَم کے پاس جاتے، اس سے اپنا فیصلہ کراتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں، اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے تو ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے تین چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکمِ عدالت خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ دوسری فوجداری عدالت، ان دونوں کے علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے حلف الفضول کا نام دیا گیا ہے۔ یہ Order of Chivalry کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے، جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعتاً ابوجہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم بنائی جس میں مکہ والوں کو گالیاں دیں۔ ابوجہل نے تو کوئی پروا نہ کی لیکن دوسرے اہل مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انہوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیئے کہ رضا کارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب کبھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہل مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک

کہ اسے انصاف نہ دلایا جائے۔

جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے کوئی امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا دستور مدون فرمایا اور دنیا کا پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا۔ اس میں ایک عجیب و غریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے انفرادی کے مرکزی شے ہوگی یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست فرد کو سزا نہیں دے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکم عدالت بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا اور ظالم کو رو داد دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ چاہے اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں، اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ انصاف کے لئے پورا تعاون کرے۔ اور کسی ظالم کو نہ بچائے، چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم دیا گیا۔ اور "انصاف" جو وہاں انفرادی کام تھا اس کو ایک مرکزی اور حکومتی چیز قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے، انسٹی ٹیوشن قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں، جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ایک مفتی کا انسٹیٹیوشن ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں۔ قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہد نبوی میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے۔ لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا بر سر موقعہ جا کر، حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ ﷺ ہی کا فیصلہ ہوتا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ

کے نمائندے نے رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاصی اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا تھا، مہاجرین میں جو بہت ذہین تھے اور قانونی نقطۂ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں ''لیکن کس اساس پر''؟ رسول اللہ ﷺ ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو انصاف رسانی اور حق وعدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو تمہارا فیصلہ اصولاً غلط ہوگا۔ اگر ناانصافی ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوئی ہو تو تمہاری حسن نیت کی وجہ سے تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا، تو ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہد نبوی ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوشش کی تھی اور چالیس ممبروں کی ایک اکیڈمی بنائی تھی، جس نے اسلامی قانون کو مدون کیا، اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا۔ ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو، ایک قاضی ''الف'' ایک فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی ''ب'' دوسرا فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام ''رسالۃ الصحابہ'' ہے، اور یہ ابن المقفع کا خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصور کے نام لکھا تھا اور اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ امیر المومنین ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیے دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے میں سزائے موت نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں، ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے، دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ تو ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟ ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے، جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصور نے بھی اسے رد کر دیا۔ لیکن بظاہر معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ امیر المومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے

فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنی اپنی دلیلوں کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیر المومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور خلیفہ کا حکم بعد میں سارے قاضیوں کے لئے واجب التعمیل ہو جائے گا۔ اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی۔ اور کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہو یا دو مختلف نظریے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہیے، تو صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیر المومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اور اس طرح سارے ملک میں ایک قانون بن جائے گا۔ لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بنا پر یا کسی اور وجہ سے مقفع کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہر حال میں نے آپ سے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک tradition یہ رہی ہے کہ عہد نبوی سے لے کر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصور اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست کے تابع ہو جاتی، خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور بُرے بھی۔ آئے دن قانون بدلتے رہتے۔ ایک پرانے قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون حکومت اور سیاست کے عمل دخل سے آزاد ہے تو تمام فقہا مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے۔

یہ تھیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں قانون سازی کا کیا طریقہ تھا؟ اور عہد نبوی میں عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا؟ عہد نبوی میں صوبجات و اضلاع مثلاً یمن میں بہت سے قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابو موسیٰ الاشعری کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ میں تمہیں فلاں فرض کے لئے مامور کرتا ہوں۔ تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جز میں پائی جانے والی مملکت مدینہ پر ہی نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔



نظامِ مالیہ

ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عام مہاجرین کی بے روزگاری اور ان کی مصیبت زدگی کا ازالہ کیا گیا اور مواخات کے ذریعے سے مدنی مسلمانوں کے خاندانوں کو ان مکی مہاجرین کے خاندانوں میں ضم کر کے ان دو خاندانوں کو ایک خاندان بنایا گیا۔ یہ خاندان مشترکہ طور پر کمائی کرتے تھے اور رہتے تھے۔ اب یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بسر بود کس طرح کیا کرتے تھے اور ان کے وسائل آمدنی کیا تھے؟ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک مستشرق جو سویڈن کا ہے لکھتا ہے کہ ابتداءً مسلمان نہایت ہی غریب تھے، لہٰذا لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجیں بھیجتے تاکہ قافلوں کو لوٹ لیں کیونکہ وہ مجبور تھے اور ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ بیان اسلام کے بارے میں بہت سخت اعتراض کا ہے کہ دوسروں سے تو وہ کہتا ہے کہ انصاف کرو اور اپنے آپ کو ہر چیز کا مجاز سمجھتا ہے۔ لیکن اس اعتراض میں صداقت نہیں۔ مسلمانانِ مدینہ کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے وسائل تھے۔ ان کی زمینیں تھیں اور وہ کاشت وزراعت کرتے تھے۔ مکی مہاجرین جو آئے تھے وہ بھی اس کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ لوگ تجارت کرنے لگے، کچھ لوگ جو مثلاً حرفت پیشہ تھے، جوتے وغیرہ بنانے لگے اور کچھ نجاری وصناعی وغیرہ کرنے لگے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عام طور پر ہماری تاریخی کتابوں میں کم ذکر ملتا ہے، اس لیے ابتداء میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو ابتدا میں شہر کے جنوبی حصہ ''قبا'' میں قیام فرمایا۔ بعض روایات کے مطابق وہ تین ہفتے وہاں مقیم رہے مگر میں ایک مورخ کی بیان کردہ روایت کو شخصاً ترجیح دیتا ہوں۔ وہ صرف چار دن کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔ دو شنبے کے دن وہاں پہنچے اور جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپ مدینہ کی طرف یعنی موجودہ مسجد نبوی کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا دن تھا۔ ظہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور وہیں راستے میں لوگوں کو با جماعت نماز پڑھائی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں پہنچتے ہیں اور وہاں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں قیام فرماتے ہیں۔ وہ اونٹنی کا قصہ وغیرہ جو ذیلی تفصیلیں ہیں مجھے اُن سے بحث نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ امر واضح ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہل ''قبا'' میں پہنچے اور چار دن یا دو تین ہفتے وہاں مقیم رہے تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان تھے، نہایت ہی احترام کے ساتھ مہمان نوازی کے طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔ اس طرح اس مہمان نوازی کی وجہ سے وقت گزر گیا۔ اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح زندگی گزارتے تھے۔ جب آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں بستے ہیں تو صحیح بخاری کے مطابق یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال کا گھرانا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگا کہ حضرت عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماں ایک مدنی خاتون تھیں، اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ مدینے کے ایک خاندان سے قائم تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد سے ہر زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اس رشتے کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کبھی شمالی سفر پر جاتے، مثلاً مکہ سے شام کو جاتے، تو جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی، مدینہ میں اپنے خاندان کے پاس ٹھہرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے تعلقات دوستانہ اور قریبی تھے۔ ان حالات میں صحیح بخاری کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کی بستی میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے مکان میں اس لیے قیام فرمایا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال کا خاندان تھا۔ (میں اس اونٹنی کے قصے کا ذکر فی الوقت ترک کرتا ہوں۔) بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ جب ایک قریبی رشتہ دار کے مکان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرماتے ہیں تو وہاں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل زندگی کیا ہیں؟ یقیناً قریبی رشتہ داروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیافت کی ہوگی، بغیر اس کا مطالبہ کیے کہ ہمیں اس کے مصارف دیے جائیں۔ اسے وہ اپنے لیے باعث فخر بھی سمجھتے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں مہمان ہیں۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر ایک بڑی مسجد بنانے کا حکم دیا۔ سارے شہر مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باعث، جو لوگ پہلے محلے والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، وہ بھی اب اس مرکزی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تھے۔ چھوٹی مسجد کافی نہیں ہوسکتی تھی، لہٰذا ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس مسجد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے کے لیے چند کمرے بنائے گئے۔ یہ کمرے ابتدا میں تو اتنے بڑے نہیں تھے جو بعد میں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں، اس کے کچھ ہی دنوں بعد، دوسری بیوی جس سے شادی ہوچکی تھی لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی تشریف لائیں۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ان کے لیے بھی کمرے کی ضرورت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دو صاحب زادیاں تھیں، حضرت فاطمہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، ان کے لیے بھی ایک کمرہ بنایا گیا۔ دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں۔ بعد میں کبھی ان حجروں میں رہنے والوں کی تعداد گھٹے گی۔ مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں گی، کبھی ان کمروں کی تعداد نئی بیویوں سے زواج عمل میں آنے کے باعث بڑھ جائے گی۔ بالآخر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نو بیویاں تھیں اور ایک کنیز حضرت ماریہ قبطیہ بھی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ توضیحوں کی ضرورت ہے۔

جہاں تک حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق ہے، بہ صراحت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مسجد

نبوی کے حجروں میں نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی قدر فاصلے پر، ان کا علیحدہ مکان تھا۔ اسی طرح جہاں تک مجھے اس وقت یاد آ رہا ہے، حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان علیحدہ تھا، وہ بھی ان حجروں میں نہیں رہتی تھیں۔ مسجد نبوی کے ان کمروں میں ایک کمرہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے تھا اور ایک کمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیوں کے لیے تھا۔ ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا، جس میں جلد ہی اس کا مقیم آ گیا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ تو ابتداءً تین حجرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان سے اُٹھ کر یہاں آ گئے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بسر بود کا کیا انتظام تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ کے انصار جو کسان تھے اور زراعت پیشہ تھے، ان میں سے اکثر جو کافی مالدار تھے، اپنے باغوں میں ایک ایک درخت کو نشان زدہ کر دیا تھا کہ اس کا پھل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے انہوں نے ایسا کیا تھا اور ہر سال کھجور کی فصل کٹنے پر، اس درخت سے جتنی کھجوریں حاصل ہوتیں، وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت سے زائد ہوتیں تو غرباء اور مہمانوں میں تقسیم ہوتیں۔ یہ پیش کش برابر جاری رہی۔ ہمارے مؤرخ اور محدث اکثر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض اوقات مہینے گزر جاتے اور ہم صرف دو چیزوں پر اکتفا کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی پر، ہمارے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ غالباً اس زمانے کا ذکر ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل آمدنی میں صرف کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔

رفتہ رفتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں چند اور تفصیلیں نظر آتی ہیں مثلاً اس کا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بکریاں خریدی تھیں اور ان کا دودھ خاندان میں خرچ ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی اونٹنی، کوئی بکری جو دودھ دینے والی ہوتی، پیش کرتے اور التجا کرتے کہ اس کو قبول فرمائیے، اس طرح ہماری عزت افزائی ہو گی۔ تو کبھی کبھی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قبول فرما لیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ شروع میں مثلاً ایک بکری تھی، بعد میں دس بکریاں ہو گئیں۔ شروع میں ایک اونٹنی تھی بعد میں چار اونٹنیاں ہو گئیں۔ اب ان کے لیے ہمیں تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ شہر مدینہ کے مضافات میں ایک چراگاہ معین کی گئی جہاں ایک صحابی رضا کارانہ طور پر ان جانوروں کی نگہداشت کرتے، انہیں چرانے کا فریضہ انجام دیتے اور روزانہ دودھ اس مقام سے مدینہ لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پہنچایا کرتے تھے۔ اہل خاندان اس دودھ کو استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنی نجار ہی کے ایک فرد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ننھیالی رشتہ دار تھے، ان کی عادت تھی کہ روزانہ اپنے گھر میں پکی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر بھیجتے۔ کبھی کوئی میٹھی چیز، کبھی ترکاری، کبھی گوشت، بہر حال جو بھی اچھی چیز ان کے گھر پکتی تھی، ضرور بھیجتے۔ وہ بہت مالدار شخص تھے۔ بعض وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ اسی، اسی اصحاب صفہ کو بیک وقت اپنے گھر لے جا کر ان کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ تھا کہ روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کی کچھ چیزیں بھیجتے، جو اچھی خاصی مقدار میں ہوتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور ان کے گھر کے لوگوں کے لیے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے اوقات میں تنہا کھانا، کھانا کبھی پسند نہ فرماتے۔ ہر وقت دس پانچ لوگوں کو جو اس وقت موجود ہوتے، بلا لیتے۔ کبھی کچھ گھر کی چیزیں کھجور وغیرہ، کچھ وہ تحفے جو روز بروز آتے تھے، وہ بھی کھانے کے طور پر استعمال ہوتے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ جلد ہی ایک چھوٹے سے ذریعۂ آمدنی کا اضافہ ہوتا ہے۔ ۲ ہجری رمضان کے مہینے سے دشمنوں کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے مال غنیمت کا ۵/۱ حصہ حکومت کے لیے وقف تھا اور ۵/۴ حصہ مجاہدوں میں برابر تقسیم کیا جاتا تھا۔ بیشتر جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً شریک ہوئے۔ مثلاً بدر میں اور اس کے بعد مختلف غزوات میں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو طریقے سے آمدنی ہونے لگی، ایک تو مجاہد کی حیثیت سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں شریک تھے اور جنگ میں شریک ہونے والوں کی طرح برابر حصہ ملتا جس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی۔ اس

وقت ایسا نہیں تھا کہ مستقل ہر مہینے اور ہر سال آمدنی ہوتی رہتی ہو۔ دوسرا وسیلہ اس مالِ غنیمت میں سرکاری مال تھا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا کہ جس طرح چاہیں آپ تقسیم فرمائیں۔ اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ پبلک کی ضروریات کے لیے اور ملک کی عام بہبود، دفاعی انتظام، ہتھیاروں کی خریداری کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ بہر حال اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے اور اگر کسی مکان میں کوئی چیز نہ ہوتی تو اس کو سرکاری مال یعنی خزانے کی چیزوں میں سے مہیا کر دی جاتی۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں قرآن کا یہ حکم تھا کہ زکوٰۃ کا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعیال کے لیے حرام ہے۔ اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ، ماتحت لوگ، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر معلوم ہو کہ حکمران کے لیے یہ حرام ہے تو ماتحت افسروں کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی کسی اور قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات کے لیے ممنوع قرار نہیں دی۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ اس عام حکم میں کہ جو مال دشمن کافروں سے، غیر مسلموں سے، مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہو، اس کا ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے: "......قل الانفال للہ والرسول ......" (۱:۸) کے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف مالِ غنیمت کے متعلق ہیں۔ "واعلموا انما غنمتم من شیء" (۴۱:۸) اور مالِ غنیمت کا کچھ حصہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن زکوٰۃ کا کوئی حصہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کے لیے صرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بالکل ابتداء میں، مدینہ میں، یہی صورت حال تھی۔ مکہ کا سوال نہیں کیونکہ یہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثتی جائیداد تھی، اپنی بیوی سے حاصل کردہ جائیداد تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی تاجر تھے۔ مدینہ میں ہمیں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں مہمان رہے۔ اس کے بعد آپ کو ایسی چیزیں تحفۃً پیش کی

گئیں جو مستقل تھیں، مثلاً کھجوروں کی فصل کے وقت اس کا کچھ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا۔ اس کے بعد مالِ غنیمت ایک ذریعہ پیدا ہوا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گزر بسر کے انتظام میں آنے لگا۔ جنگِ بدر کے بعد جلد ہی جنگِ اُحد پیش آئی (کم و بیش ایک سال بعد)۔ اس موقعہ پر ہمارے مؤرخ ذکر کرتے ہیں کہ وہاں ''مخیریق'' نامی ایک یہودی تھا۔ کہتے ہیں کہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اپنی انتہائی عقیدت کے پیش نظر اس نے وصیت کی تھی کہ اگر جنگ میں مر جاؤں تو میرے سارے باغ جو مدینہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوں گے۔ چنانچہ مخیریق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سات باغ تھے جن کی پوری آمدنی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہوگئی۔ اس طرح ابتدائی زمانے کی دشواریاں ختم ہوگئیں۔ ہمیں اور چند چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

زکوٰۃ کی تقسیم

زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں صاف اور واضح قرآنی احکام ہیں۔ وہ مشہور و معروف آیت جو کہ سورۂ توبہ میں ہے: ''انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفة قلوبھم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضة من اللہ ......'' (۹:۶۰) صدقات (یعنی حکومت کی آمدنیاں یا زکوٰۃ) کو تقسیم کیا جائے فقراء پر، مساکین پر، اس کے بعد ذکر ہے '' و العاملین علیھا'' کا، یعنی حکومت کے ان کارندوں پر جو تحصیل زکوٰۃ کے کام میں مشغول ہیں۔ عاملین کے بعد ذکر آیا ہے و المؤلفة قلوبھم یعنی ان لوگوں پر جن کے دل موہ لینے کی تمھیں ضرورت ہے (تبلیغ اسلام کے لیے) مثلاً جیسے آج کل ہم کہتے ہیں Secret Service۔ حکومت مخفی طور پر ملت اور مملکت کے مفاد میں لوگوں پر کچھ رقم خرچ کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے ''و فی الرقاب'' گردنوں کے چھڑانے کے لیے۔ اس کے معنی دو لیے جاتے ہیں۔ متفقہ طور پر ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے اور اسلامی مملکت کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اگر دشمن کے ہاتھ میں قید ہوگئی ہو تو فدیہ دے کر انہیں رہائی دلانے

کے لیے۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں اس کے بعد ایک لفظ ہے ''غارمین''۔ اس کے معنی ہیں وہ کھاتے پیتے مال دار لوگ جن پر یکا یک کسی حادثے یا خسارے سے سخت مالی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے میں نے سہواً کسی آدمی کو قتل کر دیا۔ مجھے خون بہا دینے کی ضرورت تھی لیکن میں محتاج و معذور ہوں۔ تو حکومت کا فریضہ ہے کہ میری مدد کرے تاکہ میں اس فریضہ کی انجام دہی سے سبکدوش ہو سکوں۔ یہ ہے غارمین۔ اس کی ابھی میں اور تشریح کروں گا۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے ''فی سبیل اللہ'' یعنی اللہ کی راہ میں۔ حیرت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اولین معنی ہیں دفاعی خدمات، ملک کی حفاظت کا انتظام اور فوج کے اخراجات۔ مسجدیں وغیرہ بنانے کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد ایک اور لفظ ہے جس کی توقع عام حالات میں نہیں تھی مگر اس کا ذکر یہاں ملتا ہے، ''ابن سبیل'' اس کے لفظی معنی ہیں راستے کا بچہ اور مراد اس سے ہے مسافر۔ مسافر کسی مقام کا بھی ہو اگر ہمارے علاقے سے گزرتا ہے تو آج کل حکومتیں تو مسافر سے ٹیکس لیتی ہیں کہ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہیں۔ اسلامی قانون کا حکم یہ ہے کہ مسافروں کی مہمان نوازی کرو، انہیں کھلاؤ پلاؤ اور اقامت کی سہولتیں مہیا کرو۔ ان آٹھ مدات کے ذکر کے بعد قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اللہ کا مقرر کردہ حکم ہے ''فریضة من اللہ''۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کی Budgeting کی پالیسی متعین کر دی گئی کہ ان آٹھ مدات میں زکوٰۃ کی آمدنی صرف کی جائے: فقراء، مساکین، عاملین علیہا، مولفة القلوب، الرقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دلچسپ چیز کا میں ذکر کرتا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ چونکہ آٹھ مدات میں رقم خرچ کرنے کا حکم ہے لہٰذا آمدنی کا ۸/۱ حصہ ہر ایک کو دلایا جائے۔ دوسرے ائمہ کی رائے یہ نہیں ہے۔ ابتدائی دو نام فقراء اور مساکین سے کیا مراد ہے؟ بظاہر دونوں مترادف لفظ ہیں مگر اس میں اختلاف رائے رہا ہے۔ اور اس اختلاف رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا تو امام شافعی نے کہا، چونکہ اللہ جل شانہٗ نے آٹھ مدوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ نے اپنے وفور رحمت سے غریبوں کو دگنا حصہ دلانا چاہا، اس لیے دو نام استعمال کیے گئے ہیں۔ ۸/۱ اغریبوں کے لیے، ۸/۱ مسکینوں کے لیے یعنی دونوں غریبوں کے لیے کہ بجائے

1/8 کے 2/8 یا ایک چوتھائی آمدنی ان لوگوں کے لیے خرچ کی جائے۔ یہ محض علمی بحث کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیا ہے۔ ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔ آج کل اگر ہم اپنی فقہ کی کتابوں کو کھولیں تو ان میں نظر آئے گا کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاسکتی ہے غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ انتہائی ابتدائی زمانۂ اسلام میں، انتہائی مقدس اور قابل احترام ہستیوں کی یہ رائے نہیں تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی تالیف "کتاب الخراج" میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خلافت کے زمانے میں زکوٰۃ کی آمدنی سے یہودیوں کی بھی مدد فرماتے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ میرے زمانے میں لوگ بھیک مانگیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حکومت کا فریضہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرے، انہیں کھلائے پلائے۔ اس سے پوچھتے ہیں تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میں ایک یہودی ہوں۔ اب تک کاروبار کیا کرتا تھا اور جزیہ دیا کرتا تھا۔ اب بوڑھا ہوگیا ہوں، کام نہیں کرسکتا، لہٰذا مجبور ہوں کہ بھیک مانگوں، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے حد متاثر ہوئے اور فوراً اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی کے لیے روزینہ مقرر کردیا جائے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ "ھذا من مساکین اھل الکتاب" یہ مساکین کی مد میں آتا ہے اس لیے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے۔ دوسرے معنی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے اور بعض دیگر صحابہ مثلاً حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کی رائے کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو دی جاسکتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "فقراء" سے مراد مسلمانوں کے فقیر اور مساکین سے غیر مسلم رعیت کے فقیر ہوں گے۔ جو بھی ہو یہ پہلی مد ہے۔ والعاملین علیھا تیسری مد ہے۔ اگر میں یہ توجیہ کروں کہ اس سے مراد پوری سول ایڈمنسٹریشن ہے تو حیرت کی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ کو جمع کرنے والے، زکوٰۃ کا حساب رکھنے والے، زکوٰۃ کے حساب کی جانچ پڑتال یا آڈیٹنگ (Auditing) کرنے والے، زکوٰۃ کو تقسیم کرنے والے، تقسیم کی نگرانی کرنے والے، یہ سب لوگ عاملین میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سول ایڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔

اس کے بعد کا لفظ ہے "مولفة قلوبهم" اس سلسلہ میں ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے، 'ابو یعلی الفرا الحنبلی' جیسے کٹر قسم کے عالم کی۔ کٹر کا لفظ میں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت دبنے والے انسان نہیں تھے۔ کھری کھری سناتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے "الاحکام السلطانیہ"۔ یہ ماوردی کے معاصر ہیں اور ماوردی کی کتاب ہی کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے۔ اس میں زکوٰۃ کی مدات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "مؤلفة قلوبهم" یعنی جن لوگوں کا دل موہ لینا ہے ان کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچانے سے باز رہیں۔ عام حالات میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر ان کو رقم دے دیں تو مثلاً جنگ کے زمانے میں وہ غیر جانب دار رہیں گے، مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تیسری قسم، ابو یعلی الفرا لکھتے ہیں، کہ ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ چوتھی قسم، وہ کہتے ہیں، ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے قریبی رشتہ دار، ان کے قبیلے کے لوگ، ان کے خاندان کے لوگ اسلام قبول کریں۔ اس فہرست کے بعد وہ ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ رقم مسلمان اور غیر مسلم کسی کو بھی دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کی تالیفِ قلب کرنی ہو یا کسی کو، مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچانے کے لیے رقم دی جانی ہو، تو وہ غیر مسلم ہی ہوگا۔ لیکن وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ چاہے وہ غیر مسلم ہو یا مسلم، اس کو مولفہ قلوبهم کے تحت زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم دی جا سکتی ہے۔

اس سے آگے چلئے "فی الرقاب" یعنی ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے حکومت امداد کرے۔ ملک کی رعایا کو، دشمن کی قید سے چھڑانے کے لیے حکومت زکوٰۃ صرف کرے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد آ رہا ہے 'طبقات ابن سعد' میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کچھ تفصیلی حالات دے کر ان کا خط نقل کیا گیا ہے۔ وہ خط انہوں نے گورنر یمن کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ

قید ہو، اُس کو چھڑانے کے لیے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے، اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی۔ تو گویا رقاب کے سلسلے میں اسلامی رعیت کو دشمن کی قید سے رہائی دلانے کے لیے جو فدیہ دیا جاتا ہے، اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح فقراء اور مساکین کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں زکوٰۃ کی رقم سے غیر مسلم کی مدد کی جاسکتی ہے۔ مؤلفۃ قلوبھم کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں، اسی طرح رقاب کے سلسلے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ زکوٰۃ بظاہر غیر مسلموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

"غارمین" کا لفظ جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا، کسی شخص پر رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں غیر معمولی بوجھ پڑ جائے اور وہ اس سے عہدہ براء نہ ہو سکے۔ ہمارے مؤلف مثالیں دیتے ہیں کہ مثلاً اس کا مال راستے میں چوری ہو گیا یا اس کا مال کسی طغیانی میں، کسی زلزلے میں یکا یک ضائع ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی حالتوں میں اس بظاہر مالدار شخص کی بھی ہم مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اچانک، عارضی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کر کے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں بلکہ قرض دینا ہے۔ کوئی شخص کھاتا پیتا ہے، اس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے، مثلاً تجارت کے لیے یا کسی اور کام کے لیے تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے اور قرض ظاہر ہے کہ بلا سود ہی ہو گا کیونکہ حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو سود کی آمدنی کا خیال کیے بغیر، رعایا ہی کی آمدنی، رعایا ہی کو قرض دے سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل یہی نظر آتا ہے کہ وقتاً فوقتاً وہ لوگوں کو سرکاری خزانے سے بلا سود قرضے دیتے۔ اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کم تھی، ان کی تنخواہ کم تھی، کبھی کبھی انہیں ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سرکاری خزانے سے قرض لیتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماہ تنخواہیں نہیں بٹتی تھیں بلکہ چھ ماہ میں ایک بار یا سال میں دو مرتبہ، تو اپنی تنخواہ کے ملنے پر وہ ادائیگی کر دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اور لوگوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ لفظ "غارمین" سے یہ بھی استنباط کیا گیا تھا۔

فی سبیل اللّٰہ'' کے متعلق ابھی میں نے ایک حد تک اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد فوجی انتظام اور دفاع کا انتظام ہے۔ سول ایڈمنسٹریشن کا ذکر ہم ''عاملین علیھا'' کے تحت دیکھ چکے ہیں۔ ''فی سبیل اللّٰہ'' کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آ جاتی ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی، اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس مد کے تحت آ جاتی ہیں۔ نیز اور چیزیں بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا، کارواں سرائے تعمیر کرنا، مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں فی سبیل اللہ کے تحت اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے تحت آ جاتی ہیں۔

آخری چیز ''ابن السبیل'' راستے کا بچہ یعنی مسافر جو گزر رہے ہیں، اس کی طرف بھی میں نے اشارہ کیا اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس میں بھی مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ کوئی غیر مسلم کسی مقام سے گزرے، مثلاً وہاں سب مسلمان ہوں، تو اس کی مہمان نوازی اور اس کی ضرورتوں کا انتظام کرنا یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا اور میں اس کو اور بھی زیادہ توسیع دے کر کہہ سکتا ہوں کہ ابن السبیل کے معنی پورے Tourist Traffic کا انتظام ہے۔ اس میں سڑکوں کا بنانا، پلوں کی تعمیر، اس میں پولیس کا انتظام کرنا کہ گزرنے والوں کی جان و مال محفوظ رہے۔ اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو، غذا صحت کے لیے مضر نہ ہو وغیرہ وغیرہ، ابن السبیل کے لفظ کے تحت آ جائیں گے۔ یہ ایک تاثر ہے جو اس آیت کے پڑھنے سے اور اس آیت کے متعلق ہمارے پرانے مفسرین کی آراء کو معلوم کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ آج کل ہمارے فقہا یہ رائے نہیں رکھیں گے اور وہ کہیں گے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکتی۔ انہیں اختیار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ، یہودیوں اور عیسائیوں کی زکوٰۃ کی مد سے امداد کیا کرتے تھے۔ ایک یہودی کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے کہ ''کتاب الخراج'' کے مطابق مدینہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔

سوال اس وقت یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا جو تصور آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے

کہ ہر شخص اپنی بچت سے سال کے اختتام پر اڑھائی فیصد رقم غریبوں کو بطور زکوٰۃ دیا کرے، یہ تصور کب سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ عہد نبوی میں زکوٰۃ حکومت وصول کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مرتدین سے جو جنگ ہوئی وہ اسی زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں تھی۔ لوگ زکوٰۃ حکومت کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا کہ انہیں زکوٰۃ حکومت ہی کو ادا کرنی ہوگی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے جس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، ستائیس ہجری کا میں معین طور پر ذکر کرتا ہوں کہ اسلامی فوجیں ایک طرف یورپ، "اندلس اور افرنجا" میں پہنچ گئیں تھیں (افرجنا سے مراد غالباً فرانس ہو گا۔ اندلس اور افرنجا کے الفاظ طبری نے بیان کیے ہیں) دوسری طرف ستائیس ہجری میں مسلمانوں کی فوجیں جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر تک پہنچ جاتی ہیں یعنی چین کی سرحد تک۔ گویا اسلامی حکومت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد تین براعظموں، یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پھیل جاتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ فتوحات نئی نئی ہوئی تھیں۔ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ لوگ راتوں رات سچے مسلمان ہو جائیں گے۔ میرا اپنا گمان ہے کہ اس وقت ایک سو مربع میل میں ایک سے زائد مسلمان نہیں ہوتا ہوگا۔ ان حالات میں یہ میرا اندازہ ہے (میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں) کہ اگر اس زمانے میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے، ہر ایک مسلمان کے مکان پر کارندے جاتے، اُس سے اس کا حساب مانگتے کہ تمہیں کتنی آمدنی ہوئی، کتنا خرچ ہوا، کتنی رقم سال بھر باقی رہی، تو تین براعظموں میں اس کام کے لیے کثیر عملے کی ضرورت ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ مصارف زیادہ ہوتے اور آمدنی اس سے کم ہوتی۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وزیر فنانس نے مشورہ دیا ہوگا کہ اس رقم کو مسلمانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ اللہ کا فرض کیا ہوا امر ہے اس لیے ان لوگوں کے ضمیر پر چھوڑ دیجئے۔ ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم خود ہی قرآنی احکام کے مطابق تقسیم کر لیا کریں۔ اگر حکومت اس کے انتظام کو بدستور اپنے ہاتھ

میں رکھنا چاہتی تو سرکاری عملے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے کہ اس بارگراں کو کوئی عقل مند وزیرِ فنانس قبول نہ کر سکتا۔ بہرحال ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں یہ طے کیا گیا کہ زراعت کی زکوٰۃ، معدنیات کی زکوٰۃ اور فلاں فلاں چیزوں کی زکوٰۃ تو بدستور حکومت ہی لے گی لیکن نقد رقم کی زکوٰۃ، سونا اور چاندی، درہم اور دینار، اس کو مسلمان اپنی ہی ذاتی صوابدید پر، اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق ہر سال تقسیم کر دیا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم بھول گئے کہ زکوٰۃ کے معنی عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دو خلفاء کے دور میں کیا تھے۔ اب ہم اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خیرات ہے کہ ہر سال اپنی آمدنی سے اور اپنی بچت سے غریبوں کے لیے کرتے ہیں۔ حالانکہ صرف غریبوں کا ہی اس میں حق نہیں ہے بلکہ اور مدات بھی اس کے اندر شامل ہیں۔

10

نظامِ دفاع

کسی ملک کے دفاع کے لیے نہ صرف فوجی تیاری درکار ہوتی ہے بلکہ غیرفوجی انتظامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اولاً میں غیرفوجی امور کے متعلق ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی، بہت ہی ننھی منی سلطنت جو مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی، اس کو ابتدا میں مختلف قسم کی مشکلات سے بچانے کے لیے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی تدبیروں کا آغاز کیا تھا کہ مکہ معظمہ سے مسلمان ہجرت کر کے مدینے آنے پر مجبور ہوئے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں سے تشریف لائے، تو شاید عام حالات میں کسی سلطنت کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن مشرکین نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ وطن سے نکالا، وطن میں اُن کی جائیدادوں کو ضبط کیا اور انہیں سالہا سال تک ہر طرح کی اذیتیں دیتے رہے۔ جب مسلمان وہاں سے چلے گئے، تب بھی انہیں چین نہیں آیا اور مدینہ والوں کو لکھ بھیجا کہ ہمارے دشمن (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو یا تو جان سے مار ڈالو یا انہیں اپنے ملک سے نکال دو۔ ورنہ ہم کوئی مناسب تدبیر اختیار کریں گے۔ یہ فوجی حملے کی دھمکی ایسی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا، خاص کر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دنیا کے سارے لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ تھا: بادشاہوں کے لیے بھی، فقیروں کے لیے بھی، عالموں کے لیے بھی اور جاہلوں کے لیے بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے لیے ایک سبق آموز نمونہ چھوڑا ہے۔

اولین مسئلہ یہ تھا کہ مہاجرین کو کس طرح روزگار پر لگایا جائے اور کس طرح ان کی

فوری ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات کا ادارہ قائم کیا، جس نے طرفتہ العین میں ان کی ساری مشکلات کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد دوسری تدبیر یہ فرمائی کہ چونکہ شہر مدینہ میں کوئی سلطنت نہیں پائی جاتی تھی، وہاں صرف قبیلے ہی قبیلے تھے اور قبیلے سالہا سال سے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے۔ ان میں باہمی نفرت، حسد، جلن اور دشمنی پائی جاتی تھی اور اگر ان قبیلیوں میں سے کسی ایک قبیلے پر ان کا دشمن حملہ کرتا تو دوسرے لوگ غیر جانب دار رہتے تھے۔ نتیجتاً اُسے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ ان حالات میں انتہائی فراست سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت کے باشندوں یعنی شہرِ مدینہ کے لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اپنے مذہبی اختلافات اور قبائلی انفرادیت کے باوجود یہ مناسب ہوگا کہ تم سب مل کر ایک چھوٹی سی مملکت قائم کر لو۔ آپس میں ایک مرکزیت پیدا کر لو اور اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے اپنی موجودہ قوت کو اس طرح مجتمع کر لو کہ اس کا کوئی جز ضائع نہ ہونے پائے۔ اس تجویز کو قبول کر لیا گیا اور جیسا کہ پہلے بھی میں نے اشارۃً عرض کیا تھا، ایک مملکت قائم ہوئی جو شہرِ مدینہ کے بڑے حصے پر مشتمل تھی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی شریک تھے اور جو مشرک قبیلے اسلام نہیں لائے تھے، وہ بھی اس میں داخل ہوئے۔ ان سبھوں نے بالاتفاق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کیا جو اختیارات مرکز کے تھے وہ مرکز کے سپرد کیے گئے اور بہت سے معاملات میں ہر قبیلے کی داخلی خودمختاری قائم رہی۔ جو چیزیں مرکز کے سپرد کی گئیں اُن میں سب سے اہم فوجی دفاع کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ صراحت کے ساتھ اسے مملکت کے دستور میں تحریری طور پر لکھا گیا، اور یہ ہم تک بھی پہنچا ہے، کہ جب کبھی دشمن سے مقابلہ ہوگا تو اس کا انتظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔ اگر فوج باہر جا کر لڑنے پر مجبور ہوگی تو اُس کا اختیار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگا کہ کس کو فوج میں رہنے کی اجازت دیں اور کس کو فوج میں داخل ہونے سے روک دیں تاکہ دشمن کے جاسوس یا منافق اور غدار لوگ شریک ہو کر اندرونی طور پر نقصان نہ پہنچا سکیں۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ دفاع کے انتظامات میں بعض غیر فوجی کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ اس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں۔ جیسے ہی یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے، یعنی

مہاجرین کا مسئلہ ختم ہو گیا اور مملکت یعنی شہرِ مدینہ کے سارے قبائل کی ایک تنظیم عمل میں آ گئی تو فوراً ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورے کرنے کا آغاز فرمایا۔ پہلے شمال کی طرف گئے۔ مدینے سے شمال کی طرف تین چار دن کی مسافت پر قبیلہ جھینہ بستا تھا، اُس کے علاقے میں گئے۔ اس کی تفاصیل تو ہمارے پاس نہیں، البتہ معاہدہ کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ مسلمان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ فوجی حلیفی پر تیار تھا۔ غالباً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہوگی کہ تم تنہا ہو، تمہارے دشمن موجود ہیں۔ اگر وہ تم پر حملہ کریں گے تو کوئی تمہیں مدد نہیں دے گا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم اور ہم آپس میں دوستی کر لیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم پر کوئی حملہ کرے گا تو ہم تمہاری مدد کو دوڑے آئیں گے اور اگر ہم پر کوئی حملہ کرے اور ہم تمہیں بلائیں تو تم بھی مدد کو آنا۔ بات معقول تھی۔ اُس قبیلے نے قبول کر لی چنانچہ معاہدے کی صراحت ہے کہ صرف فوجی معاہدہ ہے اس کا دینی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس ابتدائی کامیابی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی ایسی ہی مفاہمت کرتے ہیں۔ جنوب کے قبائل بھی مسلمان نہ ہونے کے باوجود جنگی حلیفی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مشرق کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی دوستی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے پانچ سات معاہدے تاریخ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مدینے کی بستی یا شہری ریاست کو محفوظ کرنے کی تدبیر اس انداز سے کی جا رہی ہے کہ مدینے کے اطراف کے علاقوں کو دوست بنا لیا جائے تاکہ اگر دشمن مدینے پر حملہ کرنا چاہے تو براہ راست مدینے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ مدینے تک پہنچنے سے پہلے ہی درمیان کے علاقہ میں اُس کو رکاوٹوں سے سابقہ پڑے۔ ہمارے دوست وہاں ہوں گے۔ وہ ہمیں بروقت اطلاع دیں گے۔ ہم ان کی مدد کو جائیں گے اور اپنے دوست قبائل کی مدد سے اُس دشمن کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ گویا ایک حلقہ cordon قائم ہو گیا۔ وہ مدینے کی حفاظت کے لیے مدینے کے اطراف میں دوستوں کی بستیاں قائم کرتے ہیں اور ان دوستوں کی مدد سے، جنگی نقطۂ نظر سے مدینے کی حفاظت عمل میں آتی ہے۔ یہ ایک پہلو تھا۔

اس قسم کی چیزیں ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اشارۃً مثال کے طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ فوجی حفاظت کے لئے غیر فوجی اور سیاسی طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایک نمونہ پیش کیا۔ کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی اس اُبھرنے والی، چھوٹی سی سلطنت کو، جس کے بہت سے دشمن تھے، اُن سے محفوظ رکھنے اور بچانے کا انتظام کیا۔ ابتدائی معاہدہ جو مدینے کے اطراف کے قبیلوں سے کیا گیا تھا، وہ مکے کے لوگوں کی دشمنی اور انتقام سے بچاؤ کی ایک صورت تھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مکے والوں نے کئی مسلمانوں کو ستایا، ان کو قتل کیا اور جب وہ وہاں سے ہجرت کر کے مدینے آئے تو اُن کی جائیدادیں بھی ضبط کر لیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو قانونِ فطرت کے تحت یہ حق حاصل تھا کہ ان مکہ والوں سے جانی اور مالی دونوں طرح سے انتقام لیں۔ ابھی مسلمانوں کے پاس اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ جانی نقصان پہنچائیں لیکن مسلمانوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پر انہیں مالی نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔

مکہ کے قریش اپنی گزر اوقات کے لیے تجارت کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے وہ کاروانِ تجارت جو جنوب میں یمن وغیرہ کی طرف جاتے تھے، اُن کو مسلمانوں سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جب اُن کے کاروان شمال میں عراق، شام یا مصر کی طرف جاتے تو مدینے کے قریب سے گزرنا ناگزیر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تم ہمارے علاقے سے نہیں گزر سکتے۔ ہمارے علاقے سے مراد مدینے کا شہر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے جو حلیف قبیلے تھے اُس علاقے سے بھی اُن کا گزرنا ممنوع ہو گیا۔ یہ قریش کے لیے سخت ناگوار بات تھی کہ اُن کو تجارت میں رکاوٹ پڑے۔ انھوں نے نہ مانا بلکہ اصرار کیا کہ ہم ضرور گزریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان مٹھی بھر تھے اور ایک ایسے ملک میں تھے جہاں سوائے خودرو گزرگاہوں کے کوئی سڑک نہیں پائی جاتی۔ ایک جگہ آپ روکیں تو بہت سے راستے اور پیدا ہو جاتے ہیں جہاں سے آدمی گزر سکتے ہیں۔ ان حالات میں قریشی کاروانوں کو روکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے بارہا اُن کو روکنے کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل تقریباً

سات مرتبہ مسلمان فوجیں یہ اطلاع ملنے پر کہ قریشی قافلہ گزر رہا ہے، اُس کو روکنے کے لیے گئیں لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آیا بلکہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ مگر کوششیں جاری رہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے وسائل کو ترقی دی جانے لگی۔ دوستوں کی تعداد بڑھائی جانے لگی۔ غرض جو تدبیریں ممکن تھیں وہ اختیار کی جاتی رہیں۔ اُس کے بعد جب قریش نے دیکھ لیا کہ مسلمان اُن کو آسانی سے گزرنے نہیں دیں گے تو انہوں نے زبردستی گزرنے کی ٹھان لی۔

جنگ بدر سے عین قبل کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ وہ شمال کی طرف گئے ہیں تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ دشمن اسی راستے سے واپس آئے گا، کسی اور راستے سے وہ نکل نہیں سکتا۔ لہٰذا دو جاسوس مقرر کیے کہ تم بھی شام کو جاؤ۔ اس کارواں کے قریب رہو۔ جیسے ہی وہ واپسی کا انتظام کرے، واپسی کا ارادہ کرے، تیزی سے آکر ہمیں اطلاع دو کہ دشمن اب آنے والا ہے۔ تجارتی کارواں اور جاسوسوں کی رفتار تقریباً یکساں ہی تھی کیونکہ اونٹوں کے سوا اور کوئی تیز رو سواری میسر نہیں تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ جب یہ دونوں جاسوس تیزی سے مدینے واپس آئے تو دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کارواں کی آمد کی اطلاع دیگر وسائل سے ہو چکی ہے، اور وہ مدینے سے روانہ بھی ہو چکے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کرنا پڑتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف وسائل اختیار فرماتے تھے تاکہ دشمن کی خبریں مسلمانوں تک پہنچتی رہیں اور اس کی بھی کوشش کرتے کہ ہماری خبریں دشمن تک نہ پہنچ پائیں۔ غرض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکل چکے تھے اور فوجی فراست کی بدولت مدینے کے شمال کی طرف جانے کی بجائے مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں تاکہ دشمن سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں جہاں دشمن کا روکنا ممکن ہو۔ اس کے لیے بدر کا مقام منتخب کیا گیا۔ مجھے وہاں جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مقام ایسا ہے جو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ وادیوں میں سے گزرتا ہے۔ تاہم آسانی کے ساتھ یہ ممکن نہیں تھا کہ مسلمان ایک ایسے مقام پر قیام کریں جہاں تنگ راستہ ہو۔ وہ پہاڑوں میں چھپے رہیں، دشمن بے خبری میں آئے اور وہ اُس پر چھاپہ مار سکیں۔ مختصر یہ کہ مختلف مقامات پر دریافت کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ دشمن کی کوئی اطلاع

ہے۔ لکھا ہے کہ بعض اوقات مسلمانوں کی فوج کے کچھ لوگ نکلتے اور سکاؤٹنگ کرتے اور بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ساتھ ایک دو صحابہ کو لے کر نکلتے اور راستے میں کوئی بدوی ملتا تو اُس سے پوچھتے کہ تمہیں اطلاع ہے کہ قریش کا کارواں اس وقت کہاں ہوگا۔ اس سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ معلومات حاصل ہوتیں۔ اُس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے مقام پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک دشمن کا کارواں وہاں سے نہیں گزرا۔ مشورہ ہوتا ہے کہ کہاں ٹھہرنا چاہئے۔ ایک مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بدر کے شمال میں ہے اور بہت ہی تنگ درہ ہے۔ مسلمان وہاں قیام کرتے ہیں۔ دو ایک دن بعد دشمن کا کارواں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس سے پہلے دشمن کو تجربہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کا تعاقب کرتے ہیں۔ جاتے وقت بھی پیچھا کیا تھا حتیٰ کہ لڑنا چاہا تھا۔ لہٰذا وہ اب چوکس اور چوکنے تھے۔ قافلے کو بدر کے درے میں سے گزرنے سے پہلے ہی ایک مقام پر ٹھہرا دیا گیا اور قافلے کا سردار ابوسفیان تن تنہا بدر کے شہر میں آتا ہے جہاں سے وہ اکثر گزرا کرتا تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس لیے وہاں جا کر سب سے پہلے اُس مقام پر پہنچتا ہے، جہاں لوگ مل سکتے ہیں۔ یہ مقام وہاں کا ایک طرح سے کلب تھا۔ وہاں لوگوں کے لیے ایک ہی کنواں تھا، کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت وہاں مل سکتا تھا یا تھوڑی ہی دیر میں کوئی نہ کوئی شخص آ جاتا تھا۔ ابوسفیان وہاں پہنچتا ہے اور بعض پانی بھرنے والے مردوں یا عورتوں سے معلوم کرتا ہے کہ قبیلے کا سردار اس وقت کہاں ہے۔ پھر اس سے جا کر ملتا ہے اور اُس سے گفتگو کرتا ہے۔ وہ سردار ابوسفیان سے کہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز میرے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی جس سے یہ گماں ہو کہ یہاں کوئی بڑی فوج تمہارے مقابلے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ البتہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بدوی یہاں سے اونٹوں پر گزرے۔ انہوں نے اتر کر کنویں سے پانی پیا اور پھر چلے گئے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز میرے علاقے میں نہیں گزری۔ ابوسفیان احتیاط سے آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ اونٹوں کی لید پڑی دیکھتا ہے۔ ایک لید کا ٹکڑا اٹھاتا ہے۔ اس کو چیر کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے اس کے اندر گھاس نہیں بلکہ کھجور کی گٹھلی ہے۔ وہ چلا اٹھتا ہے کہ یہ مقامی اونٹ سوار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو مدینے کے اونٹ ہیں کیونکہ مدینے ہی میں کھجور کی گٹھلیاں مل سکتی ہیں۔ اس

لید کے اندر چونکہ کھجور کی گٹھلی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ مدینے سے آئے ہوئے مسلمان ہی ہوں گے وہ پوری تیزی سے بھاگتا ہے اپنے کارواں میں پہنچتا ہے اور اس کو بدر سے باہر سمندر کے کنارے ہی کنارے ایک منزل کی جگہ دو منزل کرتا ہوا، تھکے ہوئے قافلے کو آرام کا موقعہ نہ دے کر، آگے بڑھ جاتا ہے اور بالآخر مسلمانوں کی دسترس سے بچ جاتا ہے۔ بچنے سے پہلے وہ ایک شخص کو انعام دے کر یہ کہتا ہے کہ پوری تیزی کے ساتھ مکہ جاؤ اور مکے کے لوگوں کو اطلاع دو کہ دشمن (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔ تمہارا مال تجارت لٹ جائے گا۔ لہٰذا ہماری مدد کو آؤ۔ وہ شخص مکہ پہنچتا ہے۔ اس احتیاطی تدبیر کے بعد جب ابوسفیان کا کاروان دو منزل سفر کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے تو پھر ایک نیا پیام رساں اہل مکہ کو روانہ کرتا ہے کہ اب تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچ چکا ہوں۔ مگر جو فوج مکہ سے روانہ ہو چکی تھی اس کا سردار ابوجہل تھا، اُس نے کہا کہ ایسے دشمن کا خاتمہ کر دینا چاہیے ورنہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ ہم کافی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں اور ہم میں یہ قوت ہے کہ اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھپے ہوئے مقام پر ایک دن، دو دن، تین دن انتظار کرتے رہے۔ ابوسفیان کے کارواں کا کوئی پتہ نہ چلا۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ وہ گزر چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ کیا اسی مقام پر یا کسی اور مقام پر؟ صحابہ کے مشورے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر کا اندرونی حصہ منتخب کرتے ہیں جہاں کنواں تھا۔ اس میں مصلحت یہ سوچی کہ مکہ والے بدر آئیں گے تو انہیں پانی کی ضرورت ہوگی اور پانی کا صرف یہی ایک ہی کنواں ہے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں رہے گا تو دشمن پیاسا مرے گا اور اس طرح ہم دشمن پر جنگی نقطۂ نظر سے فوقیت حاصل کریں گے۔ لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شمالی درے سے نکل کر شہر کے بیچ میں آتے ہیں اور کنویں کے ایک طرف قیام کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کے مشورے سے ایک بڑا گڑھا بھی کھودتے ہیں تا کہ اُس کو پانی سے بھر دیں۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ جنگ کے دوران ہم میں سے اگر کسی کو پیاس لگے تو اس گہرے کنویں سے پانی نکالنے اور پینے میں وقت لگے گا، اور اس اثناء میں دشمن ہم پر حملہ کر کے مار بھی سکتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ایک گڑھا ہو جس

میں پانی بھر دیا جائے اور ہمارے سپاہی وہاں پہنچ کر فوراً ہی چلو سے پانی پی لیں۔ دشمن اگر یہاں آئے اور پانی پینا چاہے تو اس کی نگرانی کے لیے کچھ لوگ یہاں متعین رہیں۔ یہ تدبیریں آج ہمیں معمولی محسوس ہوتی ہیں لیکن اُس زمانے میں فوجی نقطۂ نظر سے نہایت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسی اثناء میں دشمن کی مکہ سے آنے والی فوج ابوجہل کی سرداری میں وہاں پہنچ گئی۔ دشمن کی فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لیے ایک نگران دستہ (پٹرول) بھیجا گیا۔ اُس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا جو کنویں کی طرف پانی بھرنے کے لیے آرہے تھے۔ انہیں پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے ان دونوں سے پوچھا، کہ تم کون ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ انہوں نے انہیں مار پیٹ کر کہا کہ تم حقیقت میں ابوسفیان کی فوج کے آدمی ہو۔ انہوں نے کہا، نہیں، ہم ابوسفیان کے لوگ نہیں۔ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ پوچھا کہ تم کون ہو، تو وہ کہتے ہیں کہ مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جب وہ سچ کہتے ہیں تو تم انہیں مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتے ہیں کہ تو انہیں چھوڑ دیتے ہو۔ خیر اُس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے سوال کرنے کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ہمیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو فوجی نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں۔ ان سے پوچھا تم کون ہو؟ کہا "ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں" بہت اچھا تم کتنے آدمی ہو؟ جواب دیا "ہمیں معلوم نہیں"۔ واقعی ان کو معلوم نہیں تھا۔ پھر کیسے معلوم کریں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ روزانہ لوگوں کی غذا کے لیے کتنے اونٹ ذبح کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: "ایک دن نو، ایک دن دس"۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً استنباط کیا کہ اُن کی تعداد ایک ہزار سے نو سو کے مابین ہوگی۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک سو افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کی تعداد ۹۵۰ تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ فوج میں کون کون لوگ موجود ہیں؟ فلاں فلاں سردار؟ غالباً اُس سے اندازہ لگایا ہوگا کہ جنگ کے وقت فوج کی کمانداری کون کون کرے گا۔ میمنہ میں کون ہوگا۔ میسرہ میں کون ہوگا۔ مختلف مقامات پر کون کون مکہ والے ہوں گے۔ ان کے ناموں سے حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے۔ کیونکہ وہ ہم وطن تھے۔ اس طرح کچھ معلومات ان قیدیوں سے حاصل کی گئیں۔ اُس کے بعد صبح جنگ شروع ہونے والی تھی۔ رات کو جو طرزِ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہا وہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تو کچھ دیر آرام فرمایا۔ پھر بہت سویرے اپنی چھوٹی سی فوج جس میں تین سو بارہ آدمی تھے، اس کی تقسیم کی اور کہا کہ یہ فوج کا مقدمہ ہے، یہ سامنے رہے گا۔ یہ دائیں ہاتھ پر میمنہ، یہ بائیں ہاتھ پر میسرہ یہ قلب اور یہ ساقہ۔ گویا فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک کے افسر مقرر کیے: اس کا سردار فلاں ہوگا، اس کا سردار فلاں ہوگا: یہ انصاری، یہ مہاجر وغیرہ۔ اس کے بعد کچھ تفصیلات اور ملتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے آئندہ آنے والے سپہ سالاروں کے لیے نمونہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا جل شانہٗ کی حفاظت کا یقین ہونے کے باوجود، انتظامی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں: ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک جھونپڑا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جھونپڑے کے اندر رہ کر مشاہدہ کرتے رہیں اور حسب ضرورت فوج کو آگے بڑھائیں یا پیچھے ہٹائیں تاکہ دشمن کے کمزور حصے کو دیکھ کر اُس پر حملہ کیا جائے، جہاں مسلمانوں کی کمزوری ہو دیکھ کر کمک بھیجی جائے۔ یہ بھی خیال رکھا گیا کہ وہ مقام کھلا ہوا نہ ہوتا کہ دشمن کے تیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لگیں۔ ایک جھونپڑا سا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر دشمن کے تیروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے فوجی قیادت کے فرائض آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود انجام دے سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں بھی مامور کی جاتی ہیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر فوراً مدینہ منورہ چلے جائیں تاکہ (نعوذ باللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی نوبت نہ آئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر فراست سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کا انتظام فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے تین سو بارہ اور دشمن کے نو سو پچاس آدمی تھے۔ مسلمانوں کی پوری فوج میں شاید دو گھوڑے تھے اور دشمن کے پاس ایک سو سے زائد گھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے پاس دس بارہ بکتر ہوں گے۔ دشمن کے پاس دو سو بکتر تھے۔ گویا ہر لحاظ سے دشمن مسلمان فوج سے طاقتور اور قوی تھا۔ اس انتظام کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اُس جھونپڑی ہی میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تعمیر کی گئی تھی، خدا جل شانہٗ کے سامنے سجدے میں گر پڑے، اور دعا کی۔ وہ دعا بھی نہایت اثر انگیز تھی۔ دعا یہ تھی کہ اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں آئندہ کوئی تیری عبادت نہ کرے، تو اس چھوٹے سے دستے کو شکست دیدے۔ اس کے برخلاف اگر تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت ہوتی رہے تو اس چھوٹے سے دستے کو بڑے دستے پر غلبہ عطا کر۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلتے ہیں۔ فوج سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تم اس وقت ساری دنیا میں خدا کی خدائی کے واحد ذمہ دار ہو۔ یہ ولولہ دلوں میں پیدا ہوا ہو گا کہ ہم ہی وہ واحد جماعت ہیں جو اس وقت خدا جل شانہٗ کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ باقی سب خدا جل شانہٗ کے دشمن ہیں۔ اس جوش ولولہ کے باعث ایک ایک آدمی کو ہزار ہزار آدمی کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ جان پر کھیل جائے گا۔ آج کل کی فوجوں کی طرح نہیں جنہیں شراب پلا کر لڑائی کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس جذبے کے ذریعے ان میں جوش بھر دیا جاتا ہے، کہ تم جس مقصد کے لیے جنگ کر رہے ہو، وہ دنیا کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ نتیجے سے آپ اچھی طرح واقف ہیں: مٹھی بھر انسانوں نے دشمن کو شکست دی اور دشمن کے ستر آدمی قتل ہوئے ستر یا اس سے زیادہ آدمیوں کو گرفتار کیا گیا۔

میں اب دوسرے پہلو کو لیتا ہوں۔ جنگ کے سلسلے میں دشمن سے چھینے ہوئے مالِ غنیمت کے بارے میں کیا قانون ہونا چاہیے، اور دشمن کے آدمیوں سے ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے ازلی و ابدی دشمن ہیں۔ انہوں نے بلا وجہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے اب تک ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی قطعاً کوئی توقع نہیں کہ اب وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ ہمیں جانی نقصان پہنچا چکے ہیں، مالی نقصان بھی پہنچا چکے ہیں۔ میری رائے میں ان سب کا سر قلم کر دینا چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اسلام نہ لائیں لیکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں۔ اس لیے ان کو نیست و نابود کرنے کی بجائے رہا کر دیا جائے۔

ہمیں مالی ضرورت بھی بہت ہے۔ کیوں نہ ہم ان سے فدیہ لیں جس سے ہماری مالی تقویت ہوگی اور دشمن کی مالی حالت خراب ہوگی۔ اس طرح ہم اس جنگ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول فرماتے ہیں لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی، جس پر مومنین کو عتاب کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم o (۶۸:۸)[اگر خدا نے پہلے ہی سے فیصلہ نہ کر رکھا ہوتا تو جو چیز تم لوگوں نے لی ہے اس بنا پر تم لوگوں کو سخت عذاب دیا جاتا] کیوں؟ اس عذاب کی جو وجہ میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک پرانی شریعتوں میں ترمیم یا تنسیخ کی کوئی وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ آئے، وہ ان پر عمل کرنے پر مامور تھے۔ اب تک مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، اس لیے قانونِ جنگ کے متعلق کوئی احکام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا اس سے پہلے کے نبیوں کے احکام مثلاً توریت پر عمل کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا۔ تورات میں صراحت سے ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمہارا مقابلہ کرے، تم سے جنگ کرے اور تمہیں اُس پر غلبہ حاصل ہو تو دشمن کے مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جانوروں غرض ہر متنفس کو قتل کر ڈالو۔ ان کا جو مال ہے وہ بھی تم لے لو اور مال کے سلسلے میں کئی مقامات پر مذکور ہے کہ وہ خدا جل شانہٗ کی چیز ہے لہٰذا اُس کو جلا دو۔ اس سے تم استفادہ نہ کرو۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فطری رأفت و رحمت کے باعث بظاہر اُس حکم پر عمل نہیں کیا اور خود اللہ جل شانہٗ نے بھی اپنے رسول کو ''رحمۃ للعالمین'' کے لقب سے پکارا ہے۔ لیکن خدا جل شانہٗ کے نزدیک یہ بات نامناسب تھی کہ جب تک قانون میں تبدیلی نہ ہو، میرا بندہ میرے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ لہٰذا تنبیہ کی جاتی ہے ''لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم'' لیکن خدا جل شانہٗ نے سزا نہیں دی۔ چونکہ خدا جل شانہٗ ہی کہتا ہے: ''میں پہلے ہی سے فیصلہ کر چکا تھا کہ پرانے قانون کو بدل دوں گا''۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس جنگ سے جو فائدہ اٹھایا وہ یہ تھا کہ لاکھوں روپے مسلمانوں کو ملے۔ دشمن کے لاکھوں روپے خرچ ہو گئے کیونکہ فدیہ اُس زمانے میں بہت گراں چیز تھی؛ یعنی ایک سو اونٹ۔ ایک اونٹ کی قیمت ہم چالیس درہم ہی قرار دیں جو انتہائی کم قیمت تھی

اور ہر شخص کے عوض ایک سو اونٹ فدیہ میں لیے گئے۔اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کس قدر رقم ان ستر قیدیوں سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔بعض لوگوں کے پاس روپیہ تھا،انہوں نے روپے دے دیے۔بعض لوگ تاجر تھے مثلاً ایک شخص اسلحہ بیچنے والا تھا،اس نے کہا کہ میں اس رقم کے برابر اسلحہ تمہیں دیتا ہوں،اسے قبول کیا گیا۔بعض لوگ خود غریب تھے لیکن ان کے دوستوں نے ان کی مدد کی اور چندہ کر کے ان کی رہائی کا انتظام کیا۔بالآخر کچھ ایسے بھی تھے جو بالکل غریب تھے۔ان کے دوست احباب بھی مالدار نہیں تھے کہ مدد کریں۔لیکن ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ ایک ایک سو اونٹ دینے کی بجائے تم دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاؤ۔یہی تمہارے لیے فدیہ ہوگا۔تم کو مفت رہا کر دیا جائے گا۔اس بات سے علم کی ترقی کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمناؤں اور کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں نہ تو لکھنا پڑھنا آتا تھا،نہ وہ مالدار تھے اور نہ ہی اُن کے مالدار دوست تھے۔بالآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طے فرماتے ہیں کہ ان سے صرف وعدہ لیا جائے کہ آئندہ مسلمانوں سے جنگ نہ کریں گے۔اور اس وعدے پر ہی اعتماد کر کے انہیں مفت رہا کر دیا گیا۔ایسی بھی صورتیں پیش آئیں کہ کچھ مسلمان کسی قبیلے میں قیدی تھے۔ان کو رہائی دلانے کے لیے اس قبیلے کے آدمیوں کو رہا کیا گیا۔غرض قانون جنگ کی بے شمار مثالیں اس پہلی جنگ کے دوران ہمیں نظر آتی ہیں۔اس پر مسلمانوں کا بین الاقوامی دفاعی قانون International Law مبنی ہو جاتا ہے۔میں اس پر جنگ بدر کا بیان ختم کرتا ہوں۔

[جنگ بدر کے بیان کے بعد فاضل مصنف اپنے مقالے میں غزوۂ اُحد،غزوۂ خندق،صلح حدیبیہ اور دوسرے اہم غزوات کے بیان سے گزرتے ہوئے مکہ فتح ہونے کے بعد یوں فرماتے ہیں (مدیر)]

شہر میں داخلے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے بھیجتے ہیں،وہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔مکہ والوں کو چاہیے کہ خانہ کعبہ کے صحن کے اندر جمع ہو جائیں۔لوگ آئے۔دلوں میں دہشت تھی کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔غالباً ظہر کی نماز کا وقت تھا۔رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم حضرت بلال کو حکم دیتے ہیں کہ اذان دو۔ اُس دن وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر اذان شروع کرتے ہیں۔ حاضرین میں بہت سے مکہ کے غیر مسلم مشرکین موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا نام عتاب بن اسید ہے اور جو بڑا سخت اسلام دشمن ہے وہاں موجود ہے۔ یہ آواز سن کر اپنے دوست سے جو پاس بیٹھا ہوا ہے کہتا ہے: ''شکر ہے کہ میرا باپ مر چکا ہے، ورنہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر چڑھ کر، اللہ تعالیٰ کے گھر پر ہینگے''۔ اذان کے بعد نماز ہوتی ہے۔ نماز کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو۔ انہیں بیس سالہ ظلم، فتنہ انگیزی اور فساد یاد آتے ہیں اور وہ شرم سے سر جھکا لیتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریف ہیں، شریف زادہ ہیں، شرافت ہی سے پیش آئیں گے۔ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو تاریخ عالم میں لافانی و لاثانی کہنا چاہئے۔ اُن کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''تم پر اب کوئی مواخذہ، کوئی ذمہ داری نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو''۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس کے فوری اثرات بتا دوں۔ ایک چھوٹی سی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو حکم دے سکتے تھے کہ سارے مکہ والوں کا قتل عام کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے وسائل موجود تھے۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ فوج موجود تھی۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی جاتی۔ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے تھے کہ سب کو غلام بنا لینے کا حکم دیتے یا کم از کم یہ حکم دیتے کہ ان کا سارا مال لوٹ لیا جائے۔ کہا تو یہ کہا کہ جاؤ! تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تم سب آزاد ہو۔ عتاب بن اُسید ابھی دو منٹ پہلے کہہ رہا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر ہینگ رہا ہے۔ وہ خود کو تحمل کرنے کے قابل نہیں پاتا۔ یکا یک اچھل پڑتا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کہتا ہے کہ میں عتاب بن اسید ہوں۔ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ''۔ یہ واحد مثال نہیں تھی۔ راتوں رات شہر مکہ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے، اور مسلمان بھی ایسا راسخ العقیدہ ہوتا ہے کہ دو سال بعد جب ملک کے بعض قبائل میں ارتداد کی کیفیت ہوئی تو سب سے مستحکم ایمان رکھنے والے لوگ مدینہ کے بعد مکے والے تھے۔

ایک چھوٹی سی چیز پر اس قصے کو ختم کرتا ہوں اور وہ مکہ کی فتح کے بعد ابوسفیان کی بیوی کا ایمان لانا ہے۔ اُس کا نام ہندہ تھا۔ ہندہ وہ عورت تھی جس کا بیٹا، بھائی اور چچا جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ چنانچہ جنگ اُحد میں اُس نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیٹ چیر کر، کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ جب مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو گیا تو اس کے گھر میں ایک عجیب سین نظر آتا ہے۔ وہ ایک لکڑی لے کر گھر میں جو مختلف بت تھے اُن کو مار مار کر پاش پاش کرنے لگتی ہے۔ اور کہنے لگی کہ اب تک ہمیں دھوکا دیتے رہے، اب معلوم ہوا کہ تمہارے پاس کوئی قوت نہیں۔ چنانچہ سارے بت اُس نے توڑ دیئے۔ اس کے بعد اسے خوف تھا کہ شاید حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھیں گے تو مجھے سزا دیں گے۔ اس لیے چہرے پر نقاب ڈال کر، چھپ کر، عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچتی ہے اور وہاں اپنے اسلام لانے کا اعلان کرتی ہے جس طرح اور عورتیں کر رہی ہیں۔ اُس سے بھی جو بیعت لی گئی اُس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ وعدہ کرو کہ تم ایک اللہ کو مانو گی، بت پرستی اور شرک نہیں کرو گی۔ اس نے بآواز بلند کہا ہم اب تک دھوکے میں تھے اب ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ عورتوں کو چاہیے کہ بدکاری نہ کریں۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ کہتی ہے کہ کوئی شریف عورت ایسا کر ہی نہیں سکتی وعدہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم آئندہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو زندہ دفن کر کے قتل نہ کرو گی۔ یہ اس وقت ہندہ کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ دلچسپ ہیں اُس نے کہا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جن بچوں کو ہم نے پرورش کر کے بڑھایا، جوان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل کر دیا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہیں۔ پوچھتے ہیں، کون عورت ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہندہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے فرماتے ہیں کہ اب تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی۔ اس طرح یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کو سمجھ کر صحیح وقت پر ضرب لگانے میں جو فائدہ

ہوتا ہے، وہ بے وقت نرمی یا سختی دکھانے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں شہر مکہ کی فتح عمل میں آئی اور ہم نے دیکھا کہ فوج کو دشمن کے ملک کی طرف اس طرح بڑھایا گیا کہ اس کی خبر دشمن کو آخری لمحے تک نہ ہو سکی اور ایک بڑے شہر پر اس طرح قبضہ کیا کہ ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔

ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنی چاہیے۔ فوجی تیاریوں کے سلسلے میں کیا انتظامات ہوتے ہیں اور جنگ میں کس طرح سے مختلف کام انجام پاتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ میں نرسنگ کے لیے، کھانا پکانے کے لیے، قبریں کھود کر مردوں کو دفن کرنے کے لیے، غرض ایسے بہت سے کاموں کے لیے، ابتدا ہی سے مسلمانوں کی فوج میں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ عورتیں بھی نظر آتی ہیں جن کو سفر میں بچہ پیدا ہوا۔ نو ماہ کی حاملہ عورتیں بھی خوشی سے اس میں حصہ لیتی ہیں۔ نو عمر لڑکیاں اور بالغ لڑکیاں بھی اس میں حصہ لیتی ہیں۔ ان تفصیلات کا وقت نہیں۔ دو ایک چیزیں آپ سے بیان کروں گا، وہ یہ کہ مسلمانوں کو ایک مستقل فوج (Standing Army) رکھنے کا شروع میں کوئی خیال نہیں تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جہاد کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ جس طرح نماز پڑھنا ایک فریضہ ہے، اسی طرح جنگ میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک فریضہ ہے۔ جو لوگ مسلمان تھے وہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سارا ملک اور ملک کے سارے بالغ مرد Potential Army تھے۔ جس وقت، جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو، ان میں سے لے لیتے۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک مستقل فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال لوگوں کی فوجی تربیت کے لیے مختلف انتظامات کیے جاتے تھے۔ تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ فوج کو حالتِ امن میں جنگی کاموں کے لیے تیار کیا جاتا۔ گھوڑ دوڑ کرائی جاتی، اونٹوں کی دوڑ ہوتی تھی، گدھوں کی دوڑ ہوتی تھی، آدمیوں کی دوڑ ہوتی تھی، کشتیوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے۔ اسی طرح تیراندازی کی بہت تربیت دی جاتی۔ اس پر انعامات دیئے جاتے۔ گھوڑ دوڑ میں جیتنے والوں کو انعام دیا جاتا۔ غرض فوج حالت امن میں بھی تن دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی فوجی تیاریاں ان کے جذبہ ایمانی پر مبنی تھیں۔ اس لیے مٹھی بھر آدمی ہمیشہ

تگنے، چوگنے، دس گنے دشمن سے بھی مقابلہ کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ دشمن کی اتنی تعداد ہے، ہم کیا کریں گے۔ وہ جان پر کھیل جاتے تھے اور خدا جل شانہٗ انہیں فتح دیتا تھا۔

ایک آخری چیز پر اسے ختم کرتا ہوں جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ جنگ کے دوران سپہ سالار کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھا ہے۔ کہ جب کبھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مقام پر حملہ کرتے اور علی الصبح طلوع آفتاب کے وقت جنگ کا آغاز ہوتا تو اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ آفتاب ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ دشمن تمازت آفتاب سے متاثر ہو اور آفتاب ہمارے پیچھے ہوتا کہ جنگ کے وقت آفتاب کی روشنی سے چندھیا کر دشمن سے مقابلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ایک دوسری چیز یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''موسمیات'' (Meterology) سے بھی دلچسپی تھی۔ ہواؤں کے رخ کا خاص طور پر علم تھا۔ اس کا خاص لحاظ فرماتے کہ دشمن سے جنگ ہو تو ایسے مقام پر ہو کہ ہوا ہمارے پیچھے سے چل رہی ہو، نہ کہ ہمارے سامنے سے آئے اور ہماری رفتار میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انا نبی الرحمة وانا نبی الملحمة'' یعنی میں رحمت کا بھی نبی ہوں اور جنگ کا بھی نبی ہوں۔ جس کا بعد میں دنیا کے بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس طرح بہترین سیاستدان اور بہترین مدبر کی حیثیت سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقصد کا حصول چاہتے تھے۔ آدمی کا خون بہانا یا دشمن کا خاتمہ کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر نہیں تھا۔

11

تقویمِ اسلامی

تقویم کا مسئلہ دلچسپ ہے اور اس پر ہمارے مؤلفین آج کل کم غور کرتے ہیں۔
عرب میں اسلام سے پہلے شمسی سال پایا جاتا تھا، جیسا کہ آج کل پایا جاتا ہے، جس طرح انگریزی سنہ کی وجہ سے سال کے موسم معین مہینوں میں آتے ہیں۔ لیکن اس کا نظام الگ تھا۔ مہینوں کا آغاز رویتِ ہلال سے ہوتا تھا اور مہینوں کا اختتام نئے رویت ہلال سے ہوتا تھا۔ یعنی خالص قمری مہینے پائے جاتے تھے، لیکن چونکہ قمری سال کے بارہ مہینوں میں چھ مہینے انتیسیئے اور چھ مہینے تیسیئے ہوتے تھے۔ اگر ہم شمار کریں تو ایک سال میں دنوں کی مجموعی تعداد تقریباً 354 دن بنتی ہے۔

موسموں کا جو فرق پیدا ہوتا ہے، کبھی گرمی، کبھی سردی وغیرہ، یہ آفتاب کی گردش کے باعث ہے۔ آفتاب کی گردش 365 یا 366 دنوں میں مکمل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدیم زمانے میں بابل والوں نے جب یہ معلوم کرلیا کہ قمری سال چھوٹا ہوتا ہے کوئی گیارہ، بارہ دن بہ نسبت شمسی سال کے، تو انہوں نے شمسی تقویم اختیار کرلی۔ مدینہ والوں نے دیکھا کہ اگر قمری سال پر عمل کریں تو فصل کاٹنے کا زمانہ، حکومت کو ٹیکس دینے کا زمانہ اور بیجوں کو بونے کا زمانہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کا ایک حل معلوم کرلیا اور وہ یہ تھا کہ تقریباً ہر تین سال کے بعد ایک مرتبہ بجائے بارہ کے تیرہ مہینوں کا سال کردیا جائے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو اس طرح تین سال میں تینتیس دن ہوں گے جو تقریباً ایک مہینے کے برابر ہیں تو (Grosso modo, roughly) ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا

اضافہ ہو جاتا تھا۔ کیلنڈر میں اس سال تیرہ مہینے ہوتے اور پھر اس کے بعد دو سال بارہ، بارہ ماہ ہوتے۔ پھر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ حساب ٹھیک نہیں۔ اپنے علم کی ترقی سے انہوں نے تحقیقات کے ذریعے اس نظام کو اور زیادہ ترقی دی اور کہا کہ اتنے سال کے بعد یعنی تین برس کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہوگا وغیرہ اس طرح وہ اس بات میں کامیاب ہو چکے تھے کہ زراعتی اغراض کے لیے قمری مہینوں کے ذریعے سے بھی شمسی مہینوں کی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ شہر مکہ میں بھی یہ نظام پایا جاتا تھا۔ اس کو زمانۂ جاہلیت میں ''نسی'' کا نام دیا گیا۔ میں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کروں گا۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ 'نسی' جس میں کبھی کبھی ایک تیرہواں مہینہ پڑ جاتا تھا، اس کا رواج رہا۔ مکہ میں حج کے باعث پورے جزیرہ نمائے عرب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی، آخری تین مہینوں کے سوا، اسی نظام کے تحت بسر ہوئی۔ آخری تین مہینوں کی ترکیب اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ''نسی'' کی منسوخی کا قرآنی حکم کے تحت اعلان فرمایا: ''انما النسیء زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاماً ویحرمونہ عاماً لیواطؤا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ ......'' (۹:۳۷) غرض اس کی منسوخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے صرف تین مہینے پہلے اور ذی الحجہ کے مہینے میں عمل میں آئی۔ اس اصلاح یا مخالفین اسلام کے الفاظ میں، اس نافہمی کی ترمیم کی وجہ سے کیا نتائج نکلے، اسے دیکھنا پڑے گا۔ نافہمی کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ دوبارہ خالص قمری نظام رائج ہو جانے کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسیشن میں دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً انہوں نے طے کیا تھا کہ رمضان کے مہینے میں ہر سال لوگ مال گزاری ادا کریں گے۔ پہلے ایک سال تو رمضان کے مہینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ فرق پیدا ہوتا گیا اور پھر یہ ہوا کہ رمضان آ جاتا تھا اور فصلیں کٹتی نہیں تھیں، کھیتیاں کھڑی رہتی تھیں وغیرہ۔ اس سے یہ تصور کر لیا گیا کہ اس بنا پر یہ اصلاح نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تخریب تھی، لیکن عہد نبوی کا رواج ہمیں اس کا جواب دے دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ نسی کی منسوخی کا اعلان ذی الحج ۱۰ھ میں کیا گیا لیکن غالباً اس کی پیش بندی میں کچھ عرصہ پہلے سے

ہی ایک اور نظام قائم کردیا گیا تھا، جس کے اشارات ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف مکتوباتِ نبوی میں ملتے ہیں۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں کو پروانے دیئے جاتے ہیں، ان سے معاہدے ہوتے ہیں یا ان کو کوئی جاگیر وغیرہ دی جاتی ہے تو اس میں صراحت ہے کہ یہ لوگ زکوٰۃ معین مہینے میں یعنی رمضان شوال وغیرہ میں نہیں دیں گے بلکہ فصل کٹنے پر ادا کریں گے۔ سب سے بڑی دشواری قمری سال میں یہی ہے کہ زراعتی اغراض کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زراعتی اغراض کے لیے لوگ اپنا ٹیکس یا مال گزاری قمری مہینے کے لحاظ سے ادا نہیں کریں گے بلکہ فصل کے کٹنے پر۔ لہٰذا ساری دشواریوں کا اس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے۔ باقی جو دوسرے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں، مثلاً تجارت پر یا معدنیات پر، اس میں اسی ترمیم کی وجہ سے، اس نظام کی تبدیلی کی وجہ سے اور شمسی سال کی جگہ قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے، حکومت کو ایک غیر معمولی فائدہ حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ جرمنی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس مصلحت کو آج روسی اور امریکی وزرائے مالیات معلوم کریں تو دونوں ہی قمری سنہ کو اختیار کرلیں گے اور شمسی سنہ کو رد کردیں گے۔ اس کی وجہ میں نے یہ بتائی کہ چونکہ شمسی سال سے قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ہر تینتیس سال میں شمسی لحاظ سے تو حکومت تینتیس مرتبہ ٹیکس وصول کرے گی، لیکن قمری سال کے حساب سے اکتیس مرتبہ ٹیکس لے گی۔ حکومت کو ہر تینتیس سال میں ایک زائد سال کے ٹیکس وصول ہوں گے۔ کون سا وزیر مالیات ہوگا جو اس زائد آمدنی کو قبول نہ کرے گا۔ تقویم کی اس تبدیلی کی وجہ سے، اس میں شک نہیں کہ قانون میں ایک طرح کی لامرکزیت (Decentralization) پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض چیزوں پر ایک زمانے میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور بعض چیزوں پر کسی دوسرے زمانے میں۔ یہ کوئی مصیبت کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک اور نقطۂ نظر سے جانچیں تو حکومت کے لیے بھلائی کی چیز تھی۔ معلوم نہیں آپ لوگوں کو واقفیت ہے کہ نہیں کہ آج کل حکومت کا خزانہ ٹیکس کے ادا ہونے سے عین پہلے خالی ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی فوری ضرورتوں، ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کے لیے رقم نہیں ملتی۔ تو وہ Debenture کے ذریعے سود پر قرض لیتی ہے۔ جب ٹیکس کی وصولی کے باعث خزانہ بھر جاتا ہے تو پھر وہ قرضے ادا کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شمسی سال کے

تحت سارے ٹیکس ایک معین مہینے میں آتے ہیں مثلاً زکوٰۃ یا زراعت کا ٹیکس ہے، فرض کیجیے وہ اگست کے مہینے میں ہمیشہ آئے گا۔ دیگر ٹیکسوں میں کچھ تو روزانہ کے ہیں اور کچھ نقدی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ ایک خاص زمانے میں خالی ہو جاتا ہے تو حکومت کے پاس روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مطلوبہ رقم نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت میں اس نظام کے تحت یعنی اس اصلاح کے تحت حکومت کے ٹیکس مختلف موقعوں پر وصول ہوتے ہیں۔ جو زراعتی ٹیکس ہے اس کا مہینہ الگ ہوتا ہے، دیگر ٹیکسوں کا زمانہ علیحدہ ہوتا ہے اور معدنیات، سونا اور چاندی وغیرہ کا زمانہ الگ مقرر ہوتا ہے۔ اس طرح حکومت کا خزانہ ہر زمانے میں بھرا رہتا ہے اور رہ سکتا ہے۔ یہ بات شمسی سال میں نہیں پائی جاتی۔ یہ ایک خاص پہلو تھا جس کی طرف مجھے اشارہ کرنا تھا اور شاید آخری جملے کے طور پر یہ عرض کروں کہ سارے اسلامی ممالک میں موجودہ شمسی تقویم یعنی انگریزی نظام چل رہا ہے۔ اس نظام میں باوجود علم کی ترقی کے اور انتہائی دقیق آلات کی ایجاد کے اب بھی رفتہ رفتہ فرق پیدا ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد پورے ایک دن کا فرق پیدا ہو جائے گا۔ عمر خیام نے بھی اپنے زمانے میں ایک نظام پیش کیا تھا۔ میں نے اس کا جو مقالہ پڑھا تھا، اگرچہ میں اُس کی تفاصیل سمجھنے سے قاصر رہا، البتہ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک دن کا فرق ایک لاکھ سال کے بعد پیدا ہوگا۔ اس کا نظام زیادہ پیچیدہ ہے، لیکن اتنا صحیح ہے کہ پورے ایک لاکھ سال میں بھی مشکل سے ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔

12

تبلیغِ اسلام

اور

غیر مسلموں سے برتاؤ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو پہلو جو حقیقت میں ایک ہی پہلو کے دو جز ہیں یعنی اسلام کی تبلیغ اور اس تبلیغ کو قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ، آج ہم ان کے بارے میں بات کریں گے۔ یہ برتاؤ کچھ تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا آپ کے ذاتی طرز عمل پر مبنی ہوگا اور کچھ ان احکام پر مبنی ہوگا جو قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ میرے علم میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو صرف اس موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تاریخی حیثیت سے دیکھوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا رہا اور کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ جل شانہٗ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ پھر اس کا جو رد عمل ہوا، اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ کیا رہا؟ کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مقابلہ کرتے رہے اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس کے کیا نتائج نکلے؟ ہمیں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ پہلے دن کی وحی میں تبلیغ کا کوئی حکم نہیں ہے۔ پہلی وحی سے آپ سب لوگ واقف ہیں کہ وہ سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیتیں ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو یہ حکم دیا گیا۔ اس کے بعد ہمارے مورخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال تک ایک

وقفہ رہا جس کے لیے فترہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی۔ لیکن دوسری وحی کے نہ آنے کے باوجود، یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ ان پہلی آیتوں میں صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تھے۔ میرے خیال میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ مکے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ وحی کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر واپس آ جاتے ہیں اور اپنے مکان میں پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرماتے ہیں: زملوني زملوني! (مجھے کمبلوں سے ڈھانپو، مجھے کمبلوں سے ڈھانپو) ظاہر ہے بیوی نے ایسے کیا ہوگا۔ کچھ تو اس سردی کی شدت کے اثر سے اور کچھ اس وحشت کی وجہ سے جو جبرائیل علیہ السلام کی آمد اور اُن واقعات کے مشاہدے کے باعث پیدا ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت غیر تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنانے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ کیا یہ شیطان کی کارستانی تو نہیں ہے؟ میں کوئی کاہن تو نہیں ہو گیا ہوں حالانکہ میں ساری زندگی ان لوگوں کو، جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، بُرا کہتا رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تسلی دینے کے لیے کہتی ہیں کہ یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم زندگی بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے ہو۔ غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کرتے رہے ہو۔ اس لیے خدا جل شانہٗ ایسے شخص کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ یقیناً خدا جل شانہٗ تمہیں شیطان کے حوالے نہیں کرے گا۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی نے ایک اور جملہ کہا کہ میرا چچازاد بھائی ہے اس کا نام ورقہ بن نوفل ہے۔ وہ ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتا ہے۔ کل صبح ہم اس کے پاس جائیں گے۔ تم اس کو اپنا قصہ بیان کرنا وہ تمہیں اعتماد سے بتا سکے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں، جو عیسائی تھا۔ دوسری روایت کے مطابق، اگلی صبح، غالباً حسب عادت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو حضرت خدیجہ رضی

اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو یہ واقعہ سنایا، یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی وہ ابو بکر کو یہ واقعہ سنائیں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا۔ ورقہ بن نوفل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف العمری کے باعث نابینا ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ سن کر اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ جو کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب تمہاری قوم تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گی اور تمہیں اپنے شہر سے نکال دے گی اُس وقت میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ کیا اس بات پر، کہ میں خدا جل شانہٗ کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤں، لوگ مجھ پر ظلم وستم کریں گے، اذیتیں دیں گے، اور مجھے اس ملک سے نکال دیں گے؟ تو ورقہ بن نوفل نے کہا، ہاں! کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کو اُس کی اُمت نے تکلیف نہ دی ہو۔ یہاں ایک اور چیز بھی قابل ذکر ہے کہ ورقہ بن نوفل کا یہ بیان اپنے اندر اس بات کا قرینہ رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کی، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور اسلام قبول کیا۔ یہ بات صاف اور صریح الفاظ میں نہیں ملتی لیکن اس گفتگو کے پیش نظر ان امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو قبول کر لیا کہ بے شک خدا جل شانہٗ کا فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، آپ کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مامور کرنے کے لیے آیا ہو گا۔

میں اب لفظ ناموس پر کچھ بحث کروں گا۔ عام طور پر اُردو میں یہ لفظ عزت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاق وسباق میں یہ معنی نہیں لیے جا سکتے۔ ہمارے بعض مفسر یہ کہتے ہیں کہ ناموس کے معنی قابل اعتماد چیز کے ہوتے ہیں۔ یہ معنی بھی یہاں مناسب نظر نہیں آتے۔ میں شاید یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ جس سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں ایک اور معنی مراد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورقہ بن نوفل عیسائی ہو چکے تھے۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیثوں میں بھی ہے، کہ انہیں سریانی زبان آتی تھی اور سریانی سے عربی زبان میں انہوں نے انجیل کا ترجمہ بھی کیا

تھا۔ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سریانی زبان میں موجود ایک یونانی لفظ ہو۔اگر اس مفروضے کی بنا پر ہم غور کریں تو فوراً اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔یونانی زبان میں توریت کو''نوموس'' Nomos کہتے ہیں۔مطلب یہ کہ اس کا جو پیغام نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ظاہر ہے کہ یہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ پھبتا ہے اور زیادہ مناسب و معقول لگتا ہے۔ان ابتدائی واقعات کے بعد، بجز مفروضات کے، یہ کہنا مشکل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا۔غالباً وہ بار بار مختلف لوگوں اور پوچھنے والوں کو اپنا واقعہ سناتے رہے ہوں گے کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھے یوں کہا اور مجھے یہ بتایا۔میں ایک چھوٹی سی بات کا تکملہ کرتا چلوں۔پہلی وحی کے سلسلے میں بلاذری کی ''انساب الاشراف'' میں کچھ تفصیلیں اور بھی ہیں۔مثلاً یہ کہ سورۂ اِقرأ کی پہلی پانچ آیتوں کے ابلاغ کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً استنجے کا طریقہ بتایا کہ اپنے جسم کو نجاست سے کس طرح پاک کریں۔اس کے بعد وضو کا طریقہ بتایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر تیار کرنا چاہیے۔پھر جبرائیل علیہ السلام نے امام بن کر نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی بن کر اسی طرح نماز پڑھی۔اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام چلے گئے۔ان حالات میں سیرت کی کتابوں میں یہ روایت پڑھ کر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، دونوں وقتاً فوقتاً کعبے کے سامنے اعلانیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔یہ نماز مکہ والوں کی عبادت سے، ظاہر ہے، مختلف تھی۔جس کے باعث لوگ حیرت سے انہیں دیکھتے تھے۔ابھی تک قرآن کی وہ آیتیں نازل نہیں ہوئی تھیں جن میں بُت پرستی کو بُرا بھلا کہا گیا تھا اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔لوگوں کو اس نئے دین کے متعلق استعجاب ضرور ہوتا ہوگا، لیکن ابھی ان میں کوئی عناد یا کوئی غصہ پیدا نہیں ہوا ہوگا۔بہر حال ان دنوں دو تین مسلمان نظر آئے ہیں۔حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ بیٹے بھی تھے، یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ، اُن کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔گویا

اولین مسلمانوں کی جماعت ان پانچ سات آدمیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسلام لانے کے بارے میں دو مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق، چونکہ وہ بہت کم سن تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر خود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرنے لگے۔ دوسری روایت جو غالباً کچھ عرصے بعد کی ہوگی، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کعبے کے سامنے جا کر نہیں بلکہ شہر کے باہر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ یہ دونوں چھپ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی ٹوہ میں پیچھا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ بھی وہاں کھڑے رہتے ہیں۔ نماز کے اختتام پر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز تھی؟ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہٗ کا حکم ہے اور میں اللہ جل شانہٗ کا نبی ہوں تو وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اسلام لانے کے بارے میں ایک تیسری روایت بھی ہے۔

ان اختلافی روایات کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیسری روایت، پہلی وحی نازل ہونے کے کم از کم تین سال بعد کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی تبلیغ کریں: وانذر عشیرتک الاقربین ٥ (۲۶:۲۱۴) [اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ جل شانہٗ سے ڈراؤ] چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدائی حکم کی تعمیل میں تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ بازار سے فلاں فلاں چیز خرید کر لاؤ اور بیوی سے کہا کہ ان سے ایک ضیافت کا اہتمام کرو۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھیجا کہ خاندان کے سارے گھروں میں (چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں کے پاس) جاؤ اور انہیں دعوت دو کہ فلاں دن اور فلاں وقت کھانے کے لیے میرے پاس آئیں۔ ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ کس غرض کے لیے بلایا گیا ہے۔ وہ آئے لیکن سب ایک وقت میں نہیں آئے اور پھر آخر تک بھی نہیں بیٹھے بلکہ الگ الگ مختلف وقتوں میں آتے اور کھانا کھا کر جاتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری شخص کے کھانا کھا چکنے کے وقت سوائے اس

آخری شخص کے کوئی اور آدمی موجود نہ تھا اس لیے اصل مقصد کہ خاندان کے لوگوں میں تبلیغ کریں پورا نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی تدبیر اختیار کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سامان خرید کر لاتے ہیں اور خاندان والوں کو اطلاع دیتے ہیں۔ اس مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احتیاطاً کہتے بھی جاتے ہیں کہ کھانے کے بعد تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ٹھہرنا، انتظار کرنا۔ چنانچہ اب کی بار سب لوگ اس تجسس میں بیٹھے رہے کہ دیکھیں وہ کیا بات ہے جس کے لیے ہمیں بلایا گیا ہے۔ کھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مخاطب ہو کر بتاتے ہیں کہ بُت پرستی کیوں بُری ہے۔ اللہ جل شانہٗ کو ایک ماننا کیوں ضروری ہے۔ پھر اس کے نتائج یعنی آخرت کی زندگی اور خدا جل شانہٗ کے سامنے حساب کا ذکر کیا۔ اس طرح کہ چند بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں۔

اس سلسلے میں طبری کی روایت بہت دلچسپ ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ اس تبلیغ کا غالباً آخری جملہ یہ تھا کہ تم میں سے جو شخص میری دعوت کو قبول کرے گا وہ میرا جانشین اور خلیفہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ، جو ابھی بچے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب قہقہہ مار کر ہنسا اور تالی بجا کر کہنے لگا، ابوطالب مبارک ہو۔ آج سے تم اپنے بیٹے کے ماتحت بن چکے ہو۔ اس سے ابوطالب کو خفت سی ہوئی، اس لیے وہ ساری عمر اس کے لیے آمادہ نہیں ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو قبول کریں۔ اس بیان کا منشا تبلیغ کا طریقہ بتانا تھا۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیسے ایمان لائے یا وہ کب ایمان لائے؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔

اس کے کچھ عرصے بعد دوسری وحی نازل ہوتی ہے جس میں یہ حکم آتا ہے کہ فاصدع بما تؤمر و اعرض عن المشركين (۹۴:۱۵) [جس چیز کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر بیان کرو، مشرکوں کی پرواہ نہ کرو] اس حکم کے آنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرح کی دہشت محسوس کرتے ہیں کہ سارا شہر بُت پرست ہے، اگر میں یہاں کے لوگوں کو برملا یہ کہوں کہ تمہارا دین غلط ہے اور تمہارے بُت تمہارے لیے حفاظت

اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے، تو لوگ خفا ہوں گے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پھر آ کر تشفی دی کہ اللہ جل شانہ' آپ کو نہیں چھوڑے گا، اللہ جل شانہ' آپ کی حفاظت کرے گا۔ غرض کچھ اس طرح کی تفصیلیں ہمیں سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر پہاڑی کے دامن میں، یا پہاڑی کے کسی بلند حصے پر، کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں، جیسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں فلاں قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں: جو لوگ اس قبیلے کے نہیں تھے، وہ چلے گئے۔ پھر اس کی ایک شاخ کا ذکر کیا کہ میں صرف اُن سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ غرض بجائے سارے شہر کے لوگوں کو خطاب کرنے کے اس کے ایک محدود حصے کو اُس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کیا۔ خطاب کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ اے بھائیو! اگر میں تم سے بیان کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے، دوسری طرف، ایک دشمن کی فوج آئی ہوئی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ ان کا جواب تھا کہ ہم نے تمہیں آج تک جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ اگر تم سنجیدگی سے کہتے ہو کہ واقعی کوئی دشمن اس طرف آیا ہوا ہے اور پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میں تم کو اس انسانی لشکر سے بھی بڑے ایک دوسرے لشکر سے ڈراتا ہوں، یہ اللہ جل شانہ' کا قہر اور عذاب ہے۔ اگر تم اللہ جل شانہ' کو ایک نہ مانو گے اور بتوں کی پرستش نہیں چھوڑو گے تو مرنے کے بعد اللہ جل شانہ' تمہیں دوزخ میں ڈال دے گا۔ اُس دن اور لوگوں کے علاوہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چچا ابولہب بھی وہاں موجود تھا۔ ابولہب نے جل کر کہا، کیا اس فضول بات کے لیے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا اور وہ چلا گیا، دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

اس وقت بے محل نہ ہوگا اگر میں یہ بیان کروں کہ ابولہب کو اپنے بھتیجے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کیوں تھی۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دونوں بھائی یعنی ابولہب اور ابوطالب کسی بات پر لڑ پڑے۔ اولاً ابولہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر طمانچے لگائے۔ اس کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جو ان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابوطالب کی کفالت میں تھے،

دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ابولہب کو ابوطالب کے سینے سے دھکیل کر ہٹاتے ہیں۔ اس طرح ابوطالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب وہ ابولہب کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ ابولہب جل کر کہنے گا، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! ابوطالب بھی تمہارا چچا ہے اور میں بھی تمہارا چچا ہوں۔ پہلے تو تم نے ابوطالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لیے کیوں نہیں آئے؟ خدا کی قسم! میرا دل تم سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔ بلاذری کی ''انساب الاشراف'' میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں، اور اُن کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا ہے۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بناء پر ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت پیدا ہو گئی اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اُسے اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دے دیا گیا۔

ان ابتدائی کوششوں کے بعد یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین غلط اور لغو ہے۔ جن چیزوں کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور جلد ہی وہ نوبت آ گئی کہ شہر کی حکومت اور سربرآوردہ لوگوں نے بھی انہیں اس بات سے منع کر دیا کہ خانہ کعبہ کے سامنے آ کر اپنے طرز کی عبادت نہ کریں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو اپنے مکان میں نماز پڑھتے یا گھر سے باہر کسی جنگل یا صحرا میں عبادت کیا کرتے۔ لیکن کافروں کی چھیڑ خانی میں کمی نہیں آئی۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں دیتے، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب پیش پیش رہتا۔ اسے پتا چلا کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپتے چھپاتے خانہ کعبہ کے سامنے آتے ہیں اور وہاں اپنے طرز کی عبادت یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گزرگاہ میں خاردار درختوں کی شاخیں لا کر ڈال دیتا اور مکان کی دہلیز پر گندگی اور غلاظت لا کر ڈالا کرتا تھا۔ یہ وہ رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ جل شانہٗ کا پیغام پہنچانے میں دشواری ہوتی رہی۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمت نہیں ہاری اور تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ ایک نئی مشکل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنا کرنا پڑا، وہ یہ کہ مکے کے باشندے وقتاً فوقتاً گلی کے لونڈوں کو ترغیب دلاتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جائیں، اُن پر پتھر پھینکیں اور انہیں یہاں سے نکالیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدتمیز لڑکے پیچھا کرتے تو مقریزی نے بیان کیا ہے کہ ایسے وقت اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتفاق سے ابوسفیان کے مکان کے قریب ہوتے تو ابوسفیان کے گھر میں چلے جاتے اور ابوسفیان مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس قدر شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتا کہ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتا اور گلی کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان سے اپنے گھر جاتے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد مقریزی نے بہت بعد کے واقعے کی طرف ایک چھوٹا سا اشارہ کیا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو فتح کرتے ہیں تو ہمارے مؤلف لکھتے ہیں کہ فوج کے ہراول دستے یا مقدمۃ الجیش میں ایک منادی کرنے والا تھا جو گلیوں سے گزرتے وقت بآواز بلند، چلا چلا کر کہتا جاتا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو شخص اپنے گھر کے اندر بند رہے، باہر نہ نکلے، امن میں رہے گا۔ جو خانہ کعبہ میں چلا جائے گا وہ امن میں رہے گا۔ اور آخری چیز جس کی طرف اس وقت توجہ دلانا مقصود ہے، وہ یہ کہ جو شخص ابوسفیان کے مکان میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔ مقریزی کہتے ہیں کہ یہ امتیاز اور خصوصیت اس واقعے کی بناء پر تھی کہ زمانہ قبل ہجرت جب کبھی مکے کے شریر بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے گھر جاتے تو ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس کے بدلے میں ابوسفیان کے مکان کو بھی پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔

اس تبلیغ کا سلسلہ کوئی چار پانچ سال جاری رہا۔ اس عرصے میں کفار کے ظلم و ستم اور اذیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ انہیں اپنے ملک میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر کچھ لوگ حبشہ چلے

گئے۔ رخصت ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ وہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا ہے جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ وہ لوگ حبشہ پہنچ گئے۔ اب چونکہ تبلیغ کی عام اجازت مل چکی تھی، اس لیے یہ مسلمان (مکے کے نومسلم مہاجر) حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں وہاں کافی تعداد میں یعنی کم از کم چالیس پچاس حبشی مسلمان ہو گئے۔ لیکن اس سلسلے میں انہیں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ جب مکے کے نومسلم ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکے کے مشرکوں نے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد نے جا کر یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں واپس لے جا کر پھر تکلیفیں دیں اور ستائیں۔ نجاشی نے صرف مطالبے کی بنا کر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ تم لوگوں کے متعلق الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ فساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں آ کر پناہ گزین ہو گئے ہو۔ تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ جواب دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں، ایک ذاتی استنباط آپ سے بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ہمیں ایسا بھی ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے چچازاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ پہنچے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے میں ایسی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر جو تیرے شایان شان نہ ہو۔ طبری میں یہ خط موجود ہے مگر اس میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ خط کب بھیجا گیا۔ سیاق وسباق سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ۷ ہجری سے پہلے کا خط ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور تعارف دیا گیا ہو، خط لے کر گئے ہوں اور نجاشی کو ۵ ہجری سے پہلے دیا ہو۔ کیونکہ ۷ ہجری میں مسلمان مہاجرین حبشہ سے مدینہ واپس جا رہے تھے۔ واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لیے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔ اس لیے مؤرخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین مکہ کی اولین جماعت جس وقت حبشہ گئی ہو گی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یہ تعارفی خط دیا ہو گا۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ تعارفی خط کیوں

دیا ہوگا، اگرچہ میں اس کی وجوہات سے باخبر ہوں۔ بہرحال مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان ہو جانے والے لوگ جہاں جہاں جاتے، اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق نئے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے، جس سے متاثر ہو کر لوگ ایمان لے آتے۔ چنانچہ جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب نجاشی کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقعہ ملا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ یہ لوگ ہم پر کیوں یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم فتنہ و فساد کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ کر سنائیں بالخصوص سورہ مریم کی، جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ وسلم خدا جل شانہٗ کے حکم سے بغیر باپ کے حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے مؤرخوں کا بیان ہے کہ یہ تفصیل سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ ان آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اتنے (اس تنکے کے برابر) بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہمیں مزید تفصیلیں نہیں ملتیں کہ آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہو گیا تھا۔ کیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق، جس دن نجاشی کی وفات کی مدینے میں خبر آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی دن غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر مسلم کے لیے نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ تو یہ گمان کرنا چاہیئے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوائی تھی۔

تبلیغ کے سلسلے میں یہ چند ابتدائی باتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ مشکل تر حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب حبشہ بھیجی ہوئی مشرکین مکہ کی جماعت اپنے مقصد میں ناکام ہوئی تو وہ لوگ بقیہ مسلمانوں کو زیادہ سختی سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگے۔ اور باتوں کے علاوہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے نہ کوئی شخص شادی بیاہ کے تعلقات رکھے، نہ ان کو بیٹی دے اور نہ ان سے رشتہ لے۔ نیز یہ بھی کہ نہ کوئی تجارتی چیز انہیں فروخت کرے، اور نہ ان کی دکان سے کوئی چیز خریدے، حتیٰ کہ اُن سے بات چیت بھی نہ کرے۔ یہ قرارداد انہوں نے لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دی اور یہ عہد کیا کہ ہم اس کی

خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ یہ بائیکاٹ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ انہیں یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بالآخر وہ بائیکاٹ ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اب شہر کے باشندوں سے بات چیت بھی ناممکن سی ہو گئی ہے اور لوگ اسلام کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، اُن کے ذہن میں تبلیغ کے لیے ایک نئی تدبیر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اس شہر کو چھوڑیں اور کسی اور جگہ جا کر تبلیغ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر طائف کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال رشتہ دار تھے، گویا ماموؤں کا علاقہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پُرامید ہو کر گئے لیکن وہاں مکے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ شکنی کی اور دھمکی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کا شہر چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ مجبوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے تو لوگوں نے گلی کے شریر لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا: ان پر پتھر پھینکو اور انہیں ستاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو جاتے ہیں شہر سے باہر آ کر ایک باغ دیکھتے ہیں جس کے دروازے پر ایک دربان مامور تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی اجازت سے باغ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ دربان ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اُس نے ان شریر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور اپنے مالک کی اجازت سے، جو مکے کا رہنے والا تھا اور اس وقت باغ میں موجود تھا، اس بے بس مہمان کی میزبانی کرنے لگا۔ کچھ پھل توڑ کر اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیے۔ اس وقت ایک واقعہ پیش آیا جسے شاید تبلیغ کا بالواسطہ طریقہ کہا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر انگور کے اُن دانوں کو کھانا شروع کیا۔ باغ کا مالی یا دربان حیرت سے پوچھنے لگا کہ تمہارے ملک میں یہ کیا طریقہ ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بتایا کہ میں نبی ہوں۔ اللہ جل شانہٗ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جو کام کروں، اللہ جل شانہٗ کا نام لے کر شروع کروں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دربان سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں عیسائی ہوں۔ میرا وطن نینوا کا شہر ہے (اسے آج کل موصل کہتے ہیں) ایسی مصیبت آئی کہ گرفتار ہوا، بک گیا اور اب غلام

کی صورت میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس شہر کے باشندے ہو جہاں میرا بھائی یونس علیہ السلام رہا کرتا تھا تو وہ عیسائی بے اختیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کو بوسہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں یونس علیہ السلام نبی رہا کرتے تھے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے رخصت ہو کر مکے کی طرف لوٹے۔ تھوڑی دور جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھک کر ٹھہر جاتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نماز کے بعد دکھے ہوئے دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے ہیں جو آج بھی ہم پڑھیں تو دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ کم وبیش اس طرح ہیں: کہ اے اللہ! میں تیرے احکام کی تعمیل کرتا رہا ہوں۔ تجھ سے اس لیے دعا کرتا ہوں کہ تو مصیبت زدوں کی ہمیشہ مدد کرتا ہے۔ تو غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ اور تو لوگوں پر رحم کرتا ہے اس طرح کے اور لفظوں کے بعد آپ کی زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ ان ساری مصیبتوں اور ناکامیوں کے باوجود میں یہ سب برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور میں اپنے مشن کو جاری رکھوں گا، اگر تو مجھ سے خفا اور ناراض نہیں ہے۔ یہ وہ عزم تھا جس کا انتہائی مصیبت کے وقت بھی اظہار ہوا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وطن، شہر مکہ سے دور تھے۔ شہر طائف، جہاں پناہ لینے لگے تھے وہاں ناکامی ہوتی ہے، کوئی یار و مددگار نہیں ہے، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اے اللہ، اگر ان مصیبتوں کا باعث تیری ناراضگی نہیں ہے تو اے اللہ! میں اس کام کو برابر جاری رکھوں گا۔ یہ ایک امتحان تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہوتے ہیں۔ اس نماز سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو ایک سورة نازل ہوئی جس کے الفاظ یہ ہیں کہ قل اوحی الیّ انه استمع نفر من الجن ...... (۷۲:۱)۔ [آپ کہہ دیجیے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ جنوں کا ایک گروہ مجھے سن رہا ہے] اس سے میں تو یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ان کو دیکھا اور نہ ان کے وجود کو محسوس کیا۔ جب تک خدا جل شانہٗ نے اطلاع نہیں دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع بھی نہیں ملی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کے لیے بھی نبی تھے اور جنات

کے لیے بھی۔ اگر انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کرتے ہیں تو کم از کم جنات کا ایک گروہ تو اسلام قبول کر رہا ہے۔ یہ روشنی کی پہلی کرن تھی۔ جو اس تاریکی اور مایوسی کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی دیتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آہستہ پیدل مکہ واپس جاتے ہیں۔ یہاں ایک نئی مصیبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ شہر مکہ چھوڑنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قومیت ختم ہو گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک شہر مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک شہر مکہ کا کوئی باشندہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ نہ دے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بدوی شخص کو کچھ رقم دے کر بھیجتے ہیں کہ فلاں آدمی سے جا کر کہو کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ جاتا ہے مگر واپس آ کر کہتا ہے کہ اس شخص نے انکار کر دیا ہے۔ اُسے کچھ اور انعام دے کر ایک اور شخص کے پاس بھیجتے ہیں، وہ بھی انکار کرتا ہے۔ پھر ایک تیسرے شخص کے پاس بھیجتے ہیں وہ قبول کر لیتا ہے اور اپنے بچوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہتھیار بند ہو کر آتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے کر مکے میں داخل ہوتا ہے۔ حسب رسم اولاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری تھا کہ کعبے کا طواف کریں اور پھر گھر جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الاعلان کعبے کا طواف کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر جاتے ہیں۔ یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ طائف کے اس سفر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بڑے حامی اللہ جل شانہٗ کو پیارے ہو چکے تھے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اسی مایوسی کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر چھوڑ کر طائف گئے تھے۔ اس شہر مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اجنبیوں کی طرح تھی جو مقامی باشندوں میں سے ایک کی پناہ میں رہتے تھے۔ جس سے میں یہ معنی اخذ کرتا ہوں کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر میں آزادی نہیں تھی کہ سیاست میں حصہ لیں، یعنی تبلیغِ دین کریں۔ اس کا حل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا۔ وہ یہ کہ شہر مکہ کے رواج کے تحت لوگوں کو ہر سال حج کے زمانے میں ایک طرح کا امن عام مل جاتا تھا۔ چنانچہ جو لوگ مجرم اور قاتل ہوتے تھے اور سارا سال چھپے رہتے تھے وہ بھی حرام مہینے میں، یعنی حج کے زمانے

میں، کھلم کھلا باہر نکل سکتے تھے اور آ جا سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ شہر مکہ کے لوگ تو اسلام کے دشمن ہیں، ممکن ہے بیرونی قبائل یا غیر ملکوں سے آنے والے حاجی اسلام کو قبول کرلیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ کافی جدوجہد کے بعد اس میں کچھ کامیابی ہوئی۔ ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم سے کم پندرہ قبائل میں گئے۔ ہر ایک کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہے کہ تم اسلام قبول کرو، اس کی یہ خصوصیات ہیں۔ جلد ہی قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تمہارے قدموں پر نثار ہو جائیں گی۔ مگر کسی نے قبول نہیں کیا، سوا آخری سولہویں گروہ کے، جس میں صرف انصار کے چھ آدمی تھے۔ وہ یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ گویا آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کرتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔

بات یہ تھی کہ شہر مدینہ میں بہت سے یہودی بستے تھے اور ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی عربوں اور یہودیوں کا مدینے میں جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے، ذرا ٹھہر جاؤ، آج تو تم ہمیں مار رہے ہو لیکن جلد ہی آخری نبی آنے والا ہے، جب وہ آئے گا تو ہم اس کی اتباع کر کے تم کو دنیا سے نیست و نابود کر دیں گے۔ تمہارے بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد، سب کو قتل کر دیں گے۔ ان مدینے والوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو کیوں نہ یہودیوں سے پہلے اسلام قبول کرلیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بزبانِ بے زبانی گفتگو کرتے ہیں۔ پھر سب لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ ان کا اسلام مخلصانہ تھا۔ چنانچہ مدینے پہنچ کر وہ سب لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ ایک سال بعد امن کے زمانے میں، یعنی حج کے مہینے میں، مدینے سے بارہ آدمی مکے آتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اس بیعت کے بعد ہمیں چند مناظر ایسے نظر آتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بارہ آدمیوں کو، جو بارہ مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے، اپنی طرف سے ان قبیلوں میں نائب یا سردار مامور کیا۔ اس میں ایک طرف تو

ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں تنظیم تھی اور مسلمانوں میں ایک مرکزی نظام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نامزد کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت تھے۔ جو کسی کو نامزد کرتا ہے وہ اس کو معزول بھی کر سکتا ہے۔ اس نامزدگی کے بعد وہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معلم دیجئے جو اسلام سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہو اور مدینے میں ہمیں دین بھی سکھائے اور تبلیغ بھی کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے اور نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ اُن میں لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انہیں بہت ہی شاندار کامیابیاں ہوئیں۔ بیسیوں لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ انتہائی اُجڈ لوگ بھی اسلام قبول کرتے گئے۔

اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک دن حضرت مصعب نے ایک باغ میں جا کر وہاں کے لونڈی غلاموں اور بچوں کے سامنے تبلیغ شروع کی۔ مالک کو یہ تماشا بُرا لگا۔ اُس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اس کو ڈانٹ کر نکال دو کہ ہمارے باغ میں اس طرح بلا اجازت آ کر کیوں فساد کر رہا ہے؟ وہ شخص پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا۔ اُس نے بہانہ کیا اور جا کر مالک کو بتایا کہ میں نے اُسے بہت ڈانٹا مگر وہ نہیں مانتا، تم خود جا کر اُسے نکالو۔ اصل میں اس کا منشا یہ تھا کہ یہ مالک بھی اسلام کی باتیں سنے اور اُس شخص کی زبان سے سنے۔ جو اپنی جادو بیانی اور طلاقت لسانی سے ہر شخص کو اسلام کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ سردار بڑے طنطنے سے نیزہ ہلاتا ہوا آیا اور دھمکی دی کہ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرانے کی بجائے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ معلوم کیے بغیر کہ میں کیا کہہ رہا تھا، تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم پہلے سن لو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے، تم کہو گے تو میں چلا جاؤں گا۔ وہ اُجڈ شخص اپنے نیزے کو زمین میں گاڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ انہوں نے حسب عادت قرآن مجید کی ایک سورہ کی تلاوت کی۔ تلاوت شروع

ہوتے ہی اس کو سکون آ گیا۔ چہرے پر خشونت کی جگہ ایک نئے شعور کی روشنی بکھر گئی۔ پھر قبل اس کے کہ سورہ کی تلاوت ختم ہوتی، وہ شخص اُٹھا اور پوچھنے لگا کہ مجھے مسلمان ہونے کا طریقہ بتاؤ۔ چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی عادت کے مطابق سابقہ اُجڈ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے زور سے نیزہ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کے اندر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آؤ، سب میرے پاس آؤ۔ چنانچہ عورتیں، بچے اور غلام سب بھاگ کر اس کے پاس آتے ہیں۔ اُس نے سب سے پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ سب نے کہا آپ ہمارے سردار ہیں۔ تب اس نے کہا میرا حکم ہے کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم مجھ سے زیادہ کسی کو اپنا دشمن نہ پاؤ گے۔ اس نیزے سے میں تم سب کو ایک ایک کر کے مار ڈالوں گا۔ اس طرح پورا خاندان مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب سردار مسلمان ہو تو ظاہر ہے کہ سردار کے ماتحت لوگوں کا مسلمان ہو جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسلام پھیلنے کے یہ مختلف طریقے نظر آتے ہیں۔

یہ چیزیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری زمانے تک ملتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اور دے کر میں اس بیان کو ختم کروں گا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں ایک اجنبی مہمان آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کھانے کو دیتے ہیں اور رات گزارنے کے لیے کمرہ بھی دیتے ہیں۔ وہ شخص بد نیتی اور دشمنی کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ علی الصبح کمرے میں بستر پر غلاظت کر کے قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں، اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ صبح کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اس کو دھویا، بستر کو پاک صاف کیا۔ پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے۔ کچھ دور جا کر اس اجنبی کو بھی تلوار یاد آئی اور آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سو رہے ہوں گے، میں تلوار لے کر پھر واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اُس نے دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بستر کو صاف کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم اپنی تلوار بھول گئے تھے، یہ تلوار رکھی ہے، لے لو۔ اس سلوک کے نتیجے میں وہ بے ساختہ پکار اٹھا: "اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ واشھد ان محمداً رسول اللّٰہ"۔

ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں۔ فوج کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتا ہے۔ دور تو نہیں بھاگتا، کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھ کر کسی درے یا وادی میں چلا جاتا ہے۔ اس دشمن قبیلے کا سردار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے دُور تاکتا رہتا ہے کہ یہ فوج کیا کرتی ہے۔ اس دن بارش ہوئی۔ چنانچہ بارش کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اور اپنا کرتہ درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ دشمن جو اوپر سے تاک رہا تھا، دیکھتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا سوئے ہوئے ہیں۔ آتا ہے اور تلوار کھینچ کر چلا کر کہتا ہے (عربوں کا طریقہ تھا کہ سوئے ہوئے کو مارا نہیں جاتا تھا یہ Chivalry کے خلاف تھا): اے محمدؐ! تجھے اب میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی سکون کے ساتھ کہتے ہیں: ''اللہ'' اس جواب سے اس پر اتنا رعب ہوا کہ ہاتھ میں تھرتھری پیدا ہو گئی اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ تلوار کو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اٹھا کر کہتے ہیں: ''اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا''؟ وہ کہتا ہے: ''کوئی نہیں''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو اُس کی تلوار واپس کرتے ہیں کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ وہ اس مرحمت پر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب میں اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔ اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عام معافی کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے ردعمل کے طور پر لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے ہیں اور راتوں رات سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ تھے وہ طریقے جو تبلیغ اسلام کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے اور نتیجہ ہمیں واضح نظر آتا ہے۔

اس سے پہلے کے انبیاء کی زندگی میں ان کے ہاتھوں پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد کا ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی سے مقابلہ کریں تو یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی فوقیت نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس آدمی ایمان لائے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی قوم بنی اسرائیل

کے لوگ جن کی تعداد پانچ لاکھ تھی، ان کا ساتھ دے رہی تھی، لیکن ایک خود غرضی کے تحت تاکہ فرعون سے ظلم سے نجات پائیں۔ سچے دل سے ایمان لانے والوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ خدا جل شانہٗ نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں فلسطین کا ملک دے گا، آگے بڑھو اور اس ملک پر قبضہ کر لو۔ تو انہوں نے کہا کہ ان جباروں سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے خدا نے وعدہ کیا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں فلسطین پر حملہ کر و اور قبضہ کر لو۔ پھر ہم آئیں گے اور اس ملک میں رہیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ساری قوم کافر اور نافرمان ہو جاتی ہے۔ آپ کی بات قبول کرنے اور ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف دو آدمی تھے۔ جنہوں نے ایسا نہیں کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی: ایک آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور دوسرے آپ کے خادم حضرت یوشع جو بعد میں نبی بنے۔ ان دو کے سوا سارے بنی اسرائیل میں سے کسی نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ (۱۲) بہت ہی مخلص حواری تھے۔ اُن میں سے سینٹ پیٹر کا آپ نے نام سنا ہو گا جن کی قبر (ویٹی کان) اٹلی میں ہے۔ اُن کے متعلق انجیل ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: جاؤ شیطان'۔ یہ ان کی کسی حرکت یا طرزِ عمل کی بنا پر کہا ہو گا۔ تفصیلات ہمیں معلوم نہیں۔ ایک اور حواری تھا جس کے متعلق تو صراحت ملتی ہے کہ اُس نے ارتداد اختیار کیا۔ پولیس کو حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی ضرورت تھی اور وہ انہیں تلاش کر رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غائب ہو گئے تھے۔ تو اُس ساتھی نے جو مرتد ہو گیا تھا، پولیس کو مخبری کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرا دیا۔

اس کے برخلاف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی تعداد کا ایک حد تک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ حجۃ الوداع جو وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے، اُس کے متعلق ہمارے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس وقت میدان عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار ۱۴۰،۰۰۰ آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اسلام میں حج کوئی ایسا فریضہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو ہر سال ادا کرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ جتنے لوگ مسلمان ہو چکے تھے

سب کے سب وہاں اس سال حج کے لیے نہیں آئے تھے۔ کچھ لوگ گھروں میں رہے، کچھ لوگ آئے۔ اگر بالفرض ہر پانچ میں سے ایک شخص آیا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پانچ چھ لاکھ ہو گی۔ کہاں دس بارہ آدمی، کہاں لاکھوں کی تعداد۔ ہمیں اسلام کی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد شاذ و نادر ہی کسی نے ارتداد کیا ہو، عہد نبوی میں ارتداد کی ایک آدھ مثال ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد نہیں ہوئے بلکہ وہ منافق تھے۔ منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن جب اُن کی چلی نہیں تو بھاگ نکلے اور پھر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ غرض یہ چند خاص باتیں ہیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے متعلق اسلام کا برتاؤ کیا ہے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ اس آیت سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہوگا "لا اکراہ فی الدین" (۲:۲۵۶)؛ "ان علیك الا البلاغ" (۴۲:۴۸) یعنی اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔ پیغمبر کا فریضہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے، اُس کے بعد نتیجہ اللہ جل شانہٗ کے ہاتھ میں ہے۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ قرآن میں یہ عجیب و غریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خود مختاری دی جائے حتیٰ کہ نہ صرف عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون، اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ کرائیں۔ کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی کئی آیتوں میں ذکر ہے۔ جن میں سے ایک آیت بہت ہی واضح ہے۔ "ولیحکم اهل الانجیل بما انزل اللّٰہ فیه" (۵:۴۷) یعنی انجیل والوں کو چاہیے کہ اُس چیز پر عمل کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبوی ہی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات، قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے۔ اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی آزادی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی

ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت، ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے، جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و امان سے متمتع ہوتی ہے جب کہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سر کٹاتے ہیں۔ لہٰذا فوجی ضروریات کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عائد کیا جاتا ہے، جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران اور روم میں بھی جو لوگ فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے، ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت ہی خفیف ٹیکس دے کر، جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا، اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوئے دولت کماتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز غیر مسلموں کے متعلق ہمیں نظر آتی ہے کہ محض دین کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۲ھ میں جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں کے جو مسلمان مہاجرین متمکن ہیں ان کو نئے نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کر لیں اور اُن کو تکالیف دیں۔ جب اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو مورخوں نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن اُمیہ کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لیے حکمران کو آمادہ کرے۔ حالانکہ عمر بن اُمیہ حمزی اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں یہودی رہتے تھے۔ اگر اُن کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس بچے کی عیادت کے لیے اُس کے گھر جایا کرتے۔

یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں کے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں، یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں گزرتا اور اتفاق سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو

جاتے، تاکہ اُن کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اُس کی نظیر ہمیں تاریخ عالم میں کم ملتی ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کی طرف اشارہ کر کے میں اُسے ختم کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اُس فریق کا ساتھ دیتے، نہ اِس فریق کا ساتھ دیتے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال اُنہیں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قیصر روم نے پیام بھیجے اور وہاں کے اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے کہ تم بغاوت کرو۔ میں بھی اُس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا اور ان سے ہم نجات پائیں گے۔ اُس ابتدائی زمانے سے لے کر صلیبی جنگوں تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کیے، تو اُن کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کرتے تھے اور اُن کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی و خودمختاری دیتے تھے، حتیٰ کہ اُن کے مذہبی اداروں کی مدد کی بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو، جو دوسرے شہر کے تھے، یہ خوشخبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے۔ لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی، اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کی مدد کرتی ہے۔

دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

عہدِ نبویؐ کی ایک اہم دستاویز

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لیے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو پابند پاتا ہے [۱]۔ عموماً جب بھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انہیں کتاب کا نام دیا گیا (Scripture) اور (Bible) کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنگیز خاں کے یاسہ [۲] کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے، اور "کتاب اللہ" مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد وقوانین ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہدِ نبوی سے پہلے نہیں مل سکی۔ بلاشبہ منوسمرتی (۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے اور کوتلیا کی آرتھ شاستر (۳۰۰ ق م) اور اسکے ہمعصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان [۳] (۱۵۸) [۴] کے دستور بھی لکھے تھے جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی

---

[۱] Grammar of Politics by H.J. Laski میں بھی یہی نتیجہ استقرا نکلا ہے۔

[۲] سالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطہ پاریس۔ مقریزی وغیرہ نے بھی یاسہ کے احکام کا اقتباس محفوظ کیا ہے جسے اب روسی مؤلف دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔

[۳] Aristotle on the Othenion Constitution by Kenyon P.XV.

[۴] Encyclopaedia of Social Sciences نیز P.XII

پچاس سال قبل مصر میں بردی کاغذ (پاپیروس) پر محفوظ مل چکا ہے اور ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن سب یا تو درسی اور مشوارتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدر اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستور مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

۱ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہٖ ابن اسحاق اور ابوعبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے، اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن (۵۳) جملے، یا قانونی الفاظ میں ''دفعات'' ہیں اور اُس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں۔ اس کی اہمیت اسلامی مورخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ ولہاوزن، میولر، گریمے، اشپرنگر، ونیتنک، کائتانی، بول ۱ وغیرہ کے علاوہ ایک انگریز مورخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مؤلفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور اس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مؤلفوں کے بیانات کی تنقید کے لیے بڑا وقت چاہیے جو اس لیکچر۲ میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہلِ ملک نے ابتداً حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر

۱۔ حوالے مضمون کے آخر میں دیے گئے ہیں۔

۲۔ موتمر دائرۃ المعارف، العثمانیہ، حیدرآباد۔

تھے اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بیزنطیہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرت ﷺ اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیاداروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے۔[1] لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کے ایک جونیئر فرد کی حیثیت میں آپ کی سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت ﷺ کی رشتہ داری طائف [2] اور مدینے [3] کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے، مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپ ﷺ کے گرویدہ بنے، اور مدینے آنے پر آپ کو اور آپؐ کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسلمانانِ مکہ ہجرت کر کے مدینے جانے لگے۔ مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں، اس لیے خود حضرت ﷺ کے مکان کا محاصرہ اور شب خون کی تجویز پختہ کی گئی، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرت ﷺ بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینے پہنچ گئے۔ جھنجھلاہٹ میں مکے والوں نے آپ ﷺ کی [4] اور دوسرے مہاجروں [5] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلط جما لیا۔ مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اُس وقت اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا، وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقاتِ خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس

---

1. ابن ہشام ص ۲۷۸، نیز طبقات ابن سعد احوال قبل الہجرۃ۔
2. معارف ابن قتیبہ ص ۴۳، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون۔
3. ابن ہشام ص ۱۰۷، ۳۳۶، ۳۴۶، طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۳۴، ۳۵، ۴۶، معارف ابن قتیبہ "احوال عمومتہ" تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷۷ تا ۱۷۹ وغیرہ۔
4. بخاری، کتاب ۶۴ باب ۸۴ حدیث ۳، یہ مکان بی بی خدیجہؓ سے آنحضرت ﷺ کو وراثت میں ملا تھا۔ (مبسوط سرخسی ۱۰/۵۲)
5. ابن ہشام ص ۳۴۹ ج ص ۳۲۱ تا ۳۲۲، نیز بنی جحش کی جائداد پر ابوسفیان کے قبضے اور فروخت کے لیے محمد بن حبیب کی المنمق (مخطوط) ص ۱۸۵۔

سرکاری عہدے تھے، جس کا تفصیلی ذکر میں نے حال ہی میں ٹرونڈرم کے موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا [1] ہے۔

اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی، اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے تو یہودی بنوالنضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں، ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب، کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہوکر باقی عربوں اوران کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آچکے تھے [2]۔ اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے [3]۔ لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہورہا تھا اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کررہی تھی کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنادیں، حتیٰ کہ بخاری [4] و ابنِ ہشام وغیرہ کے مطابق اس کے تاجِ شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہوچکی تھی۔ بے شبہ آنحضرت ﷺ نے بیعت عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کرکے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا۔ تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتدبہ لوگ مسلمان ہوچکے تھے، مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا [5]۔ اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرت ﷺ مدینہ آتے ہیں، جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:

---

[1] مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء مضمون، گزشتہ شہری مملکت مکہ۔

[2] ابن ہشام ص ۲۸۷، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۱۴۷، مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷، بخاری، کتاب ۶۳ باب ۱، ۲۷، ۴۶۔

[3] ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰۔

[4] بخاری، کتاب ۷۹، باب ۲۰۔

[5] سیرت ابن ہشام ص ۲۷۷، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ و مابعد، نیز قرآن مجید سورہ نمبر ۶۳ آیت نمبر ۱ کی تفسیر۔

(۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

ان ہی اغراض کے مدنظر آنحضرت ﷺ نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی [۱] ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفے کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاصِ متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانونِ ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا، تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنی خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنی دستور العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ شہری مملکت قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

ہابس، روسو وغیرہ ''معاہدہ عمرانی'' کے نظریے کے تحت مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بیّن اور واقعی مثال ہم کو بیعتِ عقبہ میں ملتی ہے۔ جس میں مدینے والوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپؑ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ انّ الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابًا موقوتًا. انَّ کِتَابَ الابرار [۲] لَفِی عِلِیِّین. کُتِبَ عَلَیْکُمْ

---

[۱] ابن سعد ج ۲/ ۱ ص ۱۹۔ کتاب الاموال ابی عبید ۵۱۸۔

[۲] ابرار کے نامۂ اعمال کا جنت میں جانا بے معنی بات ہوگی۔ میں اس کے معنی یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں رہیں گے۔

التقال وغیرہ میں لفظ ''کتاب'' اسی معنی میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ (Vorschrift) انگریزی لفظ (Prescription) فرانسیسی لفظ (Prescipend) اور ہسپانوی (Prescipcisn) (بمعنی فرض وحکم) کا مادہ بھی ''کتاب'' ہی کے معنی رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اُس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی ﷺ نے یہ تجویز کیا کہ ''ایک حکمران ایک قانون''۔ ابھی تک زکوٰۃ اور حج کے مرکز کش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا، پھر بھی ایمان واعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے، ایک ہی نبی صلعم کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر ایک ہی سمت نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لیے انقلابی اصلاح وترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفریں کارنامہ اسی دستاویز میں ریکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت ﷺ نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لیے محفوظ فرما لیے مگر ایک نہایت اہم اور قابلِ ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کیے، اصل سرچشمہ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی اُمت کے لیے لائے ہوئے احکام اپنے اوپر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیئے۔ اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر[1] ہوئے ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے (King can do no wrong) (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب

---

[1] ابن ہشام ص ۹۴۴، نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت ﷺ و سیرۃ شامی، بر موقع۔ جہاں چھ آٹھ مقدمون کا ذکر ہے۔

ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالتی دارو گیر سے محفوظ نہ رہ سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:

حصہ اوّل میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہاوزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یورپی مؤلفوں نے ولہاوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبر دیئے، البتہ ضمن الف و ب کر کے دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دیئے تاکہ یورپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ فقروں پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی۔ میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۳) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہوگی۔ مسلمان مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نووارد اجنبی کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دے دینا کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے بزرگانِ خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی اُن کے خوردتر رشتہ دار انہی کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پا سکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ عربی قبائل جو مشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور

جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریشِ مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلیفی توڑنے، تعلقات منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جانبدار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کیے گئے اور انہیں اس کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مؤلفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادر کشی اور باہمی لڑائیوں سے اُکتا گئے تھے اور تنگ آ کر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمران بنا کر آئندہ امن کی زندگی بسر کریں [1]۔ یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا۔

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت ﷺ کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم، یعنی یہودیوں کا دستور العمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لیے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا ملکر رہنا اور الگ مستقل رہ کر نچنت اور محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انہیں یہ مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے، اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مؤرخ عام طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱ھ میں دستاویز کا حصہ اوّل مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب [2]

---

[1] ملاحظہ ہو اوپر ص د۔ [2] تحت کلمہ "ربع"۔

میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیے گئے ہیں۔ ایک جملے میں اُسے "فی کتابہ للمهاجرین والانصار" کہہ کر آسے "دستور العمل مہاجرین و انصار" سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں "ووقع فی کتاب رسول اللہ صلعم لیهود" "دستور العمل یہودیان" کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ ایک اور راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن ا۔ میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگِ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا، اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہین، ایک اسلامی و عربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے۔ ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جوان سب کے تابع و لاحق رہ کر اس کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت "محمد یعنی رسول اللہ" کے احکام کی اطاعت کرے گی۔

ف ا اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذاتِ خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں و جھگڑوں میں ان سے ہی رجوع ہوں گے اور اُن کے فیصلے کو آخری مانیں گے۔

(۲۳) یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے اُمت واحدہ سمجھی جائے گی اور تمام دُنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی۔ اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے۔

ف ۲ باوجود کمی تعداد و کمزوری و خطرات کے، ان میں خودداری اور راہِ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کیے گئے۔ (۱۳،۲) جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہو سکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اُس میں برابر کا حصہ لیں گے۔ عین حالتِ جنگ میں بھی نوبت یہ

ا۔ سنن ابی داؤد کتاب نمبر ۱۹، باب نمبر ۲۱

نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے۔

(۱۷، ۱۸) جنگ و صلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے۔ البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنیٰ ترین شخص کے دیے ہوئے وعدۂ پناہ کا بھی پوری اُمت احترام کرے گی۔ (۱۵) اور اس طرح اخوت و مساوات اور آزادیٔ عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری و ساری کر دی گئی۔ پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوقِ رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوقِ حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں۔

(۲۰ ب) اس دفعہ کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ جن کا امام بخاری [۱] نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگِ بدر سے پہلے پیش آئے تھے۔ ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بناء پر اُن کی جائیداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بے شبہ اس دفعہ میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو دی گئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی۔ بعد میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے بعد یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دُکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا۔

(۱۹) عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالتِ مرافعہ جہاں ذاتِ رسالت پناہی صلعم کو قرار دیا گیا، وہیں ہرجے اور خون بہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لیے قدیم نظام بیمہ کی توثیق و تشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اس طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اس کے اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے۔

---

[۱] بخاری کتاب ۴۰ باب نمبر ۲ نیز کتاب نمبر ۶۴ باب ۲۔

(۴) اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے۔ کوئی محلہ وار فنڈ یا خزانے کا پتہ تو نہیں چلتا ۱؎ غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا یہ محلہ وار مجالیس بڑی حد تک خود مختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی و سماجی اغراض کے لیے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا۔

(۳) اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلہ دار مجلس اپنے کسی اہل محلہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی۔ (۱۲) اور یہ بھی صراحت سے بتایا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہو یعنی کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا۔

(۱۲ب) اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنائے، (ایضاً بروایت ابن حنبل) انصاف رسانی کا اختیار افراد سے لے کر جماعت یعنی مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی بیخ کرنے بلکہ خود حقیقی بیٹے تک کو بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں۔

۱؎ لیکن بنوالنضیر کے یہودیوں میں قبیلہ داری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم و کان سید بنی النضیر زمانه ذلک و صاحب کنزهم ...... یعنی بالکنزھنا المال الذی کانوا یجمعونه لنوابیهم وما یعرض لهم، یعنی سلام بن مشکم اس زمانے میں بنوالنضیر کا سردار اور ان کا افسر خزانہ تھا...... خزانے سے مراد یہاں مال ہے جو وہ اتفاقی حوادث اور ضروریات کے لیے جمع کیا کرتے تھے)۔

(۱۳) قتلِ عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لے کر قصاص سے درگزر کرے اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی۔

(۲۱) اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں۔

(۱۴) اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے، اگر کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو اُن کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے۔ اُن کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ اتحادِ عمل پر آمادہ ہوں تو انہیں سب مسلمانوں کے برابر حقوقِ رعیت حاصل ہوں گے۔ ان کی حفاظت و مدد کی جائے گی .... اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ (۱۶)

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اوّل میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔ حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحادِ عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم صرف (۲۴) میں بیان ہوا ہے بلکہ (۳۷ الف اور ۳۸) میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً (۴۵ ب) کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ (علیٰ کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم) جس کو ابو عُبید نے "حصتھم والنفقھۃ" لکھا ہے۔ اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں

یہودی بہت بدنام تھے۔ ان کی بدمعاملگی کو "لیس علینا فی الامین سبیل" اور منھم مَن ان تامَنه، بدینارٍ لایؤدّه الیک" وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت ازبام کیا گیا ہے۔

جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انہیں مالِ غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابوعبیدہ نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے۔ [1] یہودیوں نے بھی آنحضرت ﷺ کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت ﷺ کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیسا کہ (۴۲) میں نہایت صراحت سے قرار دیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ (۲۵) میں "یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر" کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود (۴۲) میں ابن اسحاق کی روایت میں "محمد رسول اللہ صلعم" اور ابوعبید کی روایت میں "محمدٌ النبی" کے الفاظ برتے گئے ہیں اور (۴۷) میں ابن اسحاق کے ہاں "محمدٌ رسول اللہ" کا کلمہ مکرر آیا ہے تو ابوعبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت ﷺ کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیونکہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت ﷺ کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نبی" یا "رسول اللہ" کا لفظ آنحضرت ﷺ نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جرأت نہ کی۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے استعمال کے متعلق سیرۃ "ابن ہشام ص ۹۹۲ سطر ۳ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطورِ دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔

اس ذیلی بحث کے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر کیا گیا اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علیحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے

---

[1] روض الانف "السہیلی ج ۲ ص ۱۷۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۷۔

جنگ کی یا نہیں، مدینے کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انہوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا، منسوخ نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دستور میں خون بہا کی ادائی میں اہلِ قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دیے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنو النضیر سے اسی قرارداد مندرجہ (۳۱،۲۵) کے تحت آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ [1] یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی (25) اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنہیں موالی بطن، اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے، حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے۔ (۳۲، ۴۰، ۳۴، ۴۵، ۴۶) ۔ البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا۔ (۴۱)۔

یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ (۳۷، ۴۱ اور ۴۵) میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان، یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی (۴۵) نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں ان کی شرکت آنحضرت ﷺ کی اجازت پر منحصر رکھی گئی (۳۶ الف)۔ اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت ﷺ کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کرسکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت ﷺ کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیے گئے جیسا کہ (۴۳) میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو

---

[1] ابن ہشام ص ۶۵۲۔ ابن سعد ج ۲ / ص ۴۰ تا ۴۱۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۴۴۹ تا ۵۰۔

بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگِ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا۔[ا] بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت ﷺ کو حاصل ہو گئی جو آنحضرت ﷺ کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت ﷺ نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا (۲۵، ۳۱، ۴۰)۔ اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت ﷺ اُن کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں (۴۲)۔ نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ﷺ ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی (۳۶ ب میں) صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک لخت روک دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لیے بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت ﷺ کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا (۳۹)۔ مکہ ایک حرم تھا۔ شہر طائف کی حرمت کو ۹ ھ کے معاہدۂ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھیے کتاب الاموال لابی عبید ص ۵۰۶) یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوالینا بھی آنحضرت ﷺ کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک

ا البدایہ والنھایہ لابن کثیر ج ۴، ص ۶۔ ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز: پروفیسر ٹارے کی "جوش فاؤنڈیشن آف اسلام"

ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیاء یوروپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہت، کا بلاکسی دِقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔

یورپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی اُمیہ سے بہت پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۷ھ میں مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہو گئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تا آں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہد عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری [1] اور گبن [2] نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہد عثمانی تک مدینہ ہی مرکزِ خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ ''دین'' بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴
۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمہ فارسی، مخطوطہ پاریس) ورق ۱۰۱
۳۔ کتاب الاموال مؤلفہ ابوعبید قاسم بن سلام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷
۴۔ البدایہ والنہایہ مؤلفہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶
۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱

---

[1] تاریخ طبری ص ۱/۱۷-۲۸

[2] Decline and Fall of the Romman Empire V-P 555

۲۔ مسند احمد بن حنبل ۔ ج ۱ ص ۲۷۱ ۔ ج ۲ ص ۲۰۴، ۳ ص ۲۴۲

۳۔ تاریخ الطبری (طبع یوروپ سلسلۂ اوّل) ص ۱۲۶۱، ۱۳۵۹

۴۔ لغت لسان العرب مؤلفہ ابن منظور تحت مادہ ہائے "بدر، وسع، عقب، عقل، فرح، وتغ"

۵۔ طبقات ابن سعد ج ا قسم دوم ص ۱۷۲

اس موضوع پر یورپی زبانوں کے مضامین

1. Wellhausen Gemeindeordnung von Medina, (in Skiyzenund Vorarbetten, Vol.4 Nr.2)
2. Caetani, Annali dell 'Islam, anno 1, 5.43.
3. Wensinck, Mohammed on de Joden to Medina pp 78 et Saq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210-212.
5. Sprenzer, Das Leben und die Leh re des Mohammed vol. 3. pp. 15-18.
6. Grimme, Mohammed pp. 75-81.
7. Mueller, Des Islam in Morgon-und Abendland, vol.1, pp. 15-18.
8. Majid Khadduri, The Law of War & Peace in Islam p. 84-87.
9. Hamidullah "Administration of Justice in Early Islam, Islamic culture, quarterly, Hyderabad Vol. XI pp. 163-72.
10. La Diplomatic Musulmane in loco.

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بعہد نبویؐ

(کوشش کی گئی کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھنے کے لیے کسی حاشیے کی ضرورت نہ رہے اور فقرات پر نمبر بھی لگا دیے گئے ہیں تا کہ حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہو چکے ہیں اور جرمنی، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اس لیے جہاں مجھے اختلاف کرنا پڑا وہاں الف، ب کر کے ذیلی تقسیم کی گئی ہے اور بین الاقوامی نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے۔)

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

(۱) یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

(۲) تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (اُمت) ہوگی۔

(۳) قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۴) اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۵) اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۶) اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۷) اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۸) اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۹) اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف ہو۔

(۱۰) اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۱) اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف ہو۔

(۱۲-الف) اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیئے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۱۲-ب) اور یہ کہ کوئی مؤمن کسی دوسرے مؤمن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدۂ برداری نہیں پیدا کرے گا۔

(۱۳) اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اُٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۴) اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

(۱۵) اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

(۱۶) اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

(۱۷) اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

(۱۸) اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

(۱۹) اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

(۲۰-الف) اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

(۲۰-ب) اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مؤمن کے آڑے آئے گا۔

(۲۱) اور جو شخص کسی مؤمن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول ولی خون بہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اُٹھیں گے اور اس کے سوائے انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

(۲۲) اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا ہو اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

(۲۳) اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمدؐ سے رجوع کیا جائے گا۔

(۲۴) اور یہودی اس وقت تک مؤمنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(۲۵) اور بنی عوف کے یہودی، مؤمنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا اُمت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو اُن کا دین اور مسلمانوں کو اُن کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(۲۶) اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۲۷) اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۲۸) اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے

یہودیوں کو۔

(۲۹) اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۳۰) اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(۳۱) اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود (اس کی ذات) یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(۳۲) اور جفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اُسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۳) اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

(۳۴) اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۵) اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(۳۶-الف) اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمدؐ کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

(۳۶-ب) اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے۔

(۳۷-الف) اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

(۳۷-ب) اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی۔ اور ان میں باہم حسن مشورہ اور

وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

(۳۸) اور یہودی اس وقت تک مؤمنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(۳۹) اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

(۴۰) پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

(۴۱) اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)۔

(۴۲) اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا کے رسول محمدؐ سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۴۳) اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

(۴۴) اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

(۴۵-الف) اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لیے لائیں تو مؤمنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں، بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

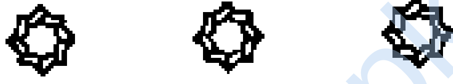
(۴۵-ب) ہر گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی (مدافعت) آئے گی جو اسکے بالمقابل ہو۔

(۴۶) اور (قبیلہ) الاوْس کے یہودیوں کو جو موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفاشعاری ہوگی نہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ

سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۴۷) اور یہ کہ حکمنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمدؐ بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

جولائی ۱۹۳۹ء



سیرتِ طیّبہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا پیغام

عصر حاضر کے نام

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم و مغفور نے 30/اپریل 1992ء کو اقبال اکادمی، پاکستان کے زیر اہتمام "الحمرا" ہال، لاہور میں سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی، جس کا عنوان تھا:

"سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام، عصر حاضر کے نام"

یہ تقریر یہاں من وعن ہدیۂ قارئین ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام زمانہ حال کے مطابق ایک ایسا موضوع ہے جس کا مفہوم مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے۔ اس لحاظ سے اس وسیع موضوع سے متعلق کچھ بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ کچھ ہچکچاہٹ یہ ہوتی ہے کہ سیرتِ طیبہ کے بے کنار سمندر میں سے کیا چیز منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کی جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک حل یہ کیا جاسکتا ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز کے سلسلے میں آج کے ماحول اور دنیا پر نظر ڈالیں، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو کس حالت میں پایا، اور پھر اُس کی اصلاح کے لیے خدا کے احکام کے مطابق کیا کام انجام دیئے۔ یہ شاید ہمارے لیے ایک نمونہ ہی بنے گا کہ آیا زمانہ حال کے حالات اور آغازِ عہد نبوت کے حالات یکساں ہیں یا مختلف ہیں۔ اگر یکساں ہیں تو وہ حل ہمارے لیے کام دے گا اور اگر یکساں نہیں ہیں تو جزواً اسوۂ حسنہ کی چیزوں سے ہم استفادہ کر سکیں گے اور نئی چیزوں کے لیے شاید ہمیں کوئی نئی تدبیر اختیار کرنی پڑے گی، جس کے متعلق میں آپ سے وہ مشہور حدیث بیان کر سکتا ہوں، جس سے آپ واقف ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک شخص (معاذ بن جبل) کو منتخب فرمایا اور یمن کے گورنر کے طور پر بھیجا، جب وہ رخصتی سلام کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا:

اے معاذ! تمہارے پاس اگر مقدمات آئیں تو تم کس طرح انہیں حل کرو گے؟

انہوں نے فوراً جواب دیا:

"جیسے قرآن میں احکام ہیں۔"

جواب بالکل صحیح تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانست میں وہ جواب ناکافی تھا، اس اعتبار سے کہ اگر صرف وہ جواب اور لوگوں کے سامنے آئے تو شاید وہ اس سے استفادہ نہ کر سکیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

"اگر تم قرآن میں کوئی حکم نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟"

اس جواب کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ میں یا آپ نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ بعض تفصیلیں اور ذیلی باتیں قرآن مجید میں نہ ملیں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، اہم چیزیں ضرور ہیں، لیکن ہر چیز ملے، یہ ضروری نہیں، اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

اگر قرآن میں وہ معاملہ نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ:

''اس صورت میں میں سنت کے مطابق کام کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرزِ عمل رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اقوال ہیں، میں ان کے مطابق کام کروں گا۔''

یہ جواب بھی ٹھیک تھا، اس میں بھی وہی نکتہ پیش نظر رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ:

''اگر تم سنت میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟''

یہ چیز خاص کر زمانۂ مابعد کے لیے ہوتی ہے کہ عہد نبوی موجود نہ ہو، اس کے بعد کے زمانے آئیں اور لوگ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ سکتے ہوں تو کیا کریں گے؟ اس لیے یہ سوال بہت اہم تھا اور یہ دانستہ طور پر، کہنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کیا اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جو جواب دیا، پہلے وہ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردعمل، یہ دونوں ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

اگر قرآن وحدیث میں تفصیل نہ ملے تو میں اپنی ذاتی رائے سے کوشش کروں گا اور کوئی جدوجہد نظر انداز نہ کروں گا۔ اجتھد برأ والا آلو۔

اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردعمل سبق آموز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف، اللہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ:

''اے اللہ تیرے رسولؐ کے رسول نے جو جواب دیا ہے وہ مجھے پسند ہے، میں اس پر خوش ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک جواب ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ اولاً قرآن وحدیث پر نظر ڈالے، اپنی گتھی کے حل کے لئے، اس کے بعد ہر شخص کو بلا استثنا کہنا چاہیے کہ حق بات یہ ہے کہ خدا نے اُسے جو عقل عطا کی ہے، خدا نے اُسے جو صلاحیتیں دی ہیں، اُن کی بنا پر جو چیز بھی اچھی ہو اسے اختیار کرے عمداً بری

چیز کو اختیار نہ کرے۔ کم ہی لوگ ہوں گے جو عمداً بُری چیز اختیار کرتے ہوں۔

بہر حال خدا کی بیان کردہ چیزوں کے بعد ہم خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اپنی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق۔ اے اللہ مجھے سیدھے راستے پر چلا، اے اللہ مجھے ایسی بات کی تلقین کر جس میں تیری رضامندی ہے۔

تو اس طرح وہ بھی بالواسطہ خدائی احکام بن جاتے ہیں اس معنی میں کہ اگرچہ پیغمبر جیسی شخصیت کے ذریعے سے وہ ہم تک نہیں پہنچے، ہم عام انسانوں کی حیثیت سے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق خدا ہی کی طرف رجوع ہو کر، جو حاضر و ناظر اور راستہ بتلانے والا ہے، اس کے ہاں درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں صحیح راستہ بتائے۔ اس کے بعد میں دوسرے پہلو پر آتا ہوں۔

عہدِ نبویؐ کے آغاز میں دُنیا کی صورتِ حال:

''عہدِ نبوی میں دُنیا'' ایک وسیع موضوع ہے۔ اگر صرف یہ پوچھا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں یعنی مکہ معظمہ میں کیا صورتِ حال تھی تو (اسے بیان کرنا) شاید آسان ہے، لیکن یہ کہنا کہ ساری دنیا میں کیا حال تھا اتنا آسان نہیں رہتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک ابتری پائی جاتی تھی۔ سینکڑوں قبیلے تھے جو روزانہ آپس میں لڑائی بھڑائی کیا کرتے تھے۔ اُن میں اخلاقی بُرائیاں بھی تھیں اور سیاسی بدتمیزی بھی تھی کہ آپس میں لڑ کر اپنے آپ کا بھی نقصان کریں اور اہل ملک کا بھی نقصان کریں۔ بہر حال عرب کے اندر افراتفری تھی اور وہاں ایک ایسی صورت حال تھی جو انسان کے شایانِ شان نہیں تھی۔

عرب کے باہر پر نظر ڈالیے، وہاں ایک طرف ایران کی عظیم الشان سلطنت پائی جاتی تھی۔ دوسری طرف بازنطینی یونانیوں کی حکومت پائی جاتی تھی اور آگے بڑھیں تو مصر میں ایک صورت حال، جنوبی عرب میں ایک صورت حال، ہندوستان میں ایک صورت حال، چین میں ایک صورت حال، غرضیکہ افراتفری ساری دنیا میں پائی جاتی تھی اور امن ناپید ہو چکا تھا اور ہمسایہ ممالک ہر وقت لڑائی بھڑائی میں مشغول رہتے تھے۔

اس کے بعد جب عہدِ نبوی شروع ہوا تو پہلے دن تو لوگوں نے اُس کو محض استعجاب کے طور پر دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جلد ہی جب اُس میں بت پرستی کی بُرائی اور دیگر بُرائیوں کا جو ملک میں پائی جاتی تھیں، ذکر سنا تو اُن میں استعجاب کے بعد قبولیت کی طرف میلان کی بجائے نفرت پیدا ہوئی۔ خاص کر اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جو بت پرستی کرتے ہو نہ صرف وہ تمہارے لیے بُری (بات) ہے بلکہ اور لوگ بھی تمہارے آبا واجداد بھی اگر بت پرستی کرتے رہے ہیں تو خدا ان کو جہنم میں بھیجے گا، سزا دے گا۔

''کیا میرے باپ، میرے دادا کو (تم) جہنم میں بھیجتے ہو؟''

یہ ایک احمقانہ طریقہ تھا سوچنے کا، مگر یہی ہوا۔ چنانچہ اس کے ردِ عمل کے طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی جانے لگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو اذیت دی گئی، بلکہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کیا گیا۔ ایک عورت خاص طور پر قابل ذکر ہے سمیہ اس کا نام تھا جو اصل میں ترک تھی اور ایک لونڈی کے طور پر ایران میں پہنچی تھی اور ایران کے گورنر کے تحفے کے طور پر وہ مکے آئی تھی۔ بہر حال وہ ایک ترک بہن تھی، مسلمان ہوئی، اُس کو ابو جہل نے قتل کر دیا۔

غرضیکہ اذیت دہی کا سلسلہ ایک بحران کی شکل میں ملک میں پایا جاتا تھا اور ابتدائی دنوں کے بعد ہی ایک واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست اور بہی خواہ چچا حضرت ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہو گئی۔

عرب کے نظام میں معیشت کے لحاظ سے ایک دوسرا چچا قبیلے کا سردار بنتا ہے، یہ تھا ابو لہب، اس نے یہ اعلان کیا کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے قبیلے سے) خارج کرتا ہوں۔ اگر کوئی انہیں (ہلاک) بھی کر ڈالے تو میں اور میرا قبیلہ اس میں دخل نہیں دے گا۔ اور اس طرح سے گویا ملک سے باہر جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا گیا۔ ان حالات سے آپ واقف ہیں، میں تفصیل میں نہیں جاتا صرف آخری نکتے پر پہنچتا ہوں۔

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوچنے لگے کہ اللہ کے احکام کی تبلیغ کس طرح کروں۔ شہر مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقریر کرنے کی ممانعت ہے، مکہ کے

لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں، تو اتفاق سے ایک موقع تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفادہ فرمایا۔ وہ یہ کہ حج کے زمانے میں لوگ مکے اور اُس کے مضافات، منیٰ و عرفات میں سارے عرب سے آتے تھے، جن میں سے ظاہر ہے کہ سب کی اہلِ مکہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی، مخالفین بھی کبھی آتے تھے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں اُن بیرونی مہمانوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔

ہر شخص کے پاس جاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ تم کس قبیلے کے ہو، پھر اُس کو تبلیغ اسلام فرماتے تھے، اور جو نکتہ میں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ کہتے تھے کہ اگر تم میری بات مانو، —— یعنی خدا کے احکام کی تبلیغ میں میری مدد کرو تو جلد ہی قیصر اور کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے۔

یہ تھا وہ عزم اور وہ ہمت جو کہنا چاہیے کہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ مصیبتوں سے نہ گھبرائیں اور مصیبتوں کی کثرت سے ہم مایوس نہ ہو جائیں، بلکہ وہ کریں جو اللہ جل شانہٗ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ وہ یہ کہ ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ کام کرو، کام شروع کرو، اللہ جل شانہٗ تمہاری مدد کرے گا اور ان بڑی بڑی مشکلوں سے تم نہ گھبراؤ۔ یہ سبق آموز چیز ہے۔

آج بھی ہمارے لیے وہی مسئلہ پیش ہے۔ ہمارے دشمن لاتعداد بھی ہیں، ہم سے قوی تر بھی ہیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں اندرونی جھگڑے بھی ہیں۔ بجائے اس کے کہ متحد ہو کر اپنے دفاع کی کوششوں میں مصروف ہوں ہم آپس کی لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ یہ چیز اُس وقت بھی پائی جاتی تھی۔ عرب میں، عرب کے باہر ساری دنیا میں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمت دلاتے ہیں، اور کام شروع کرو۔ دنیا کی جو سپر طاقتیں ہیں یعنی قیصر اور کسریٰ وہ تمہارے قبضے میں آ جائیں گی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمارے دشمن بہت سے ہیں۔ ہم سے قوی تر بھی ہیں لیکن اُس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے

لے کر ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر خدا جل شانہ نے بھیجے۔ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے ہمیں نام بھی معلوم نہیں، مقام بھی نہیں معلوم ہیں اور کاموں کی تفصیل بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن یقیناً کئی سو مذہب پیدا ہوئے ہوں گے۔

ایک دلچسپ حدیث فتوحات مکیہ میں حضرت ابن عربی نے لکھی ہے۔ معلوم نہیں کس حد تک صحیح ہے لیکن دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ' نے ایک لاکھ آدم پیدا کیے اور ہم آخری آدم کی اولاد میں ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے کتنے کروڑ کتنے ارب سالوں سے انسانیت پائی جاتی تھی کہ ایک لاکھ آدم پیدا ہوئے ہوں اور ان کی ذرّیت (اولاد) پھیلی ہو۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ ہم سابقہ پیغمبروں کے حالات پر نظر ڈالیں جس حد تک بھی ہمارے امکان میں ہے، جس حد تک بھی معلومات ہم تک پہنچی ہیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اسلام اور اسلام سے قبل کے مذاہب میں بعض چیزوں کی حد تک تو اتفاق پایا جاتا ہے۔ مثلاً خدا کو ایک ماننا، لیکن بعض چیزوں کی حد تک اس میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس صحیح معلومات موجود نہیں ہیں جو قابل اعتماد ہوں۔ لیکن جس حد تک بھی ذرائع معلومات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لیجیے۔ انجیل جو ہمارے پاس عیسائیوں کے ذریعے سے پہنچی ہے اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ مجھے دنیا کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا ان کی تعلیم روحانی ہوگی، روحانی معاملات کے لیے ہوگی۔ شاید عقائد کے لیے ہوگی۔ لیکن عام معاملات خاص کر سیاسی اور حکومتی معاملات میں انہیں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ وہ اُس کے لیے کوئی احکام دیتے ہیں۔

آج ہم سوچیں کہ اگر ہم اپنے کاموں سے حکومت کا حصول اور سیاسیات کو خارج کر دیں تو شاید کوئی دلچسپی کی چیز ہمارے پاس باقی نہیں بچے گی۔ آج ہر شخص حکومت کے متعلق ہی کوشش کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخاب میں اس کا چناؤ ہو جائے، وزیر بنے، صدر حکومت بنے، وغیرہ وغیرہ۔

ہم دیکھیں گے مقابلہ کرتے ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو سیاسی معاملات سے بالکل خارج رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ

پہلے ہی دن سے نام لیے بغیر حکومت قائم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ابھی تھوڑی سی تفصیل میں آپ سے عرض کروں گا۔ یہ ایک طرف، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول انہی عیسائیوں کی فراہم کردہ انجیل میں یہ بیان ہوا ہے۔

''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، غیر قوموں سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ حتیٰ کہ ایک دن ایک غیر یہودی عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور چاہا کہ ان کا دین قبول کرے۔ ان کے الفاظ جو انجیل میں ہیں ان سے ہمیں حیرت ہی ہوتی ہے، وہ یہ ہیں کہ بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔ اُس کا ایمان قبول کرنے سے آپ نے انکار کر دیا۔

اُس کے برخلاف ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے ہی کام نہیں کرتے بلکہ سبھی لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ اولین مسلمانوں میں کالے بھی ہیں، گورے بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں، ترک بھی ہیں، غرضیکہ ساری دنیا کے لوگوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (طیبہ) ہمارے لیے قابلِ عمل نمونہ ہے، اور کس طرح ہم اُس سے آج بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ ہجرت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم مجھ پر ایمان لاؤ، میری مدد کرو تو قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے اس سلسلے میں ایک پس منظر یاد آتا ہے اُس کا میں آپ سے ذکر کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسلمانوں کی حکومت اور قیصر کی حکومت، یعنی بازنطینی یورپ کے یونانی حکمرانوں میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے ایک مسلمان سفیر کو قتل بھی کر دیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سفارت بھیجی قیصر سے ملاقات کرنے کے لیے، تاکہ اُس سے کہیں کہ لڑائی بھڑائی کی جگہ دوستانہ تعلق رکھو۔ تمہارے لیے بھی یہ بھلائی کی چیز ہوگی اور ہمارے لیے بھی بھلائی کی چیز ہوگی، کیوں آپس میں لڑیں۔ یہ پیغام بھیجنے کے وقت جن لوگوں کو روانہ کیا گیا تھا، ان کی روایت

کردہ تفصیل میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک سرکاری تقریب ہوئی، وہاں گفتگو ہوئی، وہاں بحث ہوئی اور اسکے بعد قیصر نے اس سفیر کو ایک دن پرائیویٹ ملاقات کے لیے اپنے گھر بلایا۔ جب وہ بادشاہ کے محل میں پہنچے تو اُس نے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک صندوق لاؤ۔ صندوق لایا گیا، صندوق میں ڈبے بہت سے پائے جاتے تھے۔ اُس نے ان کو کھولا اور اس میں سے ایک تصویر نکالی اور سفیر سے پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کس کی تصویر ہے؟

جواب دیا نہیں۔

اُس نے کہا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر ہے۔

پھر اُس کے بعد ایک دوسری تصویر نکالی، اس میں بھی دریافت کیا شاید حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہو (تصویر ہو) پھر اس نے ایک اور تصویر نکالی، پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟

سفیر نے فوراً جواب دیا: ہاں یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو قیصر اچنبھے میں پڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ واقعی یہ تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ہے، انہوں نے کہا ہاں بالکل اُسی طرح جیسے ہم آپ کو دیکھا کرتے تھے، تو اس وقت اُس نے اقرار کیا کہ صندوق میں جو ڈبے ہیں، یہ آخری ڈبے کی چیز تھی صرف تمہاری آزمائش کے لیے اُسے میں نے پہلے نکال کر پوچھا، ورنہ اگر ترتیب سے آتا تو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور فلاں اور فلاں تو تم اندازہ کر لیتے کہ یہ تمہارے پیغمبر کی تصویر ہوگی۔ لیکن اب تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سی اسلامی تاریخی کتابوں میں یہ قصہ موجود ہے۔ بہت سی اور تفصیلیں ہیں میں اس میں نہیں جاتا، لیکن یہ تصویریں کہاں سے آئیں، شاید یہ دلچسپی کا موجب ہو۔

چنانچہ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قیصر روم کے ہاں، فرنگی بیان کے مطابق ایک کتاب تھی، "ہمارے ملک کا مستقبل با تصویر" اس میں ہر زمانے کے حالات کا ذکر تھا۔

دونوں کو اگر ملائیں تو معلوم ہوتا ہے شاید اُسی بڑی (مصور) کتاب کا ایک جزو تھا جو بادشاہ نے مسلمان سفیر کو دکھایا تھا۔ اس کی تاریخ پر جائیں تو فرنگی مولوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت دانیالؑ ایک پیغمبر تھے، انہوں نے اللہ جل شانہٗ سے دعا فرمائی سکندر اعظم کی درخواست پر کہ مجھے فلاں چیز دکھائی جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا خزانہ کہاں تھا وہ بتایا جائے تو کہتے ہیں کہ حضرت دانیالؑ کے ذریعے سے حضرت آدم علیہ السّلام کے خزانے میں جو (دفینہ) چلا آ رہا تھا اُس کے اندر سے لی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ تصویریں تو جیسے ہمارے ہاں بھی یہ روایت ہے، ایک مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا جل شانہٗ سے دعا فرمائی تھی کہ میری اولاد میں جو پیغمبر ہوں گے، مجھے بتایئے وہ کون ہوں گے۔ اس طرح کی حدیث مسلمانوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ان دونوں کو ملائیں تو باہمی ربط نظر آتا ہے۔

بہرحال قصہ مختصر یہ کہ انتہائی مصیبتوں کے زمانے میں مایوس کن حالات میں آس پاس کے دشمنوں کی عظیم الشان قوت کی موجودگی کے باوجود عزم راسخانہ رکھنا اور ہمت بے پایاں کو رکھ کر کام کیے چلے جانا، نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ کام کیے جائیں تو خدا تعالیٰ اس میں کامیابی دیتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع دین پیش کیا اور اس کے لیے ایک ہمہ گیر کوشش کا آغاز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ وہ کوشش کامیاب ہو۔ ورنہ سینکڑوں پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن کی قوم نے انہیں قتل کر دیا اور ان کے متعلق ان کے احکام، ان کی تعلیم، کوئی آثار اب باقی ہی نہیں ہیں۔

اس کے برخلاف جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے حالات میں مایوسی پائی اور کہنا چاہئے ادب کے ساتھ کہ مجبور ہو گئے کہ اپنے وطن کو ترک دیں، مدینے تشریف لے جائیں اور مدینے میں کوشش کا آغاز کریں تو وہاں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ سب سے پہلا کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر فرمایا وہ یہ تھا کہ بے وطن پناہ گزینوں کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ یعنی جو مکے کے مسلمان یا نو مسلم تھے اور مدینے پہنچے تھے ان کے پاس ذرائع معیشت نہیں تھے تو ان کے لیے کوئی گزر اوقات کا انتظام فرمائیں۔ مواخات (بھائی چارے) کے ذریعے سے یہ کام انجام پایا۔ یعنی مہاجرین کو ملک کی معاشرت اور معیشت

میں ضم کر دینا۔ پلک جھپکانے کا وقت لیا اور کام پورا ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ یہ تھا کہ بیرونی حملوں کے خدشے سے اپنے مستقبل کی حفاظت کے متعلق تدبیر اختیار کریں۔ چنانچہ حقیقتاً اہل مکہ، مشرکین مکہ نے یہ خط لکھا' مدینے کے مسلمانوں، انصار کے نام کہ تم نے ہمارے ایک دشمن کو پناہ دی ہے یا تو اُسے قتل کر ڈالو یا اُسے اپنے ملک سے نکال باہر کرو ورنہ ہم تمہارے متعلق وہی کام کریں گے جو ہمیں مناسب معلوم ہو گا یعنی حملے کی دھمکی دی۔

ان حالات میں دفاع کا انتظام مقدم ترین تھا اور ملک کی صورت حال یعنی مدینہ منورہ کا حال یہ تھا کہ وہاں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں عرب بھی تھے، وہاں یہودی بھی تھے، وہاں عیسائی بھی تھے، وہاں یہ نو آمد مسلمان اور اجنبی پناہ گزین بھی تھے، تو کیا کیا جائے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت بھیجی شہر کے تمام عناصر کے سرکردہ لوگوں کو کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس میں یہودی بھی آئے، نصرانی بھی آئے، نومسلم بھی آئے اور غیر مسلم بھی آئے۔ اُن سے مخاطب ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ملک کی افراتفری کے باعث، آپس کے لڑائی جھگڑوں کے باعث ہمارے لیے خطرہ ہے کہ اگر کوئی اجنبی ہم پر حملہ کرے تو ہم نقصان اٹھائیں اور ہم اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایک چھوٹی سی حکومت، سلطنت قائم کی جائے، ہر قبیلے کو آزادی رہے گی لیکن ایک مرکز بھی ہو گا اور وہ مرکز ان کے مفاد کے لحاظ سے تدبیریں اختیار کرتا رہے گا۔

اس کو سب لوگوں نے قبول کیا۔ یہودیوں نے بھی قبول کیا، اور بت پرست عربوں نے بھی قبول کیا، اور مسلمان تو ظاہر ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کو دیکھ کر اس سے متفق تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے ایک جزو میں، مدینہ بہت چھوٹا شہر ہے۔ شہر مدینہ میں نہیں بلکہ شہر مدینہ کے ایک جزو (حصے) میں ایک حکومت قائم فرمائی، ایک سلطنت قائم فرمائی شاید چند مربع میل کا رقبہ ہو گا، اور جو چیز قابل ذکر ہے، اور جو حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سلطنت کا دستور تحریر فرمایا۔ تاریخ عالم میں نہ ایران و روما میں، نہ چین میں، نہ ہندوستان میں، نہ امریکہ میں، کسی بھی سلطنت کا

دستور تحریری طور پر مرتب نہیں پایا جاتا تھا۔

تاریخ عالم میں پہلی دفعہ اُمّی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطنت کا دستور تحریری طور پر مدون فرمایا جو ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی دفعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی تفصیلات موجود ہیں جو اس زمانے کی ضرورتوں کے لیے بھی کافی تھیں، اُن میں سے بہت سی آج بھی ہمارے لیے کارآمد ہیں۔

جب یہ سلطنت قائم ہوئی تو اس میں چند یہودی قبیلے بھی شریک ہوئے، سب نہیں ہوئے۔ عیسائیوں کی تعداد کم تھی وہ شخصی جلن کے باعث، کہنا چاہیے کہ اس میں شریک نہیں ہوئے، لیکن جو باقی عرب تھے، مسلمان اور غیر بھی وہ اس میں شریک ہوئے۔ اور جس چیز پر ہمیں حیرت ہوتی ہے وہ یہ کہ یہودیوں نے بھی جو مدینے میں تھے پسند کیا کہ اس سلطنت کے صدر یہ اجنبی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ انہیں اہل مدینہ پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن خیال کیا کہ یہ شخص اجنبی ہے، غیر جانبدار رہے گا اور وہ ہمارے ساتھ انصاف کرے گا۔ چنانچہ وہ اس سلطنت میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں اُس کے حقوق بھی دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اندرونی عبادت کی آزادی دی گئی، بلکہ دستور میں لکھا ہے کہ انہیں عدل و انصاف کی بھی آزادی ہوگی یعنی اگر کوئی جھگڑا دو یہودیوں میں پیدا ہو جائے تو حاکم عدالت بھی یہودی ہوگا اور قانون بھی یہودی ہوگا۔ اور فریقین مقدمہ بھی یہودی ہوں گے۔ انہیں کلیتاً آزادی ہوگی اور مرکزی حکومت کی طرف سے اُس حاکم عدالت کے فیصلے میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی، اُس کو بعینہٖ نافذ کیا جائے گا۔

اس کام سے فراغت پانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی قوت محدود ہے اور مکہ مقابلتاً زیادہ قوی ہے۔ اگر وہ حملہ کرے تو ہم اپنی مدافعت نہیں کر سکیں گے اس کا حل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً یہ سوچا کہ مدینے کے آس پاس شمال جنوب، مشرق مغرب ہر مقام پر جو آزاد عرب قبیلے رہتے ہیں ان سے تعلق پیدا کیا جائے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں جہینہ کے قبیلے کے پاس۔ مثلاً جو مدینے کے شمال میں بستا تھا اور ان سے کہتے ہیں:

دوستو! تم اس وقت آزاد ہو، جو چاہے کرو، جو چاہے نہ کرو۔ کوئی تمہیں مجبور نہیں

کرتا۔لیکن تم ہو تنہا۔اگر کوئی تمہارا دشمن تم پر حملہ کرے اور تمہاری ذاتی قوت اتنی نہ ہو کہ اس قوی تر دشمن سے مقابلہ کر سکو تو تمہیں کوئی مدد دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ان حالات میں کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم دونوں میں حلف (معاہدہ) ہو جائے۔اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو تم ہمیں اطلاع دو، تو ہم دوڑے ہوئے آئیں گے اور تمہاری مدافعت میں تمہارے ساتھ شریک رہیں گے۔اگر اسی طرح کوئی ہم پر حملہ آور ہو، اپنے طور پر نہیں بلکہ اگر ہم تم کو بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آؤ گے۔یہ باہمی حلف ہمارے لیے، تمہارے لیے، ہم دونوں کے لیے مفید ہوگا۔بات معقول تھی، انہوں نے قبول کر لی۔

اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ وہ قبیلہ تھا غیر مسلموں کا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کی مدافعت کے لیے غیر مسلموں سے حلف (قائم) کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں پاتے تھے۔یہ ایک پہلو تھا۔پھر اسی طرح مختلف مقامات پر تشریف لے گئے اور ایک طرح سے کہنا چاہئے کہ اسلامی مملکت جو شہر مدینہ کے ایک گوشے میں پائی جاتی تھی، اس کے اطراف میں دوستوں کا ایک حلقہ ڈال دیا۔کوئی اجنبی حملہ آور ہو تو اس کو عملاً مسلمانوں کے دوست قبائل سے گزرنا پڑے گا اور اس کے بعد مدد کے لیے یہ سب لوگ بھی دوڑیں گے انہیں بچانے اور انہیں روکنے کے لیے۔تو غرضیکہ ایک جال ڈال دیا گیا حلیفوں اور دوستوں کا۔

یہ ایک طرف، دوسری طرف اسلام کی تبلیغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشغول رہے اور اسلام کی تبلیغ اس معنی میں اہمیت رکھتی ہے کہ ساری چیزیں بیک وقت نافذ نہیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک، اور تجربوں سے فائدہ اٹھا کر۔اگر چاہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئے احکام دیئے گئے۔

اب آغازِ اسلام پر ہمیں صرف دو چیزیں ملتی ہیں۔شہادت لا الٰہ الا اللہ، بت پرستی سے انکار ایک چیز —— دوسری طرف نماز۔صرف یہ دو واجبات تھے باقی چیزیں روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ وہ نہیں پائی جاتی تھیں۔یہ بعد میں رفتہ رفتہ آتے ہیں، تو یہ بھی ہمارے لیے سبق آموز ہے کہ ان سارے کاموں کو بیک وقت شروع کرنے کے بجائے تقسیم کار بھی کرو اور بتدریج بھی کرو۔یہ بھی ہمارے لیے ایک سبق آموز نمونہ ملتا ہے۔ایک

چیز پر میں (اس بیان کو) ختم کرتا ہوں۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حکومت جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی، کچھ اس کی تحلیل کریں کہ وہ کیسی تھی؟ کیا وہ بادشاہت تھی؟ کیا وہ جمہوریت تھی؟ کیا وہ یونیٹری (وحدانی) حکومت تھی؟ کمپوزٹ حکومت تھی؟ اگر ان چیزوں کو سوچیں تو اس میں بھی ہمارے لیے سبق ہے۔ خیال فرمائیے کہ میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ مسلمانوں پر مصیبت کا زمانہ تھا، خاص کر مکے میں، اور اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی نومسلموں سے فرمایا تھا کہ اگر تمہارے لیے یہ صورت حال، یہ اذیت دشمنوں کی ناقابل برداشت ہو چکی ہے تو تم ملک چھوڑ کر حبشہ چلے جاؤ جہاں ایک عیسائی حکمران ہے لیکن اس کے ملک میں انصاف ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلم علاقے میں جا کر پناہ گزین ہونا یہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اُس ملک میں انصاف ہوتا ہے۔ تو معیار کیا ہونا چاہیے، اُس کی ہمیں تفصیل ملتی ہے۔

اس کے بعد اور آگے چلیے۔ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی وہ شاید چند مربع میل کے رقبے پر مشتمل تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دس سال بعد وفات ہوئی تو اس مملکت کا رقبہ پھیلتے پھیلتے دس لاکھ مربع کلومیٹر کا ہو گیا۔ سارا جزیرہ نمائے عرب، جنوبی عراق، جنوبی فلسطین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاقے کے اجزا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو مانتے تھے اور اس اسلامی حکومت کے اجزا تھے، جو شاید چار مربع میل ہو ـــــ ایک ملین مربع میل کا فرق فوراً ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ اُس کوشش کا نتیجہ تھا۔

ایک دوسری چیز لیجیے، تعداد میں مسلمانوں کی، آغازِ اسلام پر سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی مسلمان نہیں تھا۔ ایک دن بعد ایک کا اضافہ ہوا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ ایک سے بھی ظاہر ہے کام نہیں بنتا، پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ رفتہ رفتہ ایک دو تین چار، تعداد بڑھتی گئی مگر مصیبتیں بھی بڑھتی گئیں۔ جیسا میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ حضرت سمیہؓ جو ترک تھیں اُن کو قتل بھی کر دیا گیا، تو عرض کرنا یہ ہے کہ تبلیغِ اسلام کی کوشش جاری رہی۔ آغاز پر مٹھی بھر

مسلمان تھے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایسا نظر آتا ہے کہ میرے اندازے میں نصف ملین لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

یہ اندازہ میں نے کس طرح لگایا ابھی آپ سے بیان کروں گا لیکن حال ہی میں پیرس میں میں نے ایک عیسائی پادری سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تھے تو اس وقت کتنے لوگ عیسائی تھے، آج کل کتنے ہیں؟ یہ نہیں پوچھا بلکہ حضرت عیسیٰ کی دنیاوی زندگی میں کتنے لوگوں نے ان کا دین قبول کیا تو کچھ ناپسندیدہ حالات میں اس نے کہا کہ شاید تیس چالیس ہوں گے۔ خیال فرمایئے تیس چالیس، اور دوسری طرف نصف ملین لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان قبول کرتے ہیں۔ یہ نصف ملین کی تعداد میں نے کیسے سوچی، وہ بھی آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

اس زمانے میں کوئی اعداد وشمار اکٹھے نہیں کیے جاتے تھے۔ اور کوئی مردم شماری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی تعداد کا ذکر آتا ہے مختلف سلسلوں میں۔ مثلاً اس جنگ میں اتنے سپاہی تھے، دشمن کے اتنے اور ہمارے اتنے وغیرہ وغیرہ۔ تو اسی سلسلے میں لکھا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند مہینے پہلے جو حج ہوا تھا اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے تھے، ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ شریک تھے۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار وفات سے چند مہینے پہلے مسلمانوں کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اس حج میں آنے والوں کی تعداد ہے۔

ظاہر ہے کہ سارے لوگ نہیں آئے ہوں گے۔ کوئی بڈھا ہے، کوئی بیمار ہے، کسی عورت کی زچگی ہوئی ہے۔ غرضیکہ مختلف عناصر آبادی کے ایسے ہیں جو نہیں آئے ہوں گے، اور حج ہر سال فرض بھی نہیں تھا، اس کے متعلق حکم تھا کہ عمر میں ایک بار حج کرو اگر اس کا امکان پاؤ۔ مفلسوں کے لیے اس سے معافی ہے۔ وہ ایک لاکھ چالیس ہزار حاجیوں کی موجودگی سے میں نے گمان کیا کہ شاید پانچ لاکھ مسلمان ہوں اُس سارے ملک میں، حجاز میں، نجد میں، شمال عرب میں، جنوب عرب میں اور ممکن ہے کہ ہندوستان اور چین میں بھی، ایک مختصر ذکر اس کا بھی کرتا ہوں۔

ہندوستان کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ہجرت سے قبل ایک رات مالیبار کا ایک

راجہ رات کو کسی ضرورت سے آسمان پر نظر ڈالتا ہے تو ششدر ہو جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شق القمر کا ہمارا جو معجزہ ہے راجہ نے یہ ماجرا اپنے وزیر سے بیان کیا، اس نے کہا میں تو کچھ نہیں جانتا، لیکن ایک چیز مجھے معلوم ہے۔ حضور (بادشاہ) کے آباؤ اجداد جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے کسی ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم کی تھیں راز کی۔ ان کو ایک ڈبے میں رکھ کر اُن پر مہر لگائی ہے جو سرکاری خزانے میں موجود ہے اور حکم ہے کہ اسے کبھی نہ کھولو۔ شاید اس ڈبے کے اندر اس کا کچھ ذکر ہو۔ میں اگر خزانچی سے کہوں گا تو مجھے نہیں دے گا۔ اگر حضور فرمائیں تو وہ ڈبہ لائے گا اور ہم کھول کر دیکھ سکیں گے۔

چنانچہ واقعتاً ہوا یہی۔ اُس ڈبے کو منگوایا گیا، اسے کھولا گیا۔ اس کے اندر ذکر تھا پرانے راجہ کا، اس موجودہ راجہ کے آباؤ اجداد میں سے کسی کا، جس میں لکھا تھا کہ آخری پیغمبر کے زمانے میں ایک مرتبہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ اس کا معجزہ ہے۔ تم اس کی خلاف ورزی کبھی نہ کرنا، اس کی بات ماننا۔

اس پر راجہ نے اپنے بیٹے کو اپنی جگہ حکمران بنا دیا اور (خود) چلا گیا مکہ معظمہ، وہاں اس نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ یہاں نہ رہو شاید اس لیے کہ عرب میں امن نہیں تھا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے ملک ہی کو واپس جاؤ، اپنے ملک ہی میں اس مذہب کی تبلیغ کرو۔

چنانچہ وہ مکے سے واپس ہوتا ہے خشکی کے راستے سے یمن تک، تا کہ یمن میں کسی جہاز پر سوار ہو کر مالیبار واپس جائے، لیکن وہاں وہ بیمار پڑا، وہیں اس کی وفات ہوئی اور صدیوں تک اس کا مزار ایک عام زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ اسے لوگ ملک الہند کہہ کر پکارتے تھے کہ ہندوستان کے بادشاہ کا مزار ہے۔ یقیناً اس کے جو ساتھی ہوں گے وہ واپس گئے ہوں گے۔ وہاں ان چیزوں کا ذکر کیا ہو گا اور ممکن ہے کہ وہاں عہد نبوی ہی سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا ہو۔

اسی طرح چین کے مسلمانوں میں ایک روایت ہے جس سے ہم عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ وہاں کے چینیوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر (چین میں) بھیجا تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا یا خالو کوئی قریبی رشتہ دار تھے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کوئی اور صحابیؓ ——— انہوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اس کے حالات کی تفصیل ہمیں عام تاریخوں میں نہیں ملتی صرف چینی روایتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح اسلام کی تبلیغ کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ واجبہ یہ بیان کیا گیا کہ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ط (الانعام: ۹۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شخصی طور پر تبلیغی کام انجام دیتے رہنا یہ شہر ام القریٰ میں یعنی مکہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸) ساری دنیا کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے ہیں اور قیامت تک کے لیے، تو اس کا حل کیا کریں۔

دو چیزیں نظر آتی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائیں۔ ایک تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا، اس میں کچھ کامیابی بھی ہوتی تھی اور ناکامی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور تدبیر اختیار فرمائی جو دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے حکمرانوں کو خط لکھ کر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ایسے کتنے خطوط تھے، صحیح معلوم نہیں، لیکن کم از کم چھ خطوط اصلی دستاویزیں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ایک قیصر روم کے نام تھا، ایک کسریٰ ایران کے نام تھا، ایک حکمران مصر کے نام تھا، ایک نجاشی حبشہ سے متعلق تھا، اس طرح مختلف حکمرانوں کو خطوط بھیجے گئے تھے، انہیں اسلام کی تبلیغ کی گئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ تبلیغ کا ایک ہی طریقہ نہ ہو، ہر ممکن طریقہ کوشش کر کے دیکھا جائے۔

یہ ایک نمونہ ہے ہمارے لیے، اس معانی میں کہ اگر ہم اپنے زمانے میں اور چیزوں کے ساتھ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو کس طرح کریں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس بارے میں کیا رہا ہے۔

میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کس طرح کی حکومت تھی؟ ظاہر ہے وہ خانوادہ قسم کی بادشاہت نہیں تھی، **شاید اس**

لیے (خدا میرا قصور معاف کرے) کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بیٹا زندہ نہ تھا۔ اگر نرینہ اولاد موجود ہوتی تو شاید مسلمان اُس کو اپنا جانشین بناتے۔ اپنا خلیفہ اوّل مقرر کرنے، پھر اُس کے بیٹے کو.......... اور یوں ایک خانوادہ بن جاتا مگر اللہ جل شانہٗ کو کچھ اور منظور تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہی۔ وہاں بادشاہت کا سوال نہیں تھا، جمہوریت کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا، اس معنی میں کہ جمہوریت میں عوام الناس اپنے صدر کا انتخاب خود کرتے ہیں، اور پیغمبر، خدا جل شانہٗ کی طرف سے نامزد ہوتا ہے، انسانوں کی طرف سے اس کا انتخاب نہیں ہوتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حکومت تھی اس معنی میں کہ ایک فرد (بطور سربراہ مملکت موجود) تھا جس کے احکام جس حد تک انسانی سوسائٹی میں ممکن ہے، سارے لوگ مانتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت چند چیزیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ ایک حکمران، دوسرے ایک قانون ——— قرآن ایک قانون تھا جس کی تعمیل سارے مسلمانوں کے لیے واجب تھی۔ ایک حکمران ——— ایک قانون ——— اس کے بعد اُن افراد میں اور رعیت میں ایک رابطہ اور ربط قائم تھا۔ کہنا چاہئے کہ ایک تنظیم موجود تھی۔ لیکن کسی حکومت اور مملکت میں زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین مسلمانوں کے پاس شروع میں نہیں تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے ملک میں، مکے کے مشرکوں اور بت پرستوں کی حکومت کے اندر ایک سکونت پذیر شخص کی حیثیت سے موجود تھے۔ جو مٹھی بھر افراد مسلمان ہوئے وہ بھی وہیں کے باشندے تھے، لیکن حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ البتہ ایک حکومت کے جتنے عناصر ہوتے ہیں ان میں سے چند موجود تھے جنہیں فوراً اختیار کرلیا گیا، جو چند عناصر موجود نہیں تھے ان کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک چھوٹی سی مملکت قائم ہوئی اور اس مملکت کی وسعت چار پانچ مربع میل کے رقبے سے شروع ہو کر دس لاکھ مربع میل تک عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پھیل گئی تھی۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد جو چیزیں رونما ہوئیں وہ اور بھی زیادہ حیران کن ہیں۔ مثلاً ۲۷ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدینہ منورہ کا حکمران تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں نہ صرف ایشیا اور افریقہ میں

تھیں بلکہ یورپ کے اندر بھی وہ لوگ داخل ہو چکے تھے۔

لیکن میں یہاں عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا صورت حال تھی، اس میں ایک چیز قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عرب میں نہ صرف قبیلے تھے بلکہ کچھ سلطنتیں بھی تھیں، ان میں سے عمان کا علاقہ جو شرقِ اردن کا پایۂ تخت ہے، مشرقی عرب میں بحرین کے پاس کا علاقہ ہے، وہاں ایک بادشاہت قائم تھی، بادشاہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے دو بیٹوں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، بجائے ایک کے دونوں بیٹوں کو۔ ایک کا نام جیفر اور دوسرے کا نام تھا عبیس۔ باشاہ کا اپنا نام جولندا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جیفر اور عبیس دونوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یاد رہے کہ حکمران ہوتے ہوئے انہوں نے اسلام قبول کیا (جب کہ رعیت میں غیر مسلم بھی شامل تھے) اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ ان کا تعلق مدینے کی اسلامی حکومت سے کس طرح ہوا؟

وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک افسر روانہ کیا جسے شاید آپ ریذیڈنٹ (Resident) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ان کے دربار میں رہا۔ اس ریذیڈنٹ کے فرائض میں اسلام کی تبلیغ اور اسلام کی تعلیم بھی شامل تھی، لیکن اُس کو ملک کے عام نظم ونسق میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ ملک کی رعایا خاص کر غیر مسلم رعایا کے سارے معاملات براہ راست جیفر یا عبیس یا دونوں کے پاس تھے اور دونوں مسلمان تھے اور اسلام کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، لیکن غیر مسلموں کی آزادی برقرار .... رکھی گئی تھی۔ ان حالات میں شاید زمانۂ حال کی تعبیر کے لحاظ سے میں کہہ سکوں کہ وہ ایک طرح کا کنفیڈریشن تھا، یونیٹری (وحدانی) حکومت نہیں تھی، اس میں آزاد سلطنتیں بھی بعض شرائط کے ساتھ داخل ہوئی تھیں، چنانچہ اومان کی سلطنت (بھی اپنی اندرونی آزادی کے ساتھ) اس بڑی اسلامی سلطنت کا ایک جزو تھی۔

ایک دوسری مثال لیجیے، حبشہ کا بادشاہ جس کے متعلق ایک قصہ ہماری حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ حکمران نجاشی کی وفات ہوئی، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اذیت سہنے کے زمانے میں مکی نو مسلموں کو جا کر پناہ گزین ہونے کی ہدایت فرمائی تھی، ان میں سے ایک نجاشی کا انتقال ہوا۔ کئی نجاشی مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں، ان میں

سے ایک کا انتقال ہوا۔ اس کی مدینے خبر آئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بادشاہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی، جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ بادشاہ مسلمان تھا اور آزاد بھی تھا۔ اس کی حکمرانی میں مدینے کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ کا انفرادی اسلام تھا۔ اس کے بعد وہاں جو حکمران ہوا وہ مسلمان نہیں تھا۔

غرضیکہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں کو دوست بنایا جا سکتا ہے اور ان کے ممالک سے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ نیز ایک حکمران اپنی شخصی حیثیت میں دوسری سلطنت کی رعیت بن جائے، لیکن اپنی سرکاری حیثیت میں آزاد اور خود مختار رہے، یہ بھی ہمیں صورت نظر آتی ہے۔

عہدِ نبوی کی اسلامی مملکت کے عناصر میں سے ایک اومان کی حکومت ہے۔ ایک حبشہ کے نجاشی کی حکومت بھی ہے۔ اس کے علاوہ قبائل بھی آزاد تھے۔ حالانکہ ان قبائل کی حد تک مرکز کی جانب سے زیادہ مطالبات کیے جا سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قبائل کے سرداروں کو بھی قبول کیا جاتا تھا، اگر مرکزی حکومت کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو قبیلے کے سردار کے ذریعے سے وہ کام انجام دیا جاتا تھا، غرضیکہ یہ اسلامی حکومت جو عہد نبوی میں قائم ہوئی، یونیٹری (وحدانی) قسم کی نہیں ہے، اس میں مختلف قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں، اس میں افراد بھی ہیں، قبائل کے سردار بھی ہیں، بادشاہتیں بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک چیز کا اور ذکر کروں، وہ ہے سلطنت کی بقا کے متعلق تدبیریں:

دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی انسان ہوتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ناگزیر تھی، اس لیے وہ ہوئی بھی۔ وفات کے بعد کے کاموں کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں بہت ادب کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سلطنت اور حکومت قائم فرمائی تھی، اس کی وراثت یا جانشینی کے متعلق کوئی ایسی چیز نہ ارشاد فرمائی، نہ اس پر عمل کیا، جو اُس دور میں پائی جاتی ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا یا پہلی بیٹی خود بخود جانشین بن جاتے ہیں۔ اگر بیٹا نہ ہو تو بھائی بھتیجا وغیرہ جانشین مقرر ہو جاتے ہیں۔ گویا اُس دور میں جانشینی کے قواعد پائے جاتے ہیں، لیکن ایسی کوئی چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے قائم نہیں فرمائی، جس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ ہمیں اجازت دی گئی ہے کہ حسب ضرورت ہم خود کوئی طریقہ اختیار کرلیں، چاہے وہ خانوادہ وار بادشاہت ہو، چاہے جمہوریت ہو، چاہے جماعتی حکومت ہو، سب کی ہمیں اجازت دی گئی ہے اور اس کے لئے ہمیں یہ بشارت بھی دی گئی ہے۔

يدُ اللّٰهِ على الجماعة۔

یعنی اگر سارے مسلمان متفق ہوکر کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ جل شانہٗ کا ہاتھ اُن پر ہوتا ہے۔ اس لیے یَدُ اللّٰہ علی الجماعۃ کی خوشخبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنی ضرورت کی لحاظ سے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جمہوریت بھی قائم کرسکتے ہیں، خانوادہ حکومت بھی قائم کرسکتے ہیں اور جو بھی مناسب سمجھیں کرسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ وفات سے دو تین دن پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تھکن کی حالت میں تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ تمہیں آخری احکام دوں۔ چنانچہ ظہر سے پہلے خطبہ شروع کیا، ظہر کے لیے وقفہ کیا، ظہر کے بعد دوبارہ خطبہ جاری رکھا اور اس اثنا میں جب انتہائی تھکن محسوس کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام نے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس خطبے میں یہ صراحت تھی کہ جلد ہی میں رحلت کرنے والا ہوں لہٰذا تم فلاں کام کرو، فلاں کام کرو۔ یہ نصیحت کی باتیں تھیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے اور مزاج وطبیعت کے متعلق معلوم کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ اس وقت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بہتر حالت میں پایا تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بہت سی چیزیں بتائی ہیں .... اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم املا کروائیں اور کوئی ان چیزوں کو لکھ دے تو ہمارے لیے یہ وصیت کا کام دے گی، اور یہ اچھی بات ہوگی۔

یہ مشہور قصہ ہے لیکن وہ پورا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے متعلق نہ اس آخری خطبے میں کوئی صراحت فرمائی اور نہ اس سے چند مہینے پہلے حجتہ الوداع کے موقع پر جو مشہور عام خطبہ دیا، اس میں کوئی صراحت فرمائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذیلی طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیا کہ کیا ہونا چاہئے۔ وہ ہے نماز کی امامت - اسے اسلام میں جماعت کا سرکردہ اور حاکم شخص ہی انجام دیتا ہے۔ قبیلے میں قبیلے کا سردار، کسی شہر میں وہاں کا گورنر اور خود مدینے میں حکمران اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامت کراتے تھے۔ ایک دن جب آپ انتہائی تھکن محسوس کر رہے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینے کے لیے آئے کہ جماعت تیار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہو کہ وہ امامت کریں۔ یہ ایک ذیلی طریقہ تھا یہ کہنے کا کہ میرے بعد سب سے ممتاز شخص ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ صراحت نہیں تھی، لیکن ایسا ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کام کو جاری رکھتے ہیں- پنج وقتہ نماز میں وہ امامت کراتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک دلیل کے طور پر، خاص طور پر ان لوگوں کو جو انصارِ مدینہ کو چاہتے تھے کہ خلیفہ ان میں سے ہو، یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنایا ہے، کیا تم امام کو بدل کر کوئی دوسرا امام مقرر کرنے کی جرأت کرو گے؟

گویا اُن لوگوں سے ایک دلیل کے طور پر کہا گیا اور انہوں نے قبول بھی کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت ایک معنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف انصارِ مدینہ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور اس کا خلیفہ یا حکمران ان میں سے ہو، انصار میں پھوٹ تھی لہٰذا ان کی خواہش ایک ایسی خواہش تھی جس میں کوئی جان نہ تھی۔ اگر اوس کے قبیلے سے سردار لیا جاتا تو خزرجی اسے قبول نہیں کرتے، خزرجی ہوتا تو اوسی قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ ان میں اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی دن سے خانہ جنگی اور پھوٹ پڑ جاتی۔ بہر حال اس موقعہ پر ایک قبیلے کے سردار نے اپنے محلے کی انجمن کے دفتر میں لوگوں کو جمع کیا اور یہ کوشش کی کہ ایک شخص کا انتخاب بطور خلیفہ کے کیا جائے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر

یہ کام ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ بھی قبول کر لیں گے۔ اگر نہ ہوا تو لوگ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ فوراً اُٹھے اور اپنے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن جراح اور دو ایک ساتھیوں کو لیا اور سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے، جہاں انصار کے قبیلے کے لوگ جمع ہو کر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنانے پر غور کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں بلا اطلاع پہنچتے ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں کہتے کہ جاؤ تمہاری ضرورت نہیں ہے، بلکہ کہتے ہیں تشریف لائیے۔ وہ لوگ انہیں ادب کے ساتھ سمجھاتے ہیں، کہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی حکومت برقرار ہے اور چونکہ انصاریوں کی مدد سے اسلامی حکومت پھیلی ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین خلیفہ بھی انصار میں سے ہونا چاہیے، بس یہی ہم سوچ رہے تھے۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُٹھتے ہیں اور اُن کو مخاطب کر کے مختلف چیزیں بتاتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم نے خود سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار (یا بارہا) فرمایا ہے کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے، لہٰذا وہ کوئی مکے کا مہاجر ہوگا، تم میں سے یعنی انصار میں سے نہیں ہوگا۔

انصار کی دین داری کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ بات سنتے ہی سب حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور اس ایک ہی لفظ پر سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ انصار کہتے ہیں بے شک سرِ تسلیم خم، ہم مانتے ہیں کہ مہاجرین میں سے کوئی شخص خلیفہ بنایا جائے۔

اس کے بعد کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ بیعت کریں، تو ایک انصاری سردار چلاتا ہے، ٹھہرو! ٹھہرو! تم سے پہلے میں بیعت کروں گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انصار اس کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انصار ہی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا ہے۔

یہ طریقہ بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ جانشینی کے لیے عوام الناس سے استصواب کیا جائے، اور جو لوگ اسے قبول کریں اس کو سب لوگ مانیں۔

ایک آخری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بننا نہیں چاہتے تھے، مجبور ہو گئے تو گھر آ کر عام لوگوں کو بلایا، اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو

چکی ہے کیا کرنا چاہئے؟ وہاں پر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حاضرین نے مسجد میں بیعت کی تجدید کی۔

اس واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان نظر آتی ہے، آدمی مدہوش ہو جاتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے خلیفہ بناؤ، چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ تین دن تک شہر کی گلی گلی میں، محلے محلے میں ڈھنڈورا پٹوایا گیا، لوگ بیان کرتے گئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ نہیں ہونا چاہتا، تم مجھ سے بہتر کسی شخص کا انتخاب کرلو اور تمہیں تمہاری بیعت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ کیا ہم ایسے بے نفس شخص کو خلیفہ بنائیں؟ یا حکومت کے خواہش مند کسی شخص کا انتخاب کریں؟ بالکل نتیجہ ظاہر ہے۔

بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت قائم فرمائی، وہ کس طرح پھیلی؟ یہ بیان کر چکا ہوں، اور کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کا انتظام فرمایا؟ یہ بھی آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ آج کل ہماری ضرورتیں بے شمار ہیں۔ ہر چیز کے متعلق میں آپ کے سامنے سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ پیش نہیں کرسکتا۔ حکومتوں کے سلسلے میں اور خاص کر آج کل کی اسلامی حکومتوں کی مصیبتوں کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہمارے لیے ایسے سبق ہیں کہ اگر انہیں تلاش کیا جائے تو ہم اپنے ہر معاملے کو حل کرنے کی اس میں تدبیر پائیں گے۔

اگر ہم میں حقیقی اور مخلصانہ خواہش ہو کہ ہم خدا جل شانہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کریں، ذاتی خواہشوں کو چھوڑ دیں اور اسلامی طریقے کو اپنائیں تو ہمارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

یہ تھیں چند چیزیں جو میں نے عرض کیں۔ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

اِستفسارات و جوابات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم و مغفور مختلف موقعوں پر، کئی مرتبہ پاکستان تشریف لائے اور اپنے خصوصی موضوع یعنی قرآن و حدیث، اور سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور متعلقہ موضوعات پر مختلف شہروں مثلاً کراچی، بہاول پور، لاہور اور اسلام آباد وغیرہ میں اہلِ علم و دانش سے خطاب کیا۔ اُن کے خطاب کے بعد حاضرینِ مجلس کی جانب سے استفسارات کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہر سوال کا جواب کمال تحمل سے انتہائی فاضلانہ انداز میں، اختصار کے ساتھ، اس انداز میں دیتے تھے کہ سوال کنندہ کی تشفی ہو جاتی تھی۔ ایسے علمی و فکری، دینی و دنیاوی مسائل و سوالات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے جوابات آواز بند یا قلم بند ہو جاتے تھے جو اکثر کتب و جرائد میں محفوظ ہیں۔ یہاں اِن سینکڑوں "استفسارات و جوابات" کے بیش قیمت ذخیرے سے صرف چالیس استفسارات کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ انتخاب کرتے وقت یہ امر خاص طور پر ملحوظ رہا ہے کہ ایک موضوع سے متعلق ایک ہی استفسار منتخب کیا جائے، تاکہ تکرار اور اعادہ نہ ہونے پائے۔

(مُرتب)

فہرست

(20) جہاد کی تعریف
(21) اسلام میں رُوحانیت اور مادّیت
(22) اسلام میں موسیقی کی کس حد تک اجازت ہے؟
(23) مرحوم کی قُل خوانی اور چہلم
(24) مخلوط تعلیم کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر
(25) ستاروں کا اثر انسان کی زندگی پر؟
(26) کیا نماز پڑھتے وقت سر پر کپڑا لینا ضروری ہے؟
(27) قانون سازی، اجماع اور نفاذ
(28) وکیل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر
(29) زکوٰۃ اور عُشر کی موجودگی میں دوسرے ٹیکس کیوں؟
(30) اسلام اور جدید جمہوریت
(31) انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟
(32) رَفع الیدین جائز ہے یا نہیں؟
(33) کیا علماء کو ہدیہ دینا جائز ہے؟
(34) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت
(35) کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟
(36) اسلام اور عیسائیت کے پیروکاروں کی تعداد
(37) مسلمانوں میں تبلیغ کی ضرورت
(38) مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟
(39) تبلیغی جماعت کی کارکردگی کے نتائج
(40) فنونِ لطیفہ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

(1) حروفِ مقطعات

سوال : محترم ڈاکٹر صاحب! حروفِ مقطعات کے بارے میں آپ کی تحقیق کیا ہے؟

جواب : قرآن مجید میں بعض جگہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ حروف ہیں مثلاً الٓمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان الفاظ کی کبھی تشریح نہیں فرمائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح فرمادی ہوتی تو بعد میں کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ اس کے خلاف کوئی رائے دے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کم از کم ساٹھ ستر آراء پائی جاتی ہیں۔ الف صاحب یہ بیان کرتے ہیں۔ ب صاحب وہ بیان کرتے ہیں۔ اور یہ چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ اس کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آج بھی لوگ نئی نئی رائیں دے رہے ہیں۔ لطیفے کے طور پر میں عرض کرتا ہوں۔ سنہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے، میں پیرس یونیورسٹی میں تھا، تو ایک عیسائی ہم جماعت نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مسلمان ابھی تک حروف مقطعات کو نہیں سمجھ سکے۔ میں بتاتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ موسیقی کا ماہر تھا، کہنے لگا کہ یہ گانے کی جوئے اور دھن وغیرہ ہوتی ہے اُن کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ لوگ حروف مقطعات کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اپنی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ سوائے ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کچھ اشارہ ملتا ہے کہ ایک دن کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ تمہارا دین کب تک رہے گا؟ کم و بیش اسی مفہوم کے الفاظ انہوں نے ادا کیے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الٓمٓ" تو انہوں نے کہا اچھا تمہارا دین الف (۱) ل (۳۰) اور م (۴۰) یعنی اکہتر سال رہے گا الحمدللہ اکہتر سال بعد تمہارا دین ختم ہو جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھ پر "الٓمٓرٰ" بھی نازل ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ۲۲۱ سال یا ۲۳۱ سال۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر فلاں لفظ بھی نازل ہوا ہے مثلاً "حٰمٓ عٓسٓقٓ" وغیرہ۔ یہاں تک کہ یہودیوں نے کہا کہ

ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا اور چلے گئے۔ ہوسکتا ہے انہیں پریشان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جواب دیا ہو۔ لیکن اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ حروف کی گویا عددی قیمت ہے۔ جس طرح آپ لوگ واقف ہیں کہ الف کے ایک، ب کے دو، ج کے تین اور د کے چار عدد مقرر ہیں۔ اس طرح عربی زبان میں اٹھائیس حرف ہیں۔ ان سے بہت ہی انوکھے طریقے سے ہم ایک ہزار تک لکھ سکتے ہیں۔ تاکہ ہندسہ لکھنے میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو حروف کے ذریعے اسے دور کیا جا سکے۔ میں نے سنا ہے کہ سنسکرت میں بھی یہ طریقہ موجود ہے لیکن سنسکرت میں حروف تہجی ۲۸ سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اس میں ایک سے مہاسنکھ تک لکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ایک ہزار ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ یہ تھا حروف مقطعات کے متعلق میری معلومات کا خلاصہ۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔

(2) انجیل برناباس

سوال : انجیل برناباس کی صحت کے متعلق آپ کی کیا تحقیق ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کی تاریخ میں انجیل برناباس پر بحث کی کم ضرورت ہے۔ قصہ یہ ہے کہ برناباس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دین قبول کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ اور ایک زمانے میں اُن کی بڑی اہمیت تھی۔ سینٹ پال کا نام آپ نے سنا ہو گا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اُن کا دشمن رہا۔ عیسائیوں کو تکلیف دیتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے سفر کر جانے کے بعد ایک دن اُس نے کہا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین سچا تھا اور اُس دن سے وہ عیسائی بنا، مگر لوگوں کو اُس پر اعتبار نہیں تھا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ منافق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جب یہ ہم کو تکلیفیں دیتا رہا تو اب ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ وہ حقیقۃً کایا پلٹ ہو کر دین دار ہو گیا ہے۔

برناباس، جن کو میں رضی اللہ عنہ کہہ سکتا ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں

میں سے تھے۔ انہوں نے کہا نہیں، مجھے اطمینان ہے کہ یہ پکا اور سچا دین دار ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد شہر بیت المقدس میں ایک اجتماع ہوا۔ جہاں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو قول ہے کہ میں توریت کے ایک شوشے کو بھی تبدیل کرنے نہیں آیا ہوں آیا اس کی من وعن تعمیل کی جانی چاہیے، اس قانون کو ہم برقرار رکھیں یا لوگوں کو اپنے دین کی طرف مائل کرنے کے لیے اس میں کچھ نرمی کریں۔ یہ یروشلم کونسل کہلاتی ہے۔ وہاں سینٹ پال کا اصرار تھا کہ اس کو باقی نہ رکھا جائے بلکہ توریت کے سخت احکامات کو نرم کر دیا جائے۔ برناباس نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس وقت شدت سے کہا تھا کہ یہ شخص منافق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عیسائیوں نے برناباس کی تازہ ترین شہادت کو قبول نہیں کیا۔ برناباس کو کونسل سے نکال دیا اور سینٹ پال کی بات کو قبول کیا۔ عہد نامہ جدید کے ایک باب میں صراحت سے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کو روح القدس کی طرف سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اب تم پر پرانے احکام باقی نہیں رہے۔ سوائے چار چیزوں کے۔ ایک تو یہ کہ خدا کو ایک مانیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی بت پر جانور ذبح کیا گیا ہو تو اسے نہ کھائیں۔ تیسرے یہ کہ فحش کاری نہ کریں۔ اسی طرح کی ایک اور چیز کا بہ صراحت ذکر ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنی پابندیاں اور ممانعتیں تھیں اب وہ تم پر باقی نہیں رہیں۔ چنانچہ اب لوگ، عیسائی دنیا میں، سینٹ پال کی اس رائے پر عمل کرتے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ کہ ''میں توریت کا ایک شوشہ بھی بدلنے نہیں آیا ہوں۔ اس کی من وعن تعمیل ہونی چاہیے'' اس پر عمل نہیں کرتے۔

انجیل برناباس، جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، زمانۂ حال کی دستیاب شدہ ایک چیز ہے۔ اس کا کوئی پرانا نسخہ نہیں ملا۔ اور وہ برناباس کی مادری زبان ''زرامیگ'' زبان میں بھی نہیں ہے۔ بلکہ اطالوی زبان میں ہے اور اس کے قلمی نسخے کے حاشیے پر جابجا عربی الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عیسائی محققین کا خیال ہے بلکہ اصرار ہے کہ یہ مسلمانوں کی تالیف کردہ جعلی انجیل ہے اور یہ حضرت برناباس کی انجیل نہیں ہے۔ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے البتہ اس حد تک جانتا ہوں کہ انجیل برناباس کے دو نسخے ایک زمانے میں ملتے تھے۔ ایک وہ جو آسٹریا میں تھا اور جو غالباً ابھی تک محفوظ ہے۔ ''غالباً'' میں

اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ٹھیک علم نہیں ہے۔ دوسرا وہ نسخہ جو اسپین میں تھا۔ جب آسٹریا کا نسخہ انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا تو اسپین کا نسخہ یکا یک غائب ہو گیا۔ غالباً اسے ضائع کر دیا گیا۔ بہر حال یہ مختصر سے حالات ہیں۔ مجھے شخصی طور پر انجیل برناباس کے متعلق معلومات نہیں ہیں، سوائے اس کے کہ اس میں جابجا ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو مسلمانوں کی خواہش سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور عیسائیوں کے جو عام عقائد ہیں، اس سے کچھ اختلافات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ اس کو میں شخصی طور پر کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتا، کیونکہ میرے مطالعے کا جو موضوع ہے، وہ اس سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کوئی واقفیت نہیں ہے۔ ادب سے معافی چاہتا ہوں۔

(3) لفظ فارقلیطس کی تحقیق

سوال : لفظ فارقلیطس کے متعلق وضاحت فرمایئے۔

جواب : فارقلیطس سے غالباً آپ واقف ہوں گے کہ یہ ایک یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی یونانی زبان میں Director یا رہنما کے ہیں، مسلمانوں میں یہ خیال عام ہے کہ یہ وہ لفظ ہے جس کے معنی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں یعنی جس کی بہت تعریف کی جائے۔ یہ خیال مسلمانوں میں غالباً اس وجہ سے عام ہوا کہ مسلمانوں کے قدیم ترین سیرت نگار ابن اسحٰق نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قدیم دینی قصوں اور کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فارقلیطس کا لفظ انجیل میں آیا ہے، جس کے معنی احمد کے ہیں۔ یہ تھا خلاصہ اس قصے کا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیشین گوئی فرمائی ہو جیسا کہ قرآن نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ "و مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد" پیر یقلیطس اور پر قلیطس دو یونانی لفظ ہیں ان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پیر یقلیطس کے معنی ہوتے ہیں جو حمد و ثناء کا مجسم نمونہ ہے: "احمد"، اور پر قلیطس کے معنی ہیں Director یا رہنما۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ آخری نبی آئے گا جو ہادی ہو گا، یا یہ فرمایا کہ آخری نبی آئے گا جو حمد و ثناء کا مجسم نمونہ ہو گا، تو نتیجہ ایک

ہی ہے۔ وہ ایک پیشین گوئی کر رہے تھے کہ میں نے دین کی تکمیل نہیں کی۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا، وہ اس کی تکمیل کرے گا۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کی تائید انجیل کے بعض دوسرے قصوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں ''مجھے جلد ہی دنیا سے جانا پڑے گا''۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ''یہ ضروری ہے کہ میں یہاں سے جاؤں تاکہ آسمانی باپ تمہیں وہ شخص روانہ کرے جو تمہیں وہ چیزیں بیان کرے گا جو میں اب تک بیان نہیں کر سکا ہوں۔ ایسی بہت سی باتیں تھیں، جو میں نے تمہیں بیان کرنا تھیں لیکن تم میں اس کا تحمل نہیں ہے۔ وہ شخص آئے گا جو میری بھی چیزیں دوبارہ بیان کرے گا اور وہ قیامت تک تمہارے ساتھ رہے گا''۔ انجیل کی دوسری عبارتوں میں کچھ اس طرح کی عبارتیں ہیں جن سے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ اور یہ گویا خلاصہ ہے میری معلومات کا۔

(4) کیا حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمّ سلمہؓ حافظ قرآن تھیں؟

سوال : اُم ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون تھیں؟ کیا صرف وہی حافظہ تھیں یا حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حافظِ قرآن تھیں؟

جواب : حضرت اُمّ ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک انصاری عورت تھیں جو بہت پہلے ایمان لائی تھیں۔ چنانچہ اُن کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ بدر (۲ ہجری) میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں، میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی وہ یہ کہ حضرت اُم ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی

بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اُم ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ اس لیے ہمیں سوچنا پڑے گا۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی تھی۔ ہالینڈ کا ایک طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا، اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی، کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اُسے نماز نہیں آتی۔ اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میرے اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں، لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت اُم ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔ اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہیے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے۔ پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے الفاظ میں ایسی استثنائی صورتیں جو کبھی کبھار اُمت کو پیش آ سکتی تھیں، ان کی پیش بندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب فرمایا تھا۔ شاید اس واقعے کی یہ وجہ ہو۔ ہمارے دوست سوال کرتے ہیں کہ کیا اور عورتیں بھی حافظہ تھیں؟ مجھے اس کا علم نہیں، ان معنوں میں کہ حافظ ہونے کا صراحت کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں ذکر ملتا ہے تو صرف انہیں کے متعلق۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

وغیرہ کے متعلق میں نے کبھی کوئی روایت نہیں پڑھی کہ وہ حافظہ تھیں۔ انہیں کچھ سورتیں یقیناً یاد ہوں گی۔ اور ممکن ہے کہ بہت سی سورتیں یاد ہوں۔ لیکن ان کے حافظ قرآن ہونے کی صراحت مجھے کہیں نہیں ملی، اس کے سوا اور میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔

(5) کونسا طریقۂ نماز دُرست ہے؟

سوال : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل علیہ السلام نے نماز کا طریقہ بتلایا۔ نماز کے طریقے پر تحقیق کیا ہے؟ کونسا طریقہ نماز درست ہے مختلف فرقوں مثلاً شیعہ یا سُنی طریقوں میں فرق کیا ہے؟

جواب : میں نے یہ ذکر بلاذری کی ''انساب الاشراف'' میں پڑھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرنا بھی سکھایا تھا، طہارت اور استنجے کا طریقہ بھی بتایا تھا اور نماز پڑھنا بھی سکھایا تھا۔ شیعہ اور سُنی کی نمازوں میں جو فرق ہے میری دانست میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مالکی مذہب کے لوگ، جو سُنی ہی ہیں، وہ بھی ہاتھ چھوڑ کر اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح شیعہ پڑھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس طرح پڑھا اور کبھی اس طرح پڑھا۔ ایک چیز پر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ اب سے کوئی ۶۵ سال پہلے کا واقعہ ہے یا اس سے بھی زیادہ، ۶۷ سال پہلے کا۔ میں پرائمری اسکول میں تھا۔ ایک دن ہمارے ہیڈ ماسٹر کلاس میں آئے اور معلوم نہیں کس بنا پر ہر ایک سے پوچھنے لگے، تمہارا نام کیا ہے؟ طلباء میں کچھ ہندو بھی تھے اور کچھ مسلمان بھی تھے۔ مسلمانوں سے پوچھا تم کس فرقے سے ہو؟ ان میں شیعہ بھی تھے اور سُنی بھی تھے۔ اُس وقت انہوں نے ایک جملہ کہا جو آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکا۔ انہوں نے کہا، بچو! اس پر کبھی نہ جھگڑنا۔ شیعہ اور سُنی دونوں بھائی بھائی ہیں۔ دونوں مسلمان ہیں۔ اصل میں ان میں جو فرق ہے وہ ایک مصلحت سے ہے۔ اللہ میاں کو اپنے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس قدر محبت تھی کہ اُس نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت کو قیامت تک محفوظ رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے کبھی یوں نماز پڑھی اور کبھی یوں پڑھی۔ اگر سارے لوگ ایک ہی طریقے سے پڑھیں تو دوسرے طریقے سے پڑھی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز غائب ہو جائے گی۔ جب کہ اللہ جل شانہٗ کو یہ منظور تھا کہ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت قیامت تک محفوظ رہے۔ لہٰذا ان کی ایک سنت پر یہ لوگ عمل کر رہے ہیں اور دوسری سنت پر وہ لوگ، لیکن دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔

(6) قولِ الٰہی، قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سوال : ایک مرتبہ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا، خدا کی قسم! جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "اللہ" کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بولتے، جبکہ بعض علماء کے نزدیک نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ یعنی اُن کی ہر بات درست نہیں۔ وضاحت فرمائیں؟

جواب : اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی والہام سے کوئی چیز معلوم ہو چکی ہے اور وہ چیز بیان کریں گے تو وہ وحی پر مبنی ہو گی۔ لیکن وحی ابھی آئی نہیں ہے، وحی کے انتظار میں ہیں، فوری معاملہ درپیش ہے تو اجتہاد کریں گے، یعنی اپنی رائے سے کوئی حکم دیں گے۔ اور اسی کے متعلق وہ حدیث ملتی ہے کہ اگر مجھے وحی آچکی ہوتی تو میں تم لوگوں سے مشورہ نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت وحی کا انتظار رہتا تھا اور بعض اوقات فوری ضرورتوں سے وہ خود اجتہاد کر کے اپنے فہم و فراست سے حکم دیا کرتے تھے اور ان احکام میں بعض وقت وحی کے ذریعے سے تنسیخ بھی ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں یہ مثال ملاحظہ ہو کہ جنگ کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟ جنگ بدر کے موقع پر یہ معاملہ پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وحی کی غیر موجودگی میں اور انتظار میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کا سر قلم کر دیا جائے، یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اسلام کے ازلی وابدی دشمن ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں، آج وہ

مسلمان نہ ہوں لیکن ممکن ہے ان کے بچوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے۔ میری رائے میں ان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری دوسری ضرورتیں ہیں، انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے کو قبول کیا اور وہی حکم دیا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے، بلکہ فدیہ لیا جائے۔ اللہ جل شانہٗ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ فرمایا: "لولا کتٰب من اللّٰہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (۶۸:۸) [اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا، کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے، تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی] آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ عایہ وسلم الہام کی اور وحی کی غیر موجودگی میں بعض اوقات انسانی ضرورتوں سے اور انسانی طریقہ سے، مشورے کے ساتھ یا بغیر مشورے کے، اپنی صوابدید کی بنا پر احکام دیا کرتے تھے اور بعض وقت وہ اللہ کو پسند نہیں آتا تھا۔ اس وقت فوراً تنسیخ کی وحی آ جاتی تھی تاکہ اُمت غلط چیزوں پر عمل نہ کرے۔ اس واقعے کی تھوڑی سی توجیہ میں اور کروں گا۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ پرانے انبیاء کی شریعت پر عمل کرو۔ واقعۃً توریت میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمن سے لیے ہوئے مال غنیمت کو جلا ڈالو۔ وہ خدا کا مال ہے، خدا تک پہنچانے کے لیے تم اس کو جلا ڈالو۔ تم اس سے استفادہ نہ کرو۔ جب کوئی نئی وحی نہیں آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا کہ اس پرانے قانون یعنی توریت پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ اس سے خدا نے وہ آیت نازل کی: لولا کتٰب من اللّٰہ سبق لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم۔ (۶۸:۸) بہر حال ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کو کہ میری زبان سے، میرے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ برحق ہوتی ہے، اس معنی میں لیں کہ اولاً یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے معلوم کردہ چیزوں کو بیان کرتے ہیں یا بشری حیثیت سے بھی بیان کرتے ہیں۔ عمداً کسی کو بھٹکانے یا گمراہ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ جو چیز مناسب ترین ہے اور جس کی خدا نے ممانعت نہیں کی ہے اس کا حکم دیتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔

ایک سوال ہے کہ ہم حدیث کے صحیح ہونے کا اندازہ کس طرح لگائیں؟ اس کا

جواب میں دے چکا ہوں کہ علمائے حدیث نے مختلف علوم اختراع کیے ہیں جن سے حدیث کی روایتاً اور درایتاً دونوں سے جانچ ہو سکتی ہے اور ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس حدیث پر اعتماد کیا جائے اور کس حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے۔

(7) عہدِ نبویؐ میں بیمے کا نظام

سوال : آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انشورنس کا نظام رائج تھا۔ ذرا وضاحت فرمائیں کہ کیا موجودہ انشورنس کے نظام میں اور اُس انشورنس میں فرق ہے؟ کیونکہ موجودہ انشورنس کے نظام کو غیر شرعی کہا جاتا ہے؟

جواب : زمانۂ حال میں دو طرح کی انشورنس ہے۔ ایک Capitalist انشورنس اور دوسرے کو Mutualist انشورنس کہتے ہیں۔ Capitalist میں سرمایہ دار انشورنس کمپنیاں قائم کرتے ہیں اور Clients سے اتنی رقم لیتے ہیں جو انشورنس کے ممکنہ ہرجانوں سے کچھ زیادہ ہو۔ گویا پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients منفعت میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً موٹر کار کی انشورنس کمپنی کو لیجیے۔ پانچ سو آدمی اس کے ممبر بنتے ہیں اور ہر شخص ایک سو روپیہ ادا کرتا ہے۔ اگر کمپنی کو پہلے سال دس لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی جب کہ انشورنس کا معاوضہ دو ہزار روپے دینا پڑا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے ملازمین کو تنخواہوں کے لیے دینے پڑے اور باقی رقم محفوظ رہی۔ Capitalist انشورنس میں پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients کو استفادے کا موقع ملتا ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو انشورنس کا نظام تھا وہ Mutualist سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کے جملہ افراد اپنے قبیلے کی انجمن کے خزانے کو سالانہ تھوڑی رقم دیتے ہیں مثلاً ہر شخص ایک درہم، دو درہم دیتا ہے اور جب کبھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کمپنی کا یہ سرمایہ جو سارے افراد قبیلہ کی طرف سے آیا تھا، اس ایک شخص

کی ضرورت کے لیے کام آتا ہے جسے ہرجانہ ادا کرنا ہے پھر اس میں Mutualist سسٹم کو بڑھا کر یہ نظام قائم کیا گیا تھا کہ اگر ایک قبیلہ کے خزانے میں رقم کافی نہ ہو، تو اس کے ہمسائے میں جو کمیٹی ہے، وہ بھی اس کی مدد کرے اور بالآخر حکومت مدد کرے۔ یہ دو مختلف سسٹم رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ٹیکنیکل چیز کو میں چند الفاظ میں پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔

(8) قبروں پر فاتحہ خوانی

سوال : اولیاً اللہ کی قبروں پر جا کر ''السلام علیکم یا اہلِ القبور'' کہنا، فاتحہ پڑھنا اور اُن کے طفیل سے خدا سے فضل و کرم کی التجا کرنا، یہ اُمور قبر پرستی میں شامل ہیں یا نہیں؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزارات کی زیارت فرماتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کہا کرتے تھے۔ اُن کے لیے فاتحہ پڑھتے تھے۔ تو میں اگر کروں تو سنت ہی کی پیروی ہوگی، بدعت اور جدید چیز نہ ہوگی۔ باقی کسی کے طفیل سے اللہ کے فضل و کرم کی التجا کرنا، یہ نیت پر منحصر ہے۔ اگر آپ یہ خیال ظاہر کریں کہ چونکہ میں اس صاحبِ قبر کو رشوت دے چکا ہوں، اُس پر پھول چڑھا چکا ہوں۔ لہٰذا اُن کا فریضہ ہے کہ جو چیز اللہ میاں نہیں چاہتے، وہ کر ڈالیں، یہ چیز شرک ہوگی۔

(9) یتیم پوتے کی وراثت

سوال : یتیم بچے کو اُس کے دادا کی وراثت سے کیوں محروم کیا گیا۔ وراثت سے محرومی کے پسِ پشت جو مصلحت کارفرما ہے، اُس پر روشنی ڈالیے؟

جواب : قانون کا ایک اصول ہوتا ہے اور اس اصول سے بعض وقت اتفاقاً کسی فرد کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ایک فرد کے نقصان کی خاطر عام اصول کو بدلا نہیں جا سکتا۔ عام

اصول یہ ہے کہ ایک شخص کی وفات پر اس کے فلاں فلاں قریبی رشتہ داروں کو ایک حصہ وراثت میں دیا جاتا ہے جو قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ اگر اتفاقاً اس قانون کی وجہ سے کسی ایک فرد کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا حل بھی قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وصیت کا ایک قانون اسلام میں پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا، اسے مرنے والا شخص وصیت کے ذریعے سے کوئی چیز دے دے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے پر اس کے بیٹے کو حصہ ملے اور پوتے اپنے دور میں حصہ پائیں گے۔ ان کو اس مرنے والے شخص سے یعنی دادا سے حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک خاص صورت میں جب کہ اس پوتے کا باپ مر چکا ہے، دادا کے لیے ممکن ہے کہ اپنے مال کا ایک حصہ وصیت کے ذریعے سے، اس پوتے کو دیدے تا کہ اسلامی قانون کے عام قاعدے کو بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس انفرادی دشواری، پیچیدگی اور مصیبت کو، جو پوتے کو پیش آنے والی ہے اسے بھی دُور کر دیا جائے۔ یہ ہے فلسفہ اسلامی قانون کا کہ قانون، قانون ہی رہے اور جو استثنائی صورتیں پیش آئیں، ان کا بھی استثنائی حل پیش کیا جائے۔

(10) دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر کیوں؟

سوال : اسلامی قانون میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس صورت سے عورت کو آدھا مرد نہیں بنایا گیا؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال میں ایک بنیادی اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، وہ یہ کہ قدرت کبھی دو چیزوں کو بالکل مماثل نہیں بناتی۔ ایک کو دوسرے کی تکمیل کے لیے complementary بناتی ہے۔ ورنہ اگر ایک ہی طرح کی دو چیزیں ہوں تو وہ redundant یعنی مکرر ہو جائیں گی۔ اور یہ قدرت کی طرف سے ایک ضیاع ہوگا۔ قدرت نے مرد کو یا عورت کو مکمل شخصیت نہیں بنایا کہ self-reproduction کریں۔ عورت کو مرد کی ضرورت نہ ہو، وہی تنہا اپنے بچے پیدا کرے یا مرد کو بیوی کی ضرورت نہ ہو، وہی تنہا ایک دوسرا انسان خود ہی تخلیق کرے۔ بلکہ اس کی جگہ ایک کو دوسرے کے تعاون سے مکمل کرنے کا

بندوبست اپنی حکمت کے تحت کیا ہے۔ ان حالات میں اگر اسلامی قانون دو عورتوں کی شہادتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیتا ہے تو اس کے اس پہلو پر جانے کی جگہ کہ دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے، اگر اس پر سوچیں کہ ایسا کیوں کیا گیا، تو میرے خیال میں زیادہ صحیح اصول ہو گا۔ اور اس کا جواب میں اپنی طرف سے یہ دوں گا کہ دونوں کے فرائض منصبی مختلف رکھے گئے ہیں۔ ایک عورت کو، چاہے وہ مانے نہ مانے، بچے کی ماں بننا پڑے گا، اور اسے بچے کی پرورش کا فریضہ بھی انجام دینا ہو گا۔ اسی طرح مرد کبھی بچہ جن نہیں سکے گا، چاہے وہ کتنا ہی خواہشمند کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں جب عورت کا یہ فریضہ کہ وہ اپنے دودھ پیتے ننھے بچے کی پرورش کرے اور اس کے ذمے وہ فرائض بھی ہوں، جو مرد انجام دیتا ہے تو نہ عورت اپنا کام انجام دے سکے گی نہ مرد اپنا کام انجام دے سکے گا۔ مختلف وجوہ سے اسلامی شریعت نے عورت کو پردہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مخلوط ہونے کی تشویق نہیں دلائی۔ ان حالات میں جس طرح مرد کو اور مردوں سے ملاقات کی آسانی ہوتی ہے، اس طرح ایک عورت کو دوسرے مردوں سے ملاقات کرنے کی سہولت ہماری اسلامی سوسائٹی میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ ایک کی جگہ دو عورتوں کی شہادت طلب کی جائے۔ تاکہ دونوں کی شہادت سے واقفیت اور معلومات مکمل ہو سکیں۔ اس میں عورتوں کی توہین نہیں ہے بلکہ عورت کے فرائض منصبی کی موجودگی میں اس کی سہولت اور امکانات کا لحاظ رکھ کر اس کو یہ موقع دیا گیا ہے، ورنہ ممکن ہے، یہ کہہ دیا جاتا کہ عورت کی شہادت قبول ہی نہ کی جائے۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ نہیں عورت کی شہادت قبول کی جائے، وہ بھی انسان ہے۔ جیسے وراثت میں اسلام سے پہلے عورت کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ قانون وراثت کے نقطۂ نظر سے غالباً پنجاب کی روایات میں بھی یہ چیز رہی ہے کہ عورتوں کو حصہ نہیں ملتا۔ اسلام نے کہا کہ نہیں عورتوں کو بھی حصہ ملے گا، لیکن چونکہ عورت کے واجبات کمتر ہوں گے لہٰذا عورت کا حصہ کم ہو گا۔ آپ کو علم ہو گا کہ ایک عورت خواہ وہ بیٹی ہو یا بیوی ہو یا ماں ہو، ہمیشہ کسی مرد کے زیر کفالت رہتی ہے۔ اسے نفقہ دلایا جاتا ہے اور اگر اس کا قریبی رشتہ دار، بیٹا یا باپ یا شوہر وغیرہ نہ دیں تو قانون اس مرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نفقہ دے۔ عورت کی پرورش کا انتظام مرد کے ذمے کر دیا گیا ہے، لیکن اگر کبھی مرد کو ضرورت پیش

آئے تو کسی عورت کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اس مرد کا نفقہ ادا کرے۔ ان حالات میں ناگزیر تھا کہ قانون وراثت میں عورت کو حصہ کم دیا جائے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ چونکہ عورت کے سارے مصارف قانوناً دوسرے کی طرف سے ادا ہو جاتے ہیں، اس لیے عورت کو حصہ بالکل ہی نہ دیا جائے۔ یہ ہوسکتا تھا، مگر اسلام نے عورت کے ساتھ ایک ایسا برتاؤ کرنا مناسب سمجھا، جو اُس کے وقار اور اُس کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ان حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ قانون شہادت میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ چونکہ عورت کو مردوں کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع مقابلتاً کم ملتے ہیں، لہٰذا ایک کی بجائے دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ میں قانون شہادت کا ماہر نہیں ہوں۔

(11) فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں کیا فرق ہے؟

سوال : فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں کیا فرق ہے؟ ان میں اختلاف کی وجہ کیا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ، امام جعفرؒ کے شاگرد بیان کئے جاتے ہیں۔ فقہ جعفریہ کے نافذ کرنے میں کیا قباحت درپیش ہے؟

جواب : اس سوال میں ذرا سی خامی ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اُستاد اور شاگرد سو فیصد متفق ہوں گے۔ چونکہ امام ابوحنیفہؒ نے امام جعفر الصادقؒ سے درس لیے تھے۔ لہٰذا ان دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرے نزدیک علمی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے سوفی صد صحیح نہیں ہوگا۔ دونوں میں اختلاف رائے تھا۔ حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ اور اُن کے دوسرے شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد میں اختلاف رہا ہے۔ یہاں تک گمان کیا جاتا ہے کہ فقہ حنفی میں ۱۵ فی صد باتوں میں امام ابوحنیفہ کی رائے پر، اور باقی چیزوں میں ان کی رائے کے برخلاف ان کے شاگردوں، امام ابویوسف اور امام محمد، کی رائے پر عمل کیا جاتا تھا، تو ان حالات میں یہ کہنا کہ فقہ جعفری اور حنفی بالکل یکساں ہیں درست نہیں۔ جب وہ یکساں نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ جو لوگ امام ابوحنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ امام جعفر الصادق کی رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ امام جعفر الصادق نبی نہیں ہیں،

انسان ہیں۔ نبی کے سوا، کم از کم سنیوں کے نزدیک، کوئی اور معصوم نہیں ہوتا۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی پوری صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا کہ علماء میں آپس میں اختلاف رائے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ وہ خدا جل شانہٗ کی رحمت ہی ہے۔ ان حالات میں اگر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اپنے استاد امام جعفر الصادق سے اختلاف کرتے ہیں تو استاد کی توہین کے لیے نہیں بلکہ پوری دیانتداری کے ساتھ، پوری خدا ترسی کے ساتھ وہ جو رائے رکھتے ہیں، اسے بیان کرتے ہیں۔ جب قانون میں اختلاف ہے تو ان حالات میں اگر ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لوگوں کے لیے نافذ کیا جائے، تو دوسرے فرقوں کے لیے دل شکنی کا باعث ہوگا۔ فرض کیجیے کہ پاکستان میں جعفری فقہ نافذ کرنا چاہیں اور یہاں حنفیوں کی تعداد بہت بڑی اکثریت رکھتی ہے، تو اگر حنفی لوگ قبول کریں تو بے شک مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن حنفی لوگ قبول کرنا نہ چاہیں تو انہیں مجبور کرنا، ایک شورش پیدا کرنے کا وسیلہ بنے گا اور بالکل بے سود سی چیز ہوگی۔ وہ اس پر عمل نہیں کریں گے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ دونوں قوانین میں کس قسم کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کا ایک بھانجا اور ایک بھتیجا موجود ہو تو حنفی قانون کہتا ہے کہ بھانجے کو کچھ بھی حصہ نہیں ملے گا، اور پوری رقم بھتیجے کو ملے گی اور جعفری قانون کہتا ہے کہ پورا ورثہ بھانجے کو ملے گا بھتیجا محروم رہے گا۔

ان حالات میں آپ بتائیں کہ ہم ایک ہی قانون کیسے سارے لوگوں پر نافذ کریں، جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یوں ہونا چاہیے اور کچھ لوگ اس ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے استنباط کر کے یہ کہتے ہیں کہ یوں نہیں ہونا چاہیے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لوگوں پر نافذ کرنا مناسب نہیں، یعنی جہاں تک Personal قوانین کا تعلق ہے۔ البتہ جو اجتماعی قوانین ہیں، اُن میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پارلیمنٹ کے انتخابات، انتظامیہ Administration کے معاملات وغیرہ۔ اس میں ملک کے مختلف نمائندوں کی اکثریت جو اصول طے کرے گی، اُس پر عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان مسائل کے متعلق تفصیلیں قرآن و حدیث میں ہمیں نہیں ملیں گی۔ مثلاً نظام حکومت کیا ہو؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے،

اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو جب اسلام جائز قرار دیتا ہے تو ان حالات میں ہر دور کے اور ہر ملک کے لوگ باہم مشورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے، کہ ہمیں کون سا طرزِ حکومت اپنے زمانے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ شاید اس بات کی ضرورت سمجھیں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ یعنی احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکۂ سبا، بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے کہ "ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا" (۳۴:۲۷) [جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو فساد برپا کرتے ہیں یا اُسے برباد کر دیتے ہیں۔] اس سے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے، مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے بادشاہوں کا ذکر بھی ہے، اور بُرے بادشاہوں کا بھی۔ جہاں ایک طرف فرعون اور نمرود جیسے ظالم بادشاہوں کا ذکر آیا ہے، وہاں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جیسے پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے، جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں، تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلے میں آئی ہے اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کیے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے خیال میں مناسب ہے تو ایسا کیجیے، آپ کے خیال میں مناسب نہیں ہے تو نہ کیجیے۔

(12) ڈاڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال : ڈاڑھی عرب کا خاص رواج تھا، یہاں تک کہ مشرک لوگ بھی ڈاڑھی رکھتے تھے رسم و رواج شرعی نقطۂ نظر نہیں بن سکتے۔ لیکن آج کل ڈاڑھی کو سنتِ موکدہ سمجھا جاتا ہے۔ از راہِ کرم اِس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب : میں عرض کروں گا کہ مشرکینِ عرب ہی نہیں، کارل مارکس بھی ڈاڑھی رکھتا تھا، ہوچی منہ کی بھی ڈاڑھی تھی، لینن کی بھی ڈاڑھی تھی۔ آپ پیرس آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ہزاروں فرانسیسی نو مسلم ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ ڈاڑھی دوسروں کی تقلید میں رکھی جائے۔ آپ بھی قائل نہیں ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن و

حدیث میں کیا احکام ہیں۔قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاۃً ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ اُن کی قوم یعنی یہودی گاؤ پرستی میں مشغول ہیں۔وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے، اُن پر خفا ہوئے۔ قرآنی الفاظ ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی کو کھینچ کر ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔یہ اشارۃً ذکر ہے یعنی ڈاڑھی رکھنا پیغمبروں کی سنت ہے۔حدیث میں اس سے زیادہ صریح الفاظ ملتے ہیں ''ڈاڑھی رکھو'' اس حدیث اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ڈاڑھی رکھنا محض رسم ورواج نہیں بلکہ اسلامی حکم بن جاتا ہے۔حکم کے متعلق آپ کو معلوم ہوگا کہ درجات پائے جاتے ہیں۔یعنی اگر فرض کیجیے کہ قرآن میں صیغۂ امر استعمال کر کے کہا گیا ہے کہ ''زکوٰۃ دو'' اور وہی صیغۂ امر استعمال کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''خیرات دو'' تو ظاہر ہے دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔اگر زکوٰۃ دینے سے میں انکار کروں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار کھینچ کر مجھے مجبور کرسکیں گے کہ زکوٰۃ دوں۔لیکن اگر میں خیرات دینے سے انکار کروں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ممکن ہے مجھے کہیں کہ یہ بُرا مسلمان ہے، لیکن مجھے تلوار کے ذریعے مجبور نہیں کریں گے۔یعنی احکام میں درجہ بندی ہوتی ہے۔اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاڑھی رکھنا بے شک اسلامی حکم ہے، لیکن اس درجے کا حکم نہیں ہے، جیسے اللہ کو ایک ماننا یا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ جل شانہٗ کا نبی ماننا، یا مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا وغیرہ۔اِس کا درجہ نسبۃً کم ہوگا۔

(13) کیا موجودہ طریقۂ انتخابات اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟

سوال : اسلامی نقطۂ نظر سے حکمرانوں کو منتخب کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔کیا موجودہ طریقۂ انتخابات اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟

جواب : اسلام میں بادشاہت کی بھی اجازت ہے، جہاں بادشاہ کا بڑا بیٹا خود بخود ولی عہد بن جاتا ہے۔جمہوریت کی بھی اجازت ہے، اجتماعی حکومت کی بھی اجازت ہے۔

وہاں وہ نظام بھی پایا جا سکتا ہے جو ان سب کا ایک مجموعہ یا ان میں سے چند کا مخلوط مجموعہ ہو، جیسے خلافت راشدہ میں تھا۔ خلافت راشدہ بادشاہت نہیں تھی یعنی باپ کے بعد بیٹا خلیفہ بن جائے، ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں انتخاب ہوتا تھا۔ وہ جمہوریت بھی نہیں تھی کیونکہ جمہوریت میں معین مدت کے لیے (چار پانچ سال کے لیے) کسی کو منتخب اور مقرر کیا جاتا ہے اور پھر نئے انتخابات ہوتے ہیں۔ خلافت راشدہ مجموعہ تھی بادشاہت اور جمہوریت کی یعنی ایک شخص کا تاحیات انتخاب ہوتا تھا۔ اور یہ ساری چیزیں اسلام نے جائز قرار دیں۔ اسلام میں کسی معین طرز حکومت کو لازم قرار نہیں دیا بلکہ عدل وانصاف کو لازم قرار دیا گیا ہے، چاہے اس کو کوئی بھی انجام دے۔ اگر آج حضرت ابوبکر، حضرت عمر یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم زندہ ہوں تو میں بخوشی انہیں سارے آمرانہ اختیارات سونپنے کے لیے آمادہ ہوں کیونکہ مجھے اُن کی خداترسی پر پورا اعتماد ہے۔ اس کے برخلاف اگر آج یزید زندہ ہوں تو میں ان کو انگلستان کے مہر لگانے والے بادشاہ کے برابر بھی اپنا حکمران بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ غرض یہ کہ خواہ انتخاب کیا جائے، خواہ نامزد کیا جائے یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔ انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی چیز بھی آغاز انسانیت سے لے کر تا قیامت کارآمد نہیں ہوسکتی۔ آج یہ چیز مفید ثابت ہوتی ہے، کل اسی چیز کو بُرا کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے اور نئی چیز بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی چار خلفاء کے زمانے میں جانشین کے انتخاب کا کوئی قانون نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف کی صورتیں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مناسب خیال کیا کہ حکومت میں استقلال پیدا کرنے کے لیے اور حکومت کو خانہ جنگیوں سے بچانے کے لیے بادشاہت کا نظام نافذ کیا جائے۔ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اُمت کی بھلائی کے لیے انہوں نے بجائے جمہوریت کے بادشاہت کو نافذ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہت نامناسب پائی گئی تو ہم نے بادشاہوں کے خلاف بغاوت بھی کی۔ غرض یہ کہ انسان کبھی ایک ہی چیز پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حکومت کے اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار حکمران کی شخصیت پر ہے۔ اچھا حکمران چاہے ڈکٹیٹر ہو، خوشی سے عوام اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ ظالم حکمران چاہے جمہوریت کا صدر ہی کیوں نہ ہو، اسے ہم رد کر دیتے ہیں۔

(14) نیّت، ظاہری عمل اور اسلامی قانون

سوال : اسلامی قانون میں فیصلہ ظاہری عمل کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، جس طرح جبری طلاق۔ ایسا کیوں ہے؟ نیّت پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی اور اس کا امکان بھی ہے کہ ایک آدمی ابتداً ایک نیت رکھتا تھا اور جب اُس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ جھوٹ بیان کرتا ہے کہ میری نیت یہ نہ تھی۔ ان حالات میں حدیث کے الفاظ کو اگر ہم دیکھیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے، کیونکہ باطن کا علم صرف خدا کو ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن ایک جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی صحابی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ بھی تھے، انہوں نے ایک دشمن کا دست بدست مقابلہ کیا۔ آخری لمحے میں جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار اُس کے سر کے قریب پہنچ رہی تھی تو اس نے اشہد ان لا اِلٰہ الا اللّٰہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ اُس کے باوجود حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہاتھ نہیں روکا اور اُس کا سر قلم کر دیا۔ جب اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خفا ہوئے۔ زیدؓ نے کہا کہ اُس شخص نے تو صرف ڈر کر کلمۂ شہادت پڑھا تھا، حقیقت میں دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے: ''ھلا شققت قلبہ'' (کیا تو نے اُس کا دل چیر کر اُس کے اندر دیکھا تھا کہ وہ ایسا تھا)۔ دوسرے الفاظ میں ظاہر پر عمل کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ مغرب کی اعلیٰ ترین ایجادوں کے باوجود انسان کے باطن کا حال معلوم کرنا اب تک ممکن نہیں ہوسکا۔ اگر کسی دن یہ ممکن ہو جائے تو ہوسکتا ہے کہ ہم اُس پر عمل کریں، لیکن فی الحال اس پر عمل کرنا انصاف کے خلاف ہی ہوگا۔ لوگ اپنے بُرے اعمال کے خمیازے سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا کریں گے اور اگر جھوٹ کو قانوناً ہمارا قاضی یا حاکم عدالت قبول کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ انصاف نہیں ہوگا، ظلم ہوگا۔

(15) کیا اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے؟

سوال : کیا اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو ہر شخص کے اجتہادی اختلاف کی بنا پر اختلافات کی کثرت ہو جائے گی۔ اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

جواب : اجتہاد کا حق فنِ قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین کو ہوگا، ہر آدمی کو نہیں ہوگا۔ اُن میں اختلاف رائے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرف اکثریت کی رائے ہے اور کس طرف اقلیت کی رائے ہے۔ اولاً فریق ثانی یعنی مخالف کی دلیل کو معلوم کرنے کے بعد ہمیں موقع ملے گا کہ اُسے قبول کریں یا رد کر دیں۔ اس میں میرے نزدیک کوئی دشواری نہ پرانے زمانے میں پیدا ہوئی اور نہ آئندہ زمانے میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ اختلاف رائے کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف نیک نیتی سے کیا جائے، صرف اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ فلاں نے یہ بیان کیا ہے لہٰذا میں اُس کی تردید ضرور کروں۔ غالباً اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے کو روکنا نہیں چاہیے۔ اُسے صحیح رُخ میں صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرنا مفید ہوگا۔

(16) کونسا فرقہ صحیح مسلمان ہے؟

سوال : اگر ایک غیر مسلم آپ سے یہ کہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم آپ مجھے وہ فرقہ بتا دیں جس کے عقائد ونظریات پر عمل پیرا ہو کر وہ صحیح مسلمان بن سکے گا۔ نیز اس بارے میں آپ ذاتی طور پر اُسے کیسے مطمئن کریں گے؟

جواب : اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فرقے کے اندر یا مذہب کے اندر ہے تو پورے خلوص اور پورے یقین کے ساتھ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کا یہی مذہب ٹھیک ہے۔ لہٰذا اپنے پاس آنے والے طالب علم کو بغیر اصرار کے اس پر چلانے کی کوشش کرے گا۔ میرا اپنا طرزِ عمل اس بارے میں کچھ متذبذب سا رہا ہے۔ پیرس میں بعض نومسلم فرانسیسی مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فقہی مذاہب

(Schools of Law) ہیں: حنفی، شافعی، مالکی، ہم کسے اختیار کریں۔ مالکی مذہب میرا مذہب نہیں ہے، لیکن فرانس میں شاید اسّی پچاسی فی صد یا اس سے بھی زیادہ مسلمان مالکی مذہب کے ہیں۔ لہٰذا میں اُن سے کہتا ہوں کہ مالکی مذہب تمہارے ماحول کے لیے موزوں تر ہے۔ میں خود مالکی مذہب کا نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس ماحول میں جذب ہونے کے لیے مالکی مذہب کے رہو تو یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ میرا طرز عمل رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کو اختیار ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، عمل کریں، اور ظاہر ہے کہ آپ اُسی مذہب کی طرف اُس نومسلم کو بلائیں گے جو آپ کی رائے میں صحیح ہوگا۔

(17) استحسان، مصالح اور عُرف سے کیا مراد ہے؟

سوال : استحسان، مصالح اور عرف سے کیا مراد ہے؟

جواب : استحسان سے مراد یہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر جو ظاہری مفہوم ذہن میں آتا ہے، اُس کی جگہ اُس کی عمیق تر وجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اس کو استحسان کہا گیا ہے۔ فوری ذہن میں آنے والی چیز پر نہیں، بلکہ اُس عمیق تر چیز پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے، یہ استحسان کہلاتا ہے۔

مصالح مرسلہ بھی عملاً وہی چیز ہے۔ اس چیز میں مفادِ عامہ کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے، کہ ایسا ہے تو منطق پر عمل کرنے کی جگہ اُمت کی مصلحت، سہولت، آسانی اور ملک میں امن و امان کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ یہ مصالح مرسلہ کہلاتے ہیں۔

عرف کے معنی ملک کے رسم و رواج کے ہیں۔ اسے کس نے بنایا، کب بنایا، ہمیں کوئی علم نہیں۔ جس کو قانون نے منسوخ نہیں کیا، وہ عرف رہتا ہے اور برقرار رہتا ہے۔ یہ عرف ہر ملک کا ہوگا چاہے ہندوستان یا پاکستان کا ہو، عرب کے قبیلوں کا ہو، چین کا ہو، افریقہ کا ہو۔ جہاں بھی ہم جائیں اور کوئی نیا طرزِ عمل کسی چیز کے متعلق نظر آئے جو قرآن و حدیث نے منسوخ نہیں کیا تھا تو اُسے ہم قبول کرسکیں گے، اگر وہ ہماری رائے میں معقول بھی ہو۔

(18) جارحیت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال : اسلام میں دوسری ریاست پر جارحیت کرنا جائز نہیں، لیکن مدینہ کی ریاست جب مضبوط ہوگئی تو مکہ پر حملہ کرنے میں پہل کی گئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب : مکہ پر حملہ کرنے کی پہل مسلمانوں نے کی تھی، اس کا ثبوت آپ کو پیش کرنا چاہیے۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا حدیبیہ کے مقام پر ۶ھ میں مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان جو صلح ہوئی تھی، اُس میں شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے پر پوشیدہ یا اعلانیہ، ظلم و تعدی کرنے سے باز رہیں گے۔ اس کے باوجود جب مکہ کے قبیلہ بنو کنانہ اور قبیلۂ بنو قضاعہ میں جھگڑا ہوا تو اہل مکہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو کنانہ کو ہتھیار فراہم کیے، پھر چھپ کر قبیلۂ بنو قضاعہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کو قتل بھی کیا۔ اس صورت حال میں مسلمانانِ مدینہ سزا اور انتقام کے طور پر اہل مکہ پر حملہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اسے جارحانہ حملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ابتداء اُن کی طرف سے ہوئی تھی اور جواب مسلمانوں نے دیا تھا۔ البتہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس پر آدمی آج بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ اس زمانے میں دس ہزار کی فوج چھپ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی اور رفتار اتنی سست تھی کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اگر آج دو گھنٹے لگتے ہیں، تو اس وقت ہفتے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی فوج مدینہ سے مکہ کے شہر کے مضافات میں پہنچ کر کیمپ ڈالتی ہے۔ اُس وقت تک مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ پھر شہر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا ہے تو ایک قطرۂ خون بہائے بغیر۔ پھر اس کے بعد کا قصہ میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملے سے، کہ آج تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں، جاؤ سب آزاد ہو، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ سب کے سب پورے خلوص کے ساتھ مسلمان ہوگئے۔ بہر حال تاریخی واقعات کی روشنی میں فتح مکہ کو جارحانہ جنگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(19) بین الاقوامی تجارت اور سود

سوال : ایک اسلامی حکومت بین الاقوامی تعلقات میں دوسری مملکت سے تجارت بھی کرتی ہے۔ آج کل سب مملکتیں اپنا کاروبار سود کی بنیاد پر چلا رہی ہیں۔ اسلامی بین الاقوامی قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

جواب : میں سمجھتا ہوں، اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اگر آپ تجارت کریں تو سود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر آپ قرض لیں تو سود کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمان آپس میں تجارت کا انتظام کریں اور باہم سود نہ لیں اور قرض کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مضاربت کے اصول پر عمل کریں تو ہم سود سے بچ سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل اور غیر انٹرنیشنل لاء کے باعث سود کے متعلق اسلامی احکامات بدل نہیں سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے۔ جب تک ہم غلام رہے، انگریز ہم پر بُرائی مسلط کرتے رہے، ہم مجبور تھے۔ لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے پاس صلاحیتیں بھی ہیں، امکانات بھی ہیں جن سے مدد لے کر ہم اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

(20) جہاد کی تعریف

سوال : مجید خدوری ایک عراقی عیسائی ہے۔ اُس نے اپنی کتاب Islamic Law of Nations میں جہاد کی تعریف یوں کی ہے:

"Jihad is a collective duty imposed upon Muslims to fight the unbeliever, whereever he is."

آپ نے اپنی کتاب "The Muslim Conduct of State" میں "Islamic Faith" اور "Islamic Rules" میں فرق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ "Islamic rule is established by all means, including Jihad." کیا اس نوعیت کا جہاد، اقوام متحدہ کے چارٹر سے متصادم نہیں؟ موجودہ دور میں جہاد کے قابل عمل ہونے پر اپنے

خیالات کا اظہار فرمائیں؟

جواب : مجھے یاد نہیں کہ کیا میں نے اپنی کتاب میں صرف اتنا ہی جملہ لکھا ہے یا اُس کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔ جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں، اسلام نے جارحیت شروع کرنے کی اجازت نہیں دی، جنگ کی اجازت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ہے ''وقاتلو في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين'' (۲:۱۹۰) یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے۔ قاتلوا في سبيل الله کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جنگ کرو، اپنی بڑائی، برتری یا کسی اور دنیاوی فائدے کے لیے نہیں۔ اسے جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ باوجود جنگ شروع ہو جانے کے تعدی اور تجاوز نہ کرو بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں، صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے تو پھر امن بقائے باہمی (Peaceful Co-existence) کے سلسلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام خود یہی چاہتا ہے۔ ایک چھوٹا سا نکتہ اس سلسلے میں آپ سے بیان کر دوں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو، نقل کفر کفر نباشد کے طور پر، دہراتا ہوں ''جو لوگ امن لاتے ہیں وہ اللہ کے بیٹے کہلاتے ہیں۔'' یہاں امن لانے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ کے بیٹے سے غالباً اُن کی مراد اللہ کے بندے ہیں یہ لفظ مسلم کا ترجمہ ہے۔ اس مشہور حدیث سے آپ واقف ہوں گے۔ ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده'' یعنی وہ مسلمان ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلم کے معنی ہیں امن لانے والا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کا میں یہ ترجمہ کروں گا کہ مسلمان ہی اللہ کے بیٹے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے۔ اور جب اسلام خود امن پر زور دیتا ہے تو یہ کہنا کہ اسلام پر امن بقائے باہمی کے اصول کے خلاف ہے، میرے خیال میں درست نہیں ہوگا۔ باقی مجید خدوری کے اس بیان سے مجھے اتفاق نہیں کہ "To fight the unbeliever, wherever he is" جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے، اُس وقت تک یہ بیان گمراہ کن ہوگا۔ البتہ یہ چیز صحیح ہے کہ اگر اعلان جنگ ہو چکا ہے تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں ہمیں اُن سے جنگ کرنے کا حق ہوتا

ہے۔لیکن یہ حق ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہوگا۔

(21) اسلام میں رُوحانیت اور مادّیت

سوال : کیا اسلام میں روحانیت و مادیت دونوں برابر ہیں یا روحانیت زیادہ ہے اور مادیت کم؟ پھر کیا رُوح کو دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

جواب : مجھے اس بارے میں ماہر اور متخصص ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔لیکن یہ عرض کروں گا کہ انسان جب رُوح اور جسم دونوں سے بنایا گیا ہے تو ان دونوں پر توجہ کرے کی ضرورت ہے۔جسم کے لیے ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سوتے ہیں، آرام کرتے ہیں، مختلف کام سرانجام دیتے ہیں۔ایک ہماری روح بھی ہے اس کے لیے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے تاکہ اس کی زندگی برقرار رہے۔وہ اُسی طرح زندہ رہے جس طرح ہمارا جسم زندہ رہتا ہے۔لہٰذا قرآن کریم نے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمیں حکم دیا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو۔تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ہی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مادے کا بھی اور روح کا بھی۔ ان میں کیا تناسب ہوگا، میں نہیں جانتا، لیکن میں عرض کروں گا کہ جس طرح چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں یعنی چوبیس منٹ اپنی روح کے لیے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور باقی سارا وقت ہمیں دیا گیا ہے کہ جس طرح چاہو، صرف کرو۔ چاہے محض مادیت کے لیے صرف کرو یا مادیت اور روحانیت دونوں کے لیے۔ یہ انفرادی چیز ہوگی، اور اس کے لیے کوئی حکم یا تعین شریعت کی طرف سے نہیں ہوا۔شریعت کا حکم صرف یہ ہے کہ اپنی روحانی زندگی کے لیے روزانہ مثلاً پانچ وقت نمازیں پڑھو اور بعد میں سارا وقت چوبیس گھنٹے میری مرضی پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ میں ہی انتخاب کروں گا کہ مجھے روحانیت پر توجہ کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے۔ اسی انتخاب کے مطابق میں فائدہ اٹھاؤں گا یا نقصان اٹھاؤں گا۔

(22) اسلام میں موسیقی کی کس حد تک اجازت ہے؟

سوال : آپ نے اپنے لیکچر میں بتایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان سکھائی اور یہ بتایا کہ کن لفظوں کو کھینچ کر ادا کرنا چاہیے اور کن لفظوں کو اختصار سے، اس طرح گویا موسیقی کے سُر بتائے۔ اس بیان کی روشنی میں وضاحت کریں کہ موسیقی کی اسلام میں کس حد تک گنجائش ہے؟

جواب : یہی نہیں، اور بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کی اسلام میں ممانعت بالکل نہیں ہے، اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے یا اس کا منشا ایسی تفریح ہو جو اخلاقی نقطہ نظر سے بُری سمجھی جاتی ہے۔ میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہو گا فی نفسہ موسیقی کی ممانعت نہیں ہے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نکاح کی دعوت ولیمہ سے واپس آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آج میں تمہارے خاندان کے ایک فرد کی شادی میں گیا تھا، مگر وہاں کوئی موسیقی نہیں تھی۔ یہ کیسی بات ہے؟ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نکاح کے سلسلے میں موسیقی کی ضرورت ہے۔ ایک اور مثال دیتا ہوں، یہ حجۃ الوداع کے زمانے کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''منیٰ'' میں مقیم تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ وہاں میرے خیمے کے اندر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے اور چہرے پر چادر ڈال کر آرام فرما رہے تھے، میرے پاس چند لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آئے اور ان لڑکیوں کو ڈانٹا: یہ کیا شیطانی کام ہے، جاؤ یہاں سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو سوئے ہوئے نہیں تھے، سر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ عید کا دن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور عید کے سلسلے میں مدینہ منورہ کا واقعہ ہے غالباً ۲ یا ۳ ھ یعنی بہت ہی ابتدائی زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہا فرماتی ہیں، عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے سامنے کچھ شور سننے میں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے، دیکھا کہ کیا ہے؟ میں بھی اُٹھی تا کہ اس تماشے کو دیکھوں۔ مدینہ منورہ میں حبشیوں کی ایک آبادی تھی۔ عید کے دن یہ لوگ خصوصاً نوجوان حبشی مدینے کی گلیوں میں سے گزرتے اور اپنے نیزہ بازی کے کرتب ہر مکان کے سامنے دکھاتے اور مکان والا یقیناً ان کو کچھ نہ کچھ دیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حبشیوں کو روکا نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو دکھانے کے لیے وہاں بلا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پوچھا، عائشہ! بس دیکھ چکیں؟ میں نے کہا، نہیں ابھی اور دیکھوں گی، ٹھہر جائیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں، بالآخر جب میں خود ہی تھک گئی تو میں اندر چلی گئی۔ ان حبشی بچوں کے بارے میں ایک اور بات یاد آ گئی۔ عرض کیے دیتا ہوں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، لوگ "قبا" میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ روایت یہ ہے کہ مدینے کی ساری آبادی، کیا مسلمان، کیا غیر مسلم، اپنی مہمان نوازی کے اظہار کے لیے استقبال میں شریک تھی۔ یہ حبشی لڑکے بھی دوڑے ہوئے آئے اور اپنی نیزہ بازی کے کرتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دکھانے لگے۔ اس سے ان کی فراخ دلی اور وسیع القلبی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان لوگوں کی تالیف قلبی کیا کرتے تھے اور ان سے محبت سے پیش آتے تھے اور غالباً ان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کے سلسلے میں آپ ایک اور چیز کو بھی دیکھیے۔ قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں کہ قرآن کریم کو معمولی نثری عبارت کی طرح نہ پڑھو بلکہ خوش الحانی سے پڑھو اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے کسی غنا، کسی گانے کی اجازت اتنی نہیں دی ہے جتنی قرآن کو اچھی آواز سے تلاوت کرنے کی اجازت دی۔ ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ خدا کسی گانے کی آواز پر اتنا کان نہیں دھرتا جتنا قرآن مجید کی اچھی آواز کے ساتھ تلاوت کرنے پر اپنے کان لگاتا ہے۔ غرض یہ کہ موسیقی کی کوئی اصولی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ موسیقی کا مقصد اچھا ہو اور اس سے ہماری مذہبی عبادات میں کوئی حرج واقع نہ ہوتا ہو۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" کو دیکھیے اس میں پورا

باب اس موضوع پر ہے۔ وہ تفصیل سے بتاتے ہیں کہ اسلام میں موسیقی اور گانے کی کیا حیثیت ہے۔

(23) مرحوم کی قُل خوانی اور چہلم

سوال : مرحوم کی قُل خوانی اور چہلم کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کیا یہ شرعی حکم ہے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے حوالے سے اس رسم کا کوئی ذکر آیا ہے؟

جواب : میں عرض کروں گا کہ اگر کسی کی وفات کے تیسرے دن، دسویں دن، چالیسویں دن، ہم کچھ کرنا چاہیں تو وہ کام یہ ہونا چاہیے کہ قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا ثواب متوفی شخص کو پہنچانے کی اللہ جل شانہٗ سے دعا کریں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، چاہے ہر روز کریں، چاہے ہر سال، چاہے ابتداً متعدد بار کریں، کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ اور میرے مرنے کے بعد اگر آپ بھی میرے لیے دعا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

(24) مخلوط تعلیم کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال : کیا اسلام میں مخلوط تعلیم کی اجازت ہے، اور اگر ہے تو اسلام کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے؟

جواب : اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ ممکن ہے ان کے بیٹھنے کی جگہ الگ الگ ہو لیکن اُس مقام پر، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرماتے، دونوں کے لیے بیک وقت استفادہ کرنے کا امکان تھا۔ اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ سکول و کالج میں اس طرح کا انتظام کیا جا سکے کہ لڑکے اور لڑکیوں کی نشستیں جدا جدا ہوں تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ خاص طور پر اگر کسی فن کا ماہر صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد ہو تو اس سے دونوں کو استفادہ کرنا

چاہیے، لڑکوں کو بھی لڑکیوں کو بھی۔ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ دونوں کی تعلیم کا بیک وقت انتظام ہو سکے۔ مثلاً فرض کیجیے ایک پرانی کتاب ابوعبید قاسم کی ہے۔ اس کی روایت کرنے والوں کی فہرست میں سب سے نمایاں نام ایک عورت کا ہے۔ وہ اپنے گھر میں اس کا درس دیا کرتی تھی اور درس کو سننے کے لیے مرد بھی آیا کرتے تھے۔ اس کا انتظام کہ مرد اور عورتیں اکٹھے درس میں شریک ہوں، کیسے ہوتا تھا، مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی استاد سے مرد اور عورت دونوں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کا یہ فرمان کہ جب تم ازواج مطہرات سے کوئی چیز پوچھنا چاہو تو پردے کے پیچھے سے پوچھو۔ ظاہر ہے کہ پردے کے پیچھے سے سوال کرنے کی ضرورت صرف مردوں کو پیش آ سکتی تھی، خواتین کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ ان مختلف پہلوؤں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضرورت اور حالات پر منحصر ہے کہ اگر دونوں کے لیے الگ الگ مدرسے اور کالج بن سکتے ہیں تو بہت بہتر ورنہ پھر تعلیم کا انتظام ایک ہی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔

(25) ستاروں کا اثر انسان کی زندگی پر؟

سوال : علم فلکیات والے کہتے ہیں کہ ستاروں کا اثر انسان کی عملی زندگی پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان ہوتے ہوئے ہمیں نجومیوں کی باتوں پر کہاں تک یقین کرنا چاہیے؟ اور اس طرح ہاتھوں اور زیورات میں استعمال ہونے والے پتھروں کے بارے میں بھی مہربانی کر کے وضاحت فرمائیں۔

جواب : اسٹرانومی اور اسٹرالوجی میں فرق کیجیے۔ اسٹرانومی بہت اچھی چیز ہے۔ اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور اسٹرالوجی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اعتماد کی چیز نہیں ہے۔ کبھی کبھی اسٹرالوجی کے ماہر کچی بات ضرور کہہ دیتے ہیں لیکن وہ عام طور پر ایک من گھڑت چیز ہوتی ہے۔ خیال فرمائیے کہ یہ نجومی مجھ سے میری مستقبل کی زندگی ضرور بیان کرتے ہیں لیکن خود اپنی زندگی کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے تمام عمر مفلس ہی رہتے ہیں اور بھیک کی طرح لوگوں سے کچھ پیسے مانگتے

ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ ان کی ان باتوں پر یقین نہ کریں جو ہمارے سامنے ہمارے متعلق بیان کرتے ہیں، البتہ ان پر صرف دل بہلانے کی حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ ستاروں کا اثر انسانی زندگی پر ہوتا ہے، ممکن ہے ایسا ہوتا ہو کیونکہ ہمیں بعض اوقات مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ایسی نظر نہ آنے والی چیزوں پر ایمان لائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ستاروں کے اثرات ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ بعض اوقات غیر مرئی اشیاء کو ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں تا کہ میرا منشا واضح ہو۔ چند مہینے کی بات ہے کہ ایک عیسائی انجمن نے پیرس میں مجھے ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی اور وہاں پر ایک فرانسیسی عیسائی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ آج کل مسلمانوں کے ہاں دینی عبادات کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے پیرس کے مسلمان نماز روزے پر کم توجہ دیتے تھے اب ان میں روز افزوں شوق نظر آتا ہے۔ اس نے کہا ہمارے ہاں بھی یہی حال ہے۔ پہلے گرجے خالی رہتے تھے، اب گرجے میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کی کیا توجیہ کریں گے؟ اسے سوائے ستاروں وغیرہ کی گردش کے اثر کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں اسے اللہ کا فضل قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر ہم اپنے فرائض و واجبات سے غافل ہوں تو اسے اللہ کا غضب کہا جا سکتا ہے۔

(26) کیا نماز پڑھتے وقت سر پر کپڑا لینا ضروری ہے؟

سوال : نماز پڑھتے وقت سر پر کپڑا لینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نماز سر ڈھانپے بغیر پڑھی جائے، جبکہ کپڑا موجود ہو تو کیا حکم ہے؟ دلیل دیں۔

جواب : اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک عورتوں کے متعلق اور دوسرا مردوں کے متعلق ہے، عورتوں کے لیے صراحت سے حکم ملتا ہے کہ وہ اپنے سر کو بھی ڈھانپیں اور بالوں کو بھی چھپائیں۔ لہٰذا اُن کی حد تک ننگے سر نماز پڑھنا عام حالات میں مناسب نہیں ہوگا، بجز اس کے کہ کوئی خاص حالت پیش آئے، مثلاً عورت کے پاس کپڑے نہیں اور وہ تنہا ہے تو یہ اُس کی مجبوری ہے، خدا اُسے معاف کرے گا۔ مرد کے متعلق سر ڈھانپنا ضروری نہیں ہے۔ میں ضروری نہیں کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ کپڑے پہنے تو بہت اچھا ہے، نہ پہنے تو کسی کو کافر

کہنے کا حق نہیں۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں آیا ہے۔ ایک صحابی تھے سعد بن معاذ یا کوئی اور، نام اس وقت یاد نہیں۔ ان کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد، خلافت کے زمانے میں ایک دن ان کو کچھ لوگوں نے بہت ادب سے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہی نماز پڑھائیے، ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً اس سے کچھ پہلے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ بہرحال ان صحابی نے نماز پڑھانا قبول کیا۔ نماز سے قبل انہوں نے سجادہ کی طرف جاتے ہوئے پہلے عمامہ اتارا پھر کوٹ اتار پھینکا اور پھر قمیص بھی اتار دی۔ صرف تہہ بند کے ساتھ آگے آئے اور آگے بڑھ کر نماز شروع کی۔ لوگ حیران ہوئے۔ اس پر انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ بخاری میں ان الفاظ میں آیا ہے، کہ تجھ جیسے احمق کو بتانے کیلیے میں نے عمداً ایسا کیا ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمہارے خیال میں ہمارے پاس دو دو کپڑے ہوتے تھے؟ اُس وقت ہم ننگے سر ہی نماز پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کا ڈھانپنا بے شک اچھا ہے، ادب کا تقاضا ہے، اور اس آیت شریف کے مطابق ہے کہ جب نماز کے لیے جاؤ تو زینت کے ساتھ جاؤ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اگر بغیر سر ڈھانپے نماز پڑھنا چاہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ اصل چیز دل کا خشوع وخضوع ہے نہ کہ ظاہری ہیئت۔

(27) قانون سازی، اجماع اور نفاذ

سوال : اگر قانون سازی ایک نجی مسئلہ ہے تو پھر اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کیا طریقہ کار ہو، وضاحت فرمایئے۔ اور قانون سازی کون لوگ کریں گے؟ اور اجماع کے بعد اس کے نفاذ کا کیا طریقہ ہوگا؟

جواب : ہماری روایت یہ رہی ہے کہ قانون سازی سرکاری مسئلہ نہ ہو، حکومت یا پارلیمنٹ کا مسئلہ نہ ہو، بلکہ ہر فقیہ کو کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنے کی آزادی رہے۔ اس کے باوجود کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت ہی نادر صورتوں میں ہمارے

خلفاء نے بعض احکام دیے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احکامات صادر کیے کہ مفتوحہ ممالک کو پوری ملت کے لیے اور ہمیشہ کے لیے مال غنیمت سمجھا جائے، یا وقف قرار دیا جائے۔ اس طرح کے شاذ و نادر احکام حکومت کی طرف سے بے شک صادر و نافذ ہوتے رہے۔ لیکن عام قانون سازی کا کام ہمارے فقہا انفرادی طور پر کرتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مساوی رتبے کا کوئی فرد رائے دیتا ہے تو میرے لیے یہ جسارت اور جرأت کرنا ممکن ہے، کہ اس پر تنقید کروں اور اس کے خلاف رائے دوں۔ اس کے برخلاف اگر حکومت کا فیصلہ ہو تو ظاہر ہے کہ مجھے تذبذب ہوگا اور بعض وقت یہ مشکل ہوگا کہ کسی جابر حاکم کے زمانے میں اُس کے فیصلے کے خلاف زبان کھولوں۔ طریقہ کیا ہوگا؟ وہ بیان کر چکا ہوں۔ ہر فقیہ اپنی رائے اور اُس کے نفاذ کی صورت بتاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ہمارے قاضیوں کو آزادی ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ اگر قرآن و حدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو فقہا کی رائے میں سے کسی رائے کا انتخاب کریں۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ہو تو بطور خود اجتہاد کریں اور فیصلے صادر کریں۔ اس طرح عملاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ قانون کے نفاذ کا کیا طریقہ ہوگا؟ ہمارے افسران عدالت، حکام عدالت اپنی صوابدید پر فیصلہ کیا کرتے تھے۔ آیا اب یہ مناسب ہے یا نامناسب؟ اس کے بارے میں میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارا قانون اُس زمانے کے مقابلے میں، جب امام ابو حنیفہ نے ایک اکیڈمی بنا کر اسلامی قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی تھی، فقہی مذاہب کے ذریعے بہت زیادہ معین ہو چکا ہے۔ مثلاً حنفی قانون کیا ہے؟ ''ھدایہ''، ''قدوری''، ''مبسوط'' نامی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں کہیں کہیں جزوی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اور اس کی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس ملک کا حاکم جس مذہب کا ہو، حنفی، شافعی یا مالکی، وہ اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے کہ اس ملک کے سارے قاضی مثلاً حنفی قانون کے مطابق عمل کریں گے، چاہے اُن کا اپنا مذہب کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے عباسی خلافت کے قاضیوں کے پاس یہ احکام بھیجے تھے کہ وہ حنفی مذہب کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ چنانچہ یاقوت لکھتا ہے کہ بعض لوگ جو معتزلی یا غیر حنفی تھے، وہ بھی احکام سلطانی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

(28) وکیل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال : اسلامی نقطۂ نظر سے وکیل کی وضاحت کیجیے۔

جواب : عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آج کل کی طرح وکیل نہیں پائے جاتے تھے، لیکن مجھے قرآن مجید میں اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے۔ایک آیت ہے کہ قیامت کے دن کافروں کی طرف سے اللہ جل شانہٗ سے کون جھگڑا کرے گا۔تو آج کل کے وکیل کو میں اصولاً اور اساساً ممنوع نہیں قرار دیتا۔کیونکہ عام کلیہ و قاعدہ ہے جس کا اس آیت میں اشارہ ہے۔"و أحل لکم ما وراء ذالکم ....." (۴:۲۴) یعنی پہلے چند چیزیں بتائی گئی ہیں کہ یہ حرام ہیں۔پھر اس کے بعد، اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔فرض کیجیے کہ وکیل کی ممانعت نہ ہو تو ہمارے لیے جائز ہو جائے گا، چاہے وہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں غیر موجود ہو۔

(29) زکوٰۃ اور عُشر کی موجودگی میں دوسرے ٹیکس کیوں؟

سوال : زکوٰۃ اور عُشر کی موجودگی میں دیگر درجنوں ٹیکسوں کو، بالخصوص دیہی علاقوں پر تھوپ دینا، کہاں تک اور کیونکر جائز ہے؟ مفصل وضاحت کریں۔

جواب : اگر ملک کی ضرورتیں زکوٰۃ اور عُشر سے پوری نہیں ہوتیں تو اپنی مدد آپ کے تحت، دین کی حفاظت کے لیے زائد رقم دینا پڑے گی۔ورنہ وہ خودکشی ہوگی۔اور اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے "و لاتلقوا بایدیکم الی التھلکه" [اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو]۔

(30) اسلام اور جدید جمہوریت

سوال : کیا اسلام میں موجودہ دور کے الیکشن یعنی جمہوریت کا تصور موجود ہے، جس میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے؟

جواب : اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس چیز کی ممانعت نہ ہو، وہ عام طور پر حلال اور جائز ہوتی ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لوگوں کو گنا نہیں جاتا تھا۔ یہ صحیح ہے لیکن اگر ہم گنیں تو اس کی ممانعت بھی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں ملتی۔ اچھے لوگوں کا انتخاب کرنا آپ کے بس میں ہے۔ محض لفاظی کرنے والے ایسے شخص کو، جس کا کردار ٹھیک نہیں ہے، اگر آپ پارلیمنٹ کا ممبر بنائیں تو اس شخص کا اتنا قصور نہیں ہوگا جتنا کہ آپ کا اپنا قصور ہوگا۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض پر غور کریں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دیں، جو آپ کی رائے میں اچھے کردار کے مالک ہوں۔ ملک کی صحیح خدمت کر سکتے ہوں۔ اور آپ کے جذبات کی بھی اچھی ترجمانی کر سکتے ہوں۔

(31) انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال : انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب : غالباً یہ سوال اس سلسلے میں کیا گیا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو اور محمد رسول اللہؐ کا لفظ مؤذن دہراتا ہے تو بعض لوگ اپنے انگوٹھے کے ناخن چوم کر آنکھوں پر ملتے ہیں۔ اس بارے میں شخصی طور پر ابھی کسی تلاش کا موقع ملا نہیں لیکن میرے اپنے ایک اُستاد جو بہت فاضل شخص تھے، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بارے میں حدیثیں ملتی ہیں، تو میں نے اس پر اکتفا کیا۔ اور اس میں مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ آدمی کو کسی سے عشق ہو تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا، وہ ایک انفرادی قانون ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی محبت کا اظہار کسی کے سر کو چومنے سے کرتا ہے، کوئی اُس کے ہاتھ کو چومنے سے اور کوئی قدموں کو چومنے سے کرتا ہے۔ یہ ہر شخص کی انفرادی چیز ہے، اور میری رائے میں ان انفرادی معاملات میں ہمیں دخل نہیں دینا چاہیے۔

(32) رفع الیدین: جائز ہے یا نہیں؟

سوال : رفع الیدین جائز ہے یا نہیں؟

جواب : اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس بارے میں ائمہ میں اختلاف رائے ہے، جس کی اساس یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یوں فرمایا اور کبھی یوں فرمایا، لہٰذا دونوں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اپنے بچپن کا ایک واقعہ، کہ میں چھ سات برس کا تھا، صدر مدرس ہماری کلاس میں آئے اور یہ معلوم کیا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان، شیعہ ہے یا سنی، حنفی ہے یا شافعی وغیرہ تو وہ ہم مسلمان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ بچو، مذہب کے فرق کی بنا پر آپس میں کبھی نہ جھگڑو۔ ہر مذہب کا شخص اپنے امام کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور انہوں نے ایک جملہ کہا جو میں باوجود ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے کبھی نہیں بھول سکا جملہ یہ کہ اللہ کو اپنے حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت تھی کہ ان کی ہر حرکت کو قیامت تک باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک حرکت پر سب مسلمان عمل کریں تو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حرکت غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا خدا جل شانہٗ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حرکت کو محفوظ کرنے کے لیے مختلف ائمہ، مختلف مذاہب کے ذریعے سے اس کی بقا کا انتظام کیا۔ کبھی یہ نہ سمجھنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہے۔ وہ بھی اللہ جل شانہٗ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکت ہے اور یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکت ہے۔

(33) کیا علماً کو ہدیہ دینا جائز ہے؟

سوال : کیا علماً کو ہدیہ دینا جائز ہے، اگر امداد کے طور پر دینا چاہیں؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب : لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر مجھے دیا جائے تو میں رد کر دیتا ہوں،

چاہے کتنی ہی محبت سے کوئی پیش کرے۔ کوئی عالم اسے قبول کرنا چاہے تو میں اُسے روکتا نہیں۔ عام اصول، بطور سفارش کے کہیے یا بطور تاکید کے، ایک حدیث شریف میں مذکور ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں سے کوئی چیز نہیں لینی چاہیے۔ اور اس سلسلے میں ایک سخت لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ایک شاگرد نے، جسے میں نے قرآن کی تعلیم دی تھی، ایک کمان یہ کہہ کر ہدیہ کی ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا، یہ کمان جہنم کی آگ کی ہے۔ تو وہ دوڑے ہوئے گئے اور کمان اپنے شاگرد کو واپس کر دی۔ علماء کو ہدیہ دینا نیت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کا منشاء زکوٰۃ کی رقم میں سے بطور خیرات کے اپنے استاد کو دینا ہو تو اگر وہ استاد خاندان بنی ہاشم سے تعلق رکھتا ہوگا تو ہماری فقہ کے مطابق یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر وہ غریب ہے تو وہ لے سکتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی خاص چیز بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

(34) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت

سوال : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کی ذرا وضاحت کیجیے۔ کیا آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی سیّد زادوں کو اہلِ بیت قرار دے سکتے ہیں؟

جواب : میری رائے میں قرار دینا پڑے گا۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اولاد ہے بلکہ پورے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب بھی۔

اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو بڑے تھے اور وہ لوگ جو بچے تھے، سب اس میں داخل ہوں گے۔ ان کے بعد آنے والے بچے بھی اس میں داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی زمانے میں اہل بیت (سید زادوں) کے لیے کوئی ذریعۂ معاش بالکل موجود نہ ہو اور حکومت بھی ان کی ضروریات کو پورا کرنے سے، عمداً یا سہواً یا عدم امکان کی وجہ سے، غافل ہو تو ان کو خیرات دے سکتے ہیں۔

(35) کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟

سوال : کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا سربراہِ مملکت اس کی شرح میں تبدیلی کا مجاز ہے؟

جواب : میں ٹیکس کا لفظ اپنی تقریر میں خود استعمال کر چکا ہوں اور کہہ چکا ہوں کہ اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانے میں، ایک معینہ شرح سے، ایک معینہ چیز پر، ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں، تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی میں نے بیان کیا کہ زکوٰۃ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں زکوٰۃ ایک اختیاری چیز تھی یعنی خیرات کی طرح تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ قرآن مجید نے اس کو ایک فریضہ قرار دیا۔ اس کا زمانہ مقرر کیا، اس کی شرح مقرر کی اور اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت بتاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا جائے تو تلوار کے ذریعے اسے وصول کیا جائے گا۔ یہی ٹیکس کے عناصر ہیں۔ ان حالات میں اگر زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا جائے تو وہ غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ ٹیکس ایک برا لفظ ہے۔ کسی کو ٹیکس کرنے کے معنی اس کو تکلیف دینے کے ہوتے ہیں، اسی لیے ہم نے ایک بہتر لفظ ''زکوٰۃ'' اختیار کیا ہے جس کے معنی ہیں ''پاک کرنا''۔ میرے مال میں خدا جل شانہٗ کے حکم کے مطابق لوگوں کا جو حصہ ہے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ صرف لفظ کا فرق ہے، جب کہ معنی کی حد تک دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی شرح میں تبدیلی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے فقہا کی یہ رائے ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی شرح کو نہ بدلا جائے اور عصری ضرورتوں کے لیے ''نوائب'' کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جائیں، تو اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا قانون جو کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا نام ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو کوئی اختیار نہیں اور نہ ہی آج تک ایسی صورت پیش آئی ہے اور غالباً آئے گی بھی نہیں کہ ہماری حکومت یہ قرار دے کہ زکوٰۃ ایک گراں ٹیکس ہے، اس کی ضرورت اب نہیں رہی، اسے اب کم کیا جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہماری حاجات ہوتی ہیں، لہٰذا ''نوائب'' کے

نام سے مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ قیامت کے قریب مسلمانوں میں دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ لوگ مستحقینِ زکوٰۃ کی تلاش کریں گے، لیکن انہیں کوئی ملے گا نہیں۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے جو ممکن ہے پوری ہو جائے۔ اس صورت میں زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی، کیونکہ کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔

(35) اسلام اور عیسائیت کے پیروکاروں کی تعداد

سوال : آپ کے بیان کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کا تناسب حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیروکاروں سے کافی زیادہ تھا۔ کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور میں وہ تناسب نہیں ہے؟

جواب : اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک جواب قدرت کے متعلق ہے، اور دوسرا جواب خود آپ کے ہمارے متعلق ہے۔ قدرت کے متعلق میں اس لیے کہتا ہوں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری تک چھ سو سال کا وقفہ ہے۔ لہٰذا عیسائیوں کو ہم پر چھ سو سال کی سبقت حاصل ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ چھ سو سال کے بعد ہماری حالت وہ نہیں رہے گی جو آج ہے۔ یہ قدرتی صورت حال ہے۔ جو اس کی توجیہ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ لیکن گستاخی معاف ہو، اگر میں یہ کہوں کہ اس سے زیادہ یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ کیا ہم اپنے اطراف نہیں دیکھتے کہ عیسائی مشنری کس تندہی، کس جوش وخروش اور کس خلوص کے ساتھ اپنا دین پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر خطے میں جاتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی سردیوں اور خط استوا کی گرمیوں میں بھی جھلتے ہیں اور اپنا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے سبق آموز چیز ہے۔ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں، ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتے۔ پھر ہم اس بات کی کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری تعداد عیسائیوں کی تعداد سے زیادہ ہو۔ اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان درست نہیں ہے کہ موجودہ دور میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔

(37) مسلمانوں میں تبلیغ کی ضرورت

سوال : آج کل کے حالات میں تبلیغ کی ضرورت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں میں کرنے کی ہے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وضاحت فرمایئے۔

جواب : مجھے اس سے اتفاق ہے بھی اور نہیں بھی۔ اتفاق اس معنی میں ہے کہ اگر مسلمانوں کا کردار اچھا ہو اس کردار کا اثر دیکھنے والے غیر مسلموں پر پڑتا ہے۔ لیکن اختلاف بھی ہے اور وہ اس معنی میں کہ اگر ہم انتظار کریں کہ سارے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں، اس کے بعد ہم تبلیغ کریں تو یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ دونوں کام بیک وقت جاری رہیں۔ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے بھی کام کریں اور غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے کی بھی کوشش کریں۔

(38) مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟

سوال : غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟ لَا اِکراہَ فِی الدِین (۲:۲۵۶) کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟

جواب : اس بارے میں میرا شخصی ردِ عمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں، اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور Islamic Community کے اندر آنے پر جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔

(39) تبلیغی جماعت کی کارکردگی کے نتائج

سوال : غیر ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکا میں تبلیغی جماعت کی تبلیغ کے کیا نتائج مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس جماعت کی کارکردگی کافی مؤثر ہو رہی ہے۔ اگر نہیں ہے تو کیوں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب : مجھے اور ممالک کا علم نہیں لیکن شہر پیرس کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ بیس سال سے یہ جماعتیں وہاں آنے لگی ہیں اور میں نے اس کے اچھے نتائج دیکھے ہیں۔ اب سے بیس سال پہلے پیرس شہر کے مسلمانوں میں اگر نماز پڑھنے والوں کی تعداد ہزار میں ایک تھی تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں تو سو میں سے پچاس ہو گئی ہے۔ یعنی پچاس فیصد لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ یہ تبلیغی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۴ء سے پیرس میں ایک بہت عظیم الشان مسجد ہے لیکن اب گزشتہ بارہ سال سے یہ مسجد ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ شہر میں روز بروز نئی مسجدیں یا بننے لگی ہیں یا کوئی عمارت کرائے پر لے کر اس سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے، یا خود عیسائیوں کی طرف سے فروخت کیے جانے والے گرجاؤں کو خرید کر مسجدوں میں بدلا جا رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت میرے علم میں شہر پیرس اور اس کے مضافات میں اسی (۸۰) سے زائد مسجدیں ہیں۔

(40) فنون لطیفہ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال : فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری اور رقص وغیرہ کے سلسلے میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ کیا یہ چیزیں بالکل حرام ہیں اور اگر حلال ہیں تو کس حد تک؟

جواب : فنون لطیفہ کے متعلق یہاں کچھ مثالیں دی گئی ہیں۔ میں بطور عمومی کہوں گا کہ قرآن مجید کے مطابق خود اللہ تعالیٰ نے زینت کے طور پر مثلاً ستارے وغیرہ پیدا کیے ہیں تو وہ بھی ایک طرح سے فنون لطف۔ ہی ہے۔ بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ موسیقی کے متعلق امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک باب تفصیل سے لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ سو فیصد (موسیقی)

حرام نہیں ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لوگ عید کے دن ڈھول بجاتے تھے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حبشی بچوں کا ایک گروہ آیا اور نیزے چلانے کے کرتبوں کے ذریعے سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ڈانٹا، جاؤ یہاں سے نکلو، کیا کررہے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں "یا عمر هذا عید" - آج عید کا دن ہے، لہٰذا عید کے دن خوشی منانے کے جو طریقے ہیں، وہ موجود ہیں یا ذہن میں آتے ہیں اُن سے روکا نہیں جاسکتا۔

مصوری کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ صحیح بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، قیامت کے دن سب سے شدید عذاب مصوروں کو ہوگا، اس کی تصریح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اس سے مراد ان چیزوں کی تصویر ہے جن میں جان ہوتی ہے، جیسے آدمی اور حیوانات وغیرہ۔ باقی درختوں، مکانوں اور اسی طرح کی چیزوں کی تصویروں کی کوئی ممانعت نہیں ہے، تو عرض یہ ہے کہ آج ہم مصوری سے مراد صرف آدمیوں کے پورٹریٹ بنانے کو لیں تو میرے نزدیک ناجائز ہوگا، لیکن عام تصویر، رنگوں کے ذریعے سے شکلیں بنائیں اور وہ آدمیوں کی نہیں بلکہ چیزوں کی ہوں تو اس میں کوئی عمل مجھے مانع نظر نہیں آتا۔

رقص کے متعلق بھی سوال کیا گیا ہے، ۱۹۴۸ء کی شاید بات ہے، آپ کے ہاں دستور بنانے کا کام شروع ہوا تھا، مجھے بھی اُس زمانے میں دعوت دی گئی تھی، اس میں ایک بنگالی عالم بھی شریک تھے، اُن لوگوں نے یہ کہا کہ رقص حرام ہے۔ لطیفے کے طور پر میں نے عرض کیا کہ بھائی صاحب! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں رقص کرتا ہوں تو تمہیں روکنے کا کیا حق ہے۔ کہنے لگے کہاں؟ میں نے کہا گھر میں، پوچھنے لگے لوگوں کی موجودگی میں؟ میں نے کہا بچے ہوں گے، بچے بھی خوشی سے ہاتھ بجائیں گے کہ اماں جان ناچ رہی ہے۔ تو غرضیکہ سو فی صدی رقص حرام نہیں ہے، البتہ اجنبی عورت سے یقیناً حرام ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کے مکاتیبِ گرامی

بنام

محمد عالم مختار حق

پاریس ۲۹ شوال ۱۴۰۷ھ   ۸۷ء

محترمی

سلام مسنون۔ عنایت نامہ کا شکریہ۔ سوال یہ کہ ہر چیز ضروری ہے کہ جدید اور قدیم ایڈیشن کا مقابلہ کرانے پر آپ کو خود یہ جواب مل جاتا۔ نئے غلط لکھے ہوئے ملے ہیں۔ دیباچے میں نئے معلومات بھی بہ کثرت ہر جا سے لگے ہیں۔

کتاب محمد رسول اللہ کے متعلق ہمیشہ نے عرض کیا تھا کہ اس کا ترجمہ مجھے بتائے بغیر سے لیا گیا اور کافی غلطیاں ہوئی ہیں۔

سیرت ابن اسحاق پہلے مراکش (رباط) میں چھپی۔ پھر دوسرا ایڈیشن ترکی میں نکلا ہے جس کا پتہ یہ ہے:

Hayra Hizmet Vakfı
Neşriyat Müdürlüğü
Aziziye Cami Yanı No. 42
Konya / Turkey

والسلام
محمد حمید اللہ

اگست ۱۹۹۸ء کی کسی تاریخ کو (حتمی طور پر تو یاد نہیں البتہ یہ ماہ اگست ۱۹۹۸ء کی کوئی تاریخ تھی) جب پاکستان کے بعض اخبارات میں عالمِ اسلام کے بطلِ جلیل، عالم بے عدیل اور محققِ بے مثیل پروفیسر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے انتقال کی بے بنیاد خبر چھپ گئی تھی جس نے گزشتہ برس (2002ء) ماہ دسمبر کی 18 تاریخ کو حقیقت کا رُوپ دھار لیا اور ڈاکٹر صاحب کی روح فلاڈلفیا (امریکہ) کے مقام جیکسن ول (Jackson Vill) پر اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ رجعون۔

سالہا زمزمہ پرداز جہاں خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است

عالمِ اسلام کی گزشتہ صدی ایسی نابغۂ روزگار ہستی کے وجودِ باجود کی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بلا ریب و تردد اس صدی کو اگر حمید اللہ صدی سے منسوب کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

موصوف نے اشاعت اسلام کے حوالے سے سینکڑوں مقالات اور 150 کے قریب کتابیں تصنیف کیں جن میں بیشتر فرانسیسی زبان میں ہیں۔ بہت سی کتابوں کے تراجم دیگر زبانوں میں بھی ہوے۔ اردو میں ان کی تصانیف کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہوگی۔ ان کی حیات و کارناموں کو احاطۂ تحریر میں لانے کے لیے تو ایک الگ صحبت درکار ہے میں سرِ دست اس مقام پر ان کے مکاتیب گرامی کے حوالے سے گفتگو کروں گا جو موصوف نے راقم کے قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر اور سیرۃ کے متعلق استفسارات کے جواب میں حوالۂ قلم و قرطاس کیے۔ تو آیئے سب سے پہلے آپ کو ان کے اسلوبِ تحریر کے محاسن سے آگاہ کروں جو راقم نے ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے اخذ کیے۔

۱۔ افہام و تفہیم کا دل نشیں اور سلجھا ہوا انداز۔

۲۔ ثقیل الفاظ لکھ کر اپنی علمیت اور ہمہ دانی کا رعب نہیں جماتے۔

۳۔ اسلوبِ بیان نہایت سادہ اور سہل۔

۴۔ چھوٹے چھوٹے فقرے۔ طویل فقرات سے کلی اجتناب۔

۵۔ درست الفاظ کا درست استعمال جیسے ان شاء اللہ وغیرہ۔

۶۔ آیات قرآنیہ اور عربی محاورات کا برمحل استعمال جو اکثر دعائیہ کلمات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۷۔ اُز دل خیزد بر دلی ریزد کی عمدہ مثال۔

۸۔ خط نہایت پاکیزہ، قلم باریک، الفاظ کی بندش ایسی جیسے سلکِ مروارید میں موتی پرو دیے ہوں۔

۹۔ تحریر میں طالب علمانہ انکسار۔

۱۰۔ اکثر خطوط میں انگریزی کے بجائے قمری ماہ و سال کی تاریخ کا اہتمام جو ان کی اسلام سے پختہ وابستگی کی دلیل ہے۔

فلک عشرۃ کاملہ،

خوانندگانِ گرامی اب مطالعہ فرمایئے موصوف کے مکاتیب گرامی راقم الحروف کی توضیحات کے ساتھ۔

محمد عالم مختار حق

۸-۲-۲۰۰۳

﴿ ۱ ﴾

بسم اللّٰہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۵رشعبان ۱۳۸۷ھ

محترمی سلام مسنون۔

عنایت نامہ ملا۔ مندرجات سے دلی مسرت ہوئی۔ بارک اللّٰہ فی مساعیکم۔ آپ کا مضمون کس رسالے (۱) کو گیا ہے اور اس کے کس نمبر میں چھپنے کی توقع ہے؟ معلوم ہو سکے تو باعث منت ہوگا۔

میری کتاب ''القرآن فی کل لسان Quran in Every Language'' کی طباعت سوم حیدر آباد دکن میں ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔ ناشر عالمگیر تحریک قرآن مجید۔ اگر میرے پاس کوئی زائد نسخہ ہوتا تو ضرور آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ مجبور ہوں۔ میں اپنی حقیر کتاب کو طباعت چہارم (۲) کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے آئندہ سال تک فارغ ہو سکوں واللّٰہ المستعان۔ اس میں ہر زبان کا سورۂ فاتحہ بطور نمونہ بھی درج ہے۔ سو سے زیادہ زبانوں میں اب کلام پاک ملتا ہے۔ آج کل یہی کام کر رہا ہوں۔ آپ کی فہرست اثر انداز ہے جزاکم اللّٰہ۔

ہندوستان میں تازہ شائع شدہ کتاب کا مجھے بھی کوئی علم نہیں۔ لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امراً (۳)

خادم

محمد حمید اللّٰہ

﴿ ۲ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۳ رشوال ۱۳۸۷ھ

سلام مسنون۔

عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوا کہ میری کوتاہی پر توجہ دلائی گئی۔

میں نے آپ کا سابقہ عنایت نامہ ملنے پر جلدی میں پڑھا اور یہ محسوس کر کے کہ اس میں کوئی جواب طلب امر نہیں ہے، قرآنی تراجم کے فائل میں ڈال دیا۔ اگر آپ کے خط کی میں رسید دوں، اور میرے خط کی آپ رسید دیں تو یہ سلسلہ ایک دور لامتناہی ہو جائیگا۔

اب مکرر آپ کے خط کو پڑھا تو اس میں میرزا ابوالفضل (۴) کے اصل نام کی دریافت کے سوا اب بھی کوئی جواب طلب امر نہ ملا۔ میرزا صاحب مرحوم کے اصل نام سے میں واقف نہیں۔ وہ بنگالی تھے۔ خیال پڑتا ہے کہ پچیس سال قبل ایک بار چند منٹ کے لیے ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا افسوس ہے مزید کسی چیز سے واقف نہیں۔ کسی سے سنا ہے کہ یہ ان کا فرضی نام تھا مگر تحقیق نہیں۔

آپ نے اپنے بیش قیمت مقالے کو ہوائی ڈاک سے بھیجنے کی بے وجہ زحمت گوارا فرمائی ہے۔ اس کی کوئی جلدی نہ تھی۔ سمندری جہاز سے بھی آ سکتا تھا۔ جیسے ہی آئے، ان شاء اللہ (۵) اپنی فہرست سے مقابلہ کر کے کوئی زائد چیز میرے پاس ہو تو ضرور آپ کی خدمت میں گزرانونگا۔

آپ کی نوازش پر سوائے اس کے کیا عرض کروں کہ خدا سعی مشکور کرے اور حسنات دارین سے سرفراز فرمائے۔

خادم

محمد حمید اللہ

﴿۳﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۴رشوال ۱۳۸۷ھ

محترمی زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مرسلہ پیش خدمت ہدیہ، "فیض الاسلام" کا قرآن کریم نمبر پہنچ گیا۔ دلی شکریہ۔ والاجر علی اللہ۔ جب آپ اسے کتابی صورت میں چھاپیں گے تو غالباً اس میں فہرست مصادر و مآخذ معلومات بھی ہو گی۔

اچھا ہوتا اگر ساری گمنام مؤلفوں کی تالیفیں یکجا ہوتیں۔ کہیں آپ نے مطبع کے تحت دیا ہے کہیں حرف یاء کے بعد۔ ایک ہی مؤلف کے نئے اڈیشن کو آپ نے نیا نمبر دیا ہے جو شاید درست نہیں۔

آپ کی فہرست میں میرے لیے بعض نام نئے ہیں۔ میری فہرست میں جو نام زائد ملے ہیں وہ درج کرتا ہوں (۶) مجھ سے سہو بیان ممکن ہے۔ اصلاح فرمائیں تو نوازش ہے۔

(۱) نامعلوم الاسم مخطوطہ مملوکہ، پروفیسر آغا حیدر حسن، نظام کالج حیدر آباد دکن۔ کئی سو سال پہلے کا مخطوطہ۔

(۲) محمد باقر فضل اللہ خیر آبادی۔ مخطوطہ آغا حیدر حسن، موقوفہ ۱۱۱۵ھ

(۳) امانت اللہ و میرزا کاظم علی جوان مشترکہ تالیف ۱۲۱۷ھ تا ۱۹ھ بحوالہ گارسین دتاسی

(۴) سید بہادر علی۔ بحوالہ رسالہ ژورنال دے ساواں پارس ۱۸۳۴ء

(۵) نامعلوم الاسم مطبوعہ ۸۰۰ صفحات کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن

(۶) منظوم از اشرف

(۷) از عماد علی (شیعہ) بحوالہ گارسین دتاسی مقالہ ۱۸۵۴ء

(۸) از محمد سلیم

(۹) گمنام۔ ترجمہ مع تفسیر خلاصہ المنہج اکبر آباد ۱۳۱۲ھ
(۱۰) گمنام۔ مطبع محبوب علی ۱۲۷۱ھ
(۱۱) گمنام۔ وقف کردہ زمانی بیگم شیریں مطبع خزینۃ الورد لکھنو ۱۲۹۱ھ
(۱۲) نواب نانپارہ مصدقہ تاج العلماء، قرآن شریف مذکورہ فہرست سید واحد حسین تاجر کتب لکھنو ۱۹۱۶ء
(۱۳) مولانا محمد علی۔ "ترجمہ قرآن" طبع لکھنو
(۱۴) ابو محمد ابراہیم بن الحکیم الحاج عبد العلی۔ "تفسیر خلیلی مع ترجمہ" دو جلد مطبع خلیلی ارّہ ۱۸۸۹ء (بحوالہ فہرست برٹش میوزیم)
(۱۵) نبی بخش حلوائی۔ "تفسیر نبوی" اردو + پنجابی منظوم لاہور ۱۹۰۲ء بحوالہ فہرست برٹش میوزیم
(۱۶) محمد عبد المجید۔ تیسیر البیان فی ترجمۃ القرآن دہلی ۱۹۱۳ء (برٹش میوزیم)
(۱۷) گمنام۔ (میرزا ابوالفضل بنگالی) الہ آباد ۱۹۱۳ء ترجمہ بلا متن
(۱۸) میر محمد سعید قادری حنفی احمدی۔ "تفسیر احمد واضح البیان" لاہور ۱۹۱۸ء
(۱۹) محمد علی لاہوری (احمدی)۔ بیان القرآن ۲ جلد، لاہور ۱۳۴۰ھ تا ۴۲
(۲۰) محمد حسن خان۔ بستان التفاسیر ۲ جلد، ۹۶۵ صفحے ۱۲۷۸ھ
(۲۱) غلام محمد غوث۔ تفسیر عمدۃ البیان۔ لکھنو ۲۸۴ صفحے
(۲۲) عبد الرؤف۔ تفسیر رؤفی لکھنو ۱۲۷۲ھ، ۱۳۰۵ھ
(۲۳) خلیفہ محمد حسن خاں۔ اعجاز التنزیل آگرہ۔ ۵۰۸ صفحے
(۲۴) مصطفیٰ بن محمد سعید۔ القرآن المترجم مع تفسیر الحسینی وانڈکس نجوم القرآن ۱۲۶۶ صفحے آگرہ ۱۳۰۸ھ (بحوالہ برٹش میوزیم)
(۲۵) گمنام۔ قرآن مجید مترجم مع منافع فضائل وخواص۔ آگرہ ۱۳۱۴ھ (برٹش میوزیم)
(۲۶) گمنام۔ قرآن شریف مترجم مع تفسیر منحۃ الجلیلہ خلاصہ۔ تفسیر بغوی آگرہ ۱۳۱۶ (بحوالہ برٹش میوزیم)
(۲۷) سراج الدین محمد عبد الرؤف۔ قرآن مجید مع تفسیر الجلالین ۱۲۴۴ صفحے آگرہ ۱۹۰۰ء

(برٹش میوزیم)

(۲۸) گمنام۔ حمائل شریف مترجم ۱۲۰۰ صفحے دہلم ۱۹۰۰ء (برٹش میوزیم)

(۲۹) گمنام۔ بظاہر لکھنو ۱۸۴۰ء۔ ۵۷ ۷ صفحے نامکمل (برٹش میوزیم)

(۳۰) گمنام۔ اردو ترجمہ + انگریزی ترجمہ از یک مسلم گریجویٹ + فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ + متن عربی۔ سیالکوٹ ۱۸۹۹ء (برٹش میوزیم)

(۳۱) گمنام۔ خلاصۃ التفاسیر زائد از ۲۶۰۰ صفحے ۴ جلد، دہلی

(۳۲) محمد اسحاق دہلوی۔ تفسیر صغیر ترجمہ تفسیر کبیر، دہلی

(۳۳) ترجمہ تفسیر کبیر (؟ خاتمۃ العلوم) مطبع وکیل امرتسر ۵۳۶ صفحے

(۳۴) حافظ محمد رحیم بخش حنفی دہلوی۔ اعظم التفاسیر (۷) جلد، دہلی ۱۸۹۴ تا ۹۹ء

(۳۵) عزیز اللہ بن میر عالم الحسینی الاورنگ آبادی (حیدر آباد دکن): چراغ ابدی مخطوطہ اسلامیہ کالج کلکتہ

(۳۶) مجلس اشاعت اسلام حیدر آباد دکن، ترجمہ قرآن شریف ۱۳۱۰ھ ناتمام

(۳۷) حکیم سید علی اطہر۔ ناتمام

(۳۸) محب حسین معلم نسواں حیدر آباد دکن "مثنوی اسرار القرآن" ۔ ناتمام ۱۳۴۵ھ منظوم

(۳۹) آغا شاعر قزلباش۔ منظوم۔ تین جلد مطبوع باقی مخطوطہ

(۴۰) مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان۔ تفسیر کبیر ۱۹۴۰ و مابعد

(۴۱) حسام الدین فاضل حیدر آباد دکن

(۴۲) انیس احمد ۱۹۴۸ء۔ ناتمام

(۴۳) خواجہ عبدالحی فاروقی + حافظ میر غوث احمد توفیق + حاجی عبدالواحد ام اے + حافظ نذر احمد: درس قرآن۔ لاہور ۱۳۷۹ھ

(۴۴) ابوالقاسم محمد عتیق بحر العلومی: قرآن عظیم لکھنو ۱۳۷۱ھ

(بحوالہ رسالہ فاران نومبر ۱۹۵۸ء ص: ۵۴)

انجمن ترقی اردو کی قاموس الکتب (۷) میں بھی نام ہیں۔ ناتمام ترجموں کی فہرست بھی ہے جو آپ کے مقالے کی اشاعت کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔ بہرحال آپ نے بڑا کام کیا۔ گمنام ترجموں کے کنٹرول کی ایک صورت یہ ہے (جو میں نے ترکی ترجموں کی حد تک مکمل کی ہے) کہ ہر ترجمے کا سورۃ فاتحہ کتاب میں شامل کر دیں، قلمی ہو کہ مطبوعہ۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

﴿ ۴ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲/ ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ

محترمی دام لطفکم سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عنایت نامے کا شکریہ۔ مجھے اپنے سہو کا اعتراف ہے لیکن آپ کی فہرست ابجدی ہے اور میری سنہ وار اس لیے سہو ناگزیر بھی رہی۔ میں نے نئے ناموں میں نامکمل تراجم کا ذکر احتیاطاً اس لیے کر دیا کہ آپ کی آئندہ فہرست پر مکرر لکھنے کی ضرورت نہ رہے میرا پورا مواد آپ کے پاس ایک ہی ساتھ پہنچ جائے۔

میں نے آپ کو ہر نام کے ساتھ اپنے موجودہ پورے معلومات لکھ دیے۔ بہتوں کو دیکھنے کا مجھے کبھی موقع نہ ملا۔ اس لیے آپ کے اکثر سوالوں کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ لندن سے ایک دوست نے برٹش میوزیم کے اردو مطبوعات کی فہرست دیکھ کر مجھے بعض معلومات مہیا کیے۔ وہ کتاب یہاں نہیں ہے کہ میں آپ کو مزید تفصیل دے سکوں۔

آغا حیدر حسن کو پنشن ہو چکی ہے۔ چند ماہ قبل پاریس آئے تھے۔ میرے پاس ان کا حیدرآبادی پتہ نہیں ہے۔ نمبرات ۱، ۲، ۴، ۵، ۱۰، ۱۲، ۱۳ کی اطلاع مجھے حیدرآباد دکن کے

پروفیسر ہاشم امیر علی کی فہرست سے ملی۔ مزید معلومات کے لیے بے بس ہوں۔

نمبر ۲۸ دھلم، معلوم ہوا کہ فہرست میں اسی طرح چھپا ہے۔ ڈ کو دلکھنا پرانے زمانے میں مروج تھا معلوم نہیں یہ مقام کہاں ہے۔

اگر میرے پاس سارے مطلوبہ معلومات ہوتے تو آپ کی طلب کے بغیر ہی بھیج دیتا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرا۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ۵ ﴾

بسم اللہ

۹ رذی قعدہ ۸۷ھ

محترمی سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامے پر شکر گزار ہوں۔

میری فہرست میں نانپارہ (نان پارہ (۸)) ہے اس سے زیادہ میں واقف نہیں کہ یہ کون شخص ہے۔

ہاشم امیر علی کی فہرست قلمی تھی جب پچیس سال پہلے انہوں نے مجھے دکھائی۔ وہ ابھی زندہ ہیں لیکن پتہ نہیں کہ فہرست چھاپی یا نہیں۔

آپ زحمت نہ فرمائیں۔ میرے پاس اعظم گڑھ کا ''معارف'' آتا ہے۔ کراچی کا ''فاران'' اور ''البلاغ''۔

مزید انکشافات پر میری دلی مبارکباد عرض ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ۶ ﴾

بسم اللّٰہ

Edebiyat Fakultesi
ادبیات فاکلتہ سی
Istanbul / Turky

۱۷ محرم ۱۳۸۸ھ

محترمی مد فیضکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا عنایت نامہ فرانس سے چکر کھا کر آج یہاں ملا۔ شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کے کام میں برکت دے۔

میری تالیفیں زیادہ تر مضمونوں کی صورت میں ہیں، کتابیں کم ہیں۔ ان کی فہرست تو پاس نہیں لیکن اسلامیات میں ''عہد نبوی(ﷺ) کا نظام حکمرانی'' بھی ایک کتاب ہے جو دہلی اور پھر حیدرآباد دکن میں چھپی تھی۔ ایک پاکستانی ناشر مکرر چھاپنا چاہتے ہیں۔ نظر ثانی کر رہا ہوں۔ واللّٰہ المستعان۔

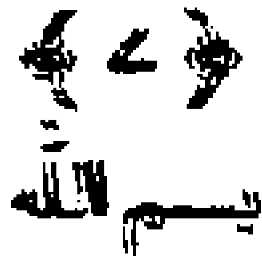
میں ان شاء اللہ ۲۸ رمئی تک یہاں رہ کر فرانس واپس ہو جاؤں گا۔ وہاں بھیجی ہوئی ڈاک خدا نے چاہا تو محفوظ رہیگی۔

کثر اللّٰہ فینا امثالکم وبارک فی مساعیکم۔

مخلص

محمد حمید اللہ

(۱۰) ایک سوال ہے۔ اعتراض کے لیے نہیں صرف معلوم کرنے کے لیے۔ پاکستان کے اکثر بھائی خط میں تاریخ انگریزی ہندسوں میں مثلاً 4/1/88 لکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یا مصلحت کیا ہے؟ کیا ۴/۱/۸۸ھ لکھنے میں کوئی دشواری یا قباحت ہے؟



بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ

محترمی

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تازہ عنایت نامہ وصول ہوا۔ شکر گزار بھی ہوں اور غمگین و بے بس بھی۔ آپ کے ۵ مئی کے خط کا جواب میں نے پہنچنے کے دن ہی استانبول سے دیدیا تھا۔ نہ معلوم میری ڈاک کیوں کثرت سے غائب ہو جاتی ہے حالانکہ خط اپنے ہاتھ سے ڈاک خانے کے ڈبے میں ڈالتا ہوں۔ الی اللہ المستعان۔

سیرۃ ابن اسحاق (۱۱) کے تین ٹکڑے مراکش اور شام میں ملے تھے۔ ان کو تیار کر کے شعبۂ ادبیات، جامعہ رباط مراکش کے امیر شعبہ (doyen) کو ان کی درخواست پر چار سال ہوئے بھیج چکا ہوں۔ وہاں سے صدائے برنخاست۔ چاہیں تو آپ انہیں یاد دہی کر کے استفسار کا اظہار کریں شاید خدا اثر ڈالے۔

"القرآن فی کل لسان" کے نئے اڈیشن کی اب توقع نہ رہی۔ فرانس میں اربوں روپے کا گھاٹا حالیہ ہنگاموں نے ڈالا ہے اور حکومت کی علمی امدادیں فی الحال بند ہیں۔ جب خدا کو منظور ہوگا کام ہو سکے گا۔

ترکی خطاطی کے اصل قلمی نسخے تو نہیں ملیں گے۔ ان کے چربے فوٹو چھاپ وغیرہ بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔

خدا آپ کے کام میں برکت دے اور ہمت میں اضافہ فرمائے۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

﴿ ۸ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

یکم جمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کی خیرو عافیت کی اطلاع سے مسرت ہوئی۔ آپکی فہرست تراجم وتفاسیر میں ایک تازہ اضافہ کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ میرے بڑے بھائی الحاج محمد حبیب اللہ صاحب نے ابھی ابھی اپنا ترجمہ وتفسیر قرآن مجید (۲۳) جلدوں (۸۴۰۰) صفحوں میں مکمل کر لینے کی خوش خبری دی ہے۔ کتاب کا نام تو نہیں لکھا لیکن اسے تفسیر حبیبی کہہ سکتے ہیں۔ وہ حیدرآباد دکن ہی میں ہیں۔

قومی زبان کے ایک حوالے سے معلوم ہوا کہ مارچ واپریل کا نظام (۱۲)، اور دسمبر ۱۹۶۷ کا ثقافت (۱۳) قابل ذکر ہیں کہ ان میں تراجم قرآن مجید کی فہرستیں چھپی ہیں۔ کیا یہ رسالے فراہم ہو سکتے ہیں۔ قیمت اور مصارف ڈاک گزران دونگا۔

حفظکم اللہ وعافاکم۔

خادم
محمد حمید اللہ

﴿ ۹ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۸ رجمادی الآخرہ ۱۳۸۸ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ رسالہ ثقافت ملا پھر عنایت نامہ بھی باعث

سرفرازی۔ خدا آپ کو سعادت دارین عطا فرمائے۔ اگر مصارف ارسال، سے بھی آگاہ فرمائیں تو مسرت میں اضافہ ہو۔ میں نے بھی ایک چھوٹا سا بستہ (۱۴) آپ کو بھیجا ہے۔

''القرآن فی کل لسان'' کے سابقہ اڈیشن کو چھاپنے کا سوال نہیں۔ اس میں سو فی صد معلومات اضافہ طلب ہو گئے ہیں۔

میرے بھائی کا پتہ یہ ہے: محمد حبیب اللہ

5-4-677, Katalmandi

Hyderabad - Deccan

اب وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ بصارت خاص کر بہت کمزور ہو گئی ہے۔

خدا آپ کو صحت و سلامتی سے تا دیر شاد کام رکھے۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿۱۰﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon

75 - Paris VI

۲۷ر رجب ۱۳۸۸ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کی نوازشیں بے پایاں ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ میری مرسلہ فہرست صرف یورپی زبانوں کے تراجم قرآن پر مشتمل ہے۔ مشرقی و افریقی زبانوں کے مواد اس میں شامل نہیں۔ یہ اوراق میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن کے مقدمے کے پروف ہیں۔

حفظکم اللہ و عافاکم۔

خادم

محمد حمید اللہ

﴿ ١١ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۱۹؍شوال ۱۳۸۸ھ

مکرمی

سلام مسنون۔ آپ کو مجبوراً خط لکھ رہا ہوں۔ کوئی جواب طلب امر نہیں۔ مجھے غالب (۱۵) سے کیا تعلق؟

"القرآن فی کل لسان" کی طباعت جدید کے فی الحال کوئی آثار نہیں ہیں۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ١٢ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۳ ج ۲ ۱۳۸۹ھ

مکرمی

سلام مسنون۔ عنایت نامے کا شکریہ۔

میں نے آپ کو جو پروف بھیجے تھے وہ ایک کتاب میں بطور ضمیمہ، مقدمہ چھپے ہیں۔

کتابی صورت میں الگ چھپنے کا امکان نہ رہا۔ پاریس کے ماہنامہ "فرانس اسلام" میں ہر ماہ ایک ایک زبان کے حالات بہ لحاظ حروف تہجی چھپ رہے ہیں۔

حرف A میں چودہ زبانیں اس ماہ ختم ہوئی ہیں۔

میں زیادہ تر فرانسیسی میں کام کرتا ہوں۔

محمد حمید اللہ

﴿ ۱۳ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Toumon
75 - Paris VI

۱۰ ر رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ

پنجشنبہ

محترمی سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رمضان مبارک۔ عنایت نامہ ملا۔ شکریہ۔ مقالے (۱۶) کا پیشگی شکریہ۔ وصولی کو کم از کم دو ماہ لگیں گے۔ اگر اس وقت تک یہاں رہا تو ان شاء اللہ رسید دونگا۔ ورنہ سفر سے جون میں واپس آنا ہے۔

معلوم نہیں آپ لوگ کس حساب سے ابن الہیثم (۱۷) کی ہزار سالہ برسی ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں منا رہے ہیں۔ میرے علم میں نہ تاریخ ولادت سے اور نہ تاریخ وفات سے، نہ اسلامی تقویم سے، نہ فرنگی تقویم سے۔

امام محمد (شاگرد امام ابوحنیفہ) کی وفات ۱۸۹ھ میں ہوئی۔ اس کی بارہ سو سالہ سالگرہ ترکی میں منائی گئی اب ان شاء اللہ آئندہ ماہ پاریس میں بھی جامعہ میں منائی جائے گی۔

فرانس اسلام نامی رسالے کا گزشتہ نمبر ہوائی ڈاک سے مرسل ہے۔ یہ القرآن فی کل لسان کے نئے اڈیشن کے فرانسیسی ترجمے کو بہ اقساط بہ ترتیب حروف تہجی شائع کر رہا ہے۔ اب حرف B شروع ہوا ہے۔ آئندہ نمبر میں بمرا زبان جو مالی اور گینی میں بولی جاتی ہے، آئیگی۔ کیا قلاتی اور مکرانی بلوچی میں کوئی فرق ہے؟ مرسلہ نمبر میں قلاتی ترجمہ ہے، مکرانی ترجمہ جو اس سے بہت مختلف ہے حرف M میں آئیگا۔

خطاطی پر فرانس اسلام نے کبھی کچھ شائع نہیں کیا۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ۱۴ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۸ر شوال ۱۳۸۹ھ

مخدومی زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں سفر پر تھا۔ الجزائر سے دو چار دن ہوئے واپس آیا تو کثیر منتظر ڈاک میں آپ کا عنایت نامہ بھی ملا۔ جواب جو منتظر تھا، ابھی لکھنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ آج شام کی ڈاک میں سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر شرف بخش ہوا۔ دونوں جلدیں اور نقشہ (۱۸) اور اس آخر الذکر پر ایک ڈاک کا ٹکٹ، سب ملے۔ دلی شکریہ والأجر علی اللہ۔ رسالہ ان شاء اللہ تفصیل سے پڑھونگا، متعدد مضامین مفید معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا ضمیمہ بڑا اثر انداز ہے۔ دو ڈھائی سو تراجم صرف ایک اردو زبان میں ہیں، اس کی توقع نہ تھی۔ بعض وقت حقائق افسانوں سے زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔

انگریزی اور فرنگی زبانوں کا مواد بہت پھسپھسا ہے۔ غالباً عربی سے نقل کیا ہے، اس لیے بہ کثرت فرنگی نام غلط املا سے چھپے ہیں۔

فی الحال اس رسید پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ ابھی کافی سابقہ ڈاک جواب کی منتظر ہے۔ رسالہ ''فرانس اسلام'' خریداروں کی کمی سے حالت نزع میں ہے۔ تین ماہ سے شائع نہ ہوا۔ واللہ علی ما یشاء قدیر۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

﴿ ۱۵ ﴾

بسم اللہ

Md. Hamidullah
4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۱۲/شعبان ۱۳۹۰ھ سہ شنبہ

محترمی سلام مسنون۔

عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔ اگر آپ کے عالمانہ مقالے میں کوئی اضافہ یا تصحیح طلب چیز پاتا تو، حسب سابق، آپ کی فرمائش کے بغیر ہی عرض کر دیتا۔

میرا پتہ مستقل ہے۔ اگر میں سفر پر رہوں تو ڈاک یا سفر کے مقام پر آجاتی ہے یا واپسی تک منتظر رہتی ہے۔ اگر میری وفات ہو جائے تو ڈاک خود بخود مرسل کو واپس ہو جائیگی اگر اس نے اپنا پتہ لکھا ہو۔

میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ ''القرآن فی کل لسان'' کو عالمگیر تحریک قرآن مجید نے حیدر آباد دکن میں شائع کیا تھا۔ اب اس کے موسس ابو محمد مصلح صاحب کی وفات پر ادارہ برخاست ہو گیا ہے۔ میرے پاس وسائل نہیں کہ متروکہ ذخیرۂ کتب کے حشر کا پتہ چلا سکوں۔

فرانس میں ایک ماہوار رسالہ ''فرانس اسلام'' نکلتا ہے۔ اس کے ہر نمبر میں بہ لحاظ حروف تہجی ایک ایک زبان کا مواد نکل رہا ہے۔ اب حرف A ختم ہو کر B شروع ہوا ہے۔ میرے پاس کے مواد کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے وسائل تا حال حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ والامر بید اللہ

مخلص

محمد حمید اللہ



4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۲۱ رمضان ۱۳۹۰ھ

جمعہ

محترمی

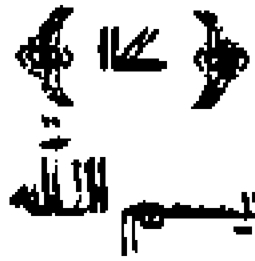
سلام مسنون۔ عید مبارک۔

۱) سیرۃ ابن اسحاق کے دستیاب شدہ اجزاء کو مراکشی حکومت کی فرمائش پر اسے روانہ کیے ہوئے اب پانچواں سال ہے۔ یہ بھائی خط کا جواب نہیں دیتے۔ اس لیے خدا پر چھوڑ کر چپ ہو چکا ہوں۔ آپ چاہیں تو رکٹر جامعۂ رباط Recteur, University of Rabat کو توجہ دلائیں۔ ممکن ہے متعدد خطوط آئیں تو وہ توجہ کریں۔

۲) کوئی چالیس سال قبل میں نے سیرۃ النبی پر اردو کتب و مقالات کی فہرست مرتب کرنی شروع کی تھی اور ایک ماہ ربیع الاول میں ان کی حیدر آباد دکن میں نمائش بھی کی تھی۔ وہ مواد اب یہاں کہاں۔ اچھا ہے کہ آپ مکرر شروع کر کے تکمیل کو پہنچائیں۔ عربی میں ہزاروں تالیفیں ہیں۔ ان کی فہرست میں آپ کو کیسے بھیج سکتا ہوں۔ صحابہ کی نظمیں، نعت و مرثیہ نبوی و ذکر غزوات، حدیث کی کتابیں اس کا آغاز ہیں۔ (مغازی پر مستقل رسالے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کی طرف بھی درود منسوب ہیں) پھر خالص کتب سیرت بھی شروع ہوئیں۔ عروہ بن زبیر، زہری، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق وغیرہ اسی سلسلے میں آتے ہیں۔

مخلص

محمد حمید اللہ



بسم اللہ

4, Rue de Tournon
Paris VI

۱۵؍شوال ۱۳۹۰ھ دوشنبہ

محترمی زاد مجدکم۔ سلام مسنون۔ عنایت نامے کا شکریہ۔

یہ استدلال قوی نہیں کہ اگر کوئی بات قدیم تر مولف کے یہاں نہیں ہے تو وہ مابعد والے کی اختراع ہے۔ فرض کیجئے کہ ابن اسحاق نے زہری کی روایت تو نقل کی لیکن سعید بن سعد بن عبادہ سے تعلیم نہ پانے سے اس سے استفادہ نہ کیا۔ پھر عرصہ بعد مثلاً ابن سید الناس نے سعید بن سعد کی کتاب کو نقل کیا تو یہ روایت قدیم ہی ہو گی ابن سید الناس کی من گھڑت نہیں (۳۰)۔

یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ لاہور جیسے علمی مرکز میں بھی آپ کو یہ معلوم کرنے کا امکان نہیں کہ مولفین مغازی و سیرت کون ہیں اور کب کے۔ ابن اسحاق سے قبل کے کم از کم ۲۶ مورخ مجھے ملے ہیں جن کی کتابیں اب کامل یا جزئی طور پر باقی ہیں ان میں چند کے نام یہ ہیں:

وہب بن منبہ	(فوت ۱۱۰)	کتاب المغازی
ابن اسحاق	(۱۵۱)	//
معمر بن راشد	(۱۵۴)	//
ابو معشر السندی	(۱۷۰)	//
واقدی	(۲۰۷)	//
ابن ہشام	(۲۱۳)	سیرۃ رسول اللہ ﷺ
ابن سعد	(۲۳۰)	طبقات
طبری	(۳۱۰)	تاریخ
محمد بن ہارون بن شعیب	(۳۵۳)	مغازی

مزید معلومات بروکلمان اور فواد سزگین کی جرمن فہرستوں میں ملیں گی۔
نمائش کتب سیرت کا ذکر حیدرآباد دکن کے روزناموں میں تو آیا مگر فہرست کہیں چھپی نہیں۔ وہ زیادہ تر کتب خانہ آصفیہ ہی کی کتابوں کی نمائش تھی۔ رسالوں میں سے کچھ دلچسپ مضامین میرے ذاتی ذخیرے میں سے نکالے گئے تھے۔
خدا آپ کی مساعی علمیہ میں برکت دے۔

ناچیز
محمد حمید اللہ

﴿ ۱۸ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۷؍ربیع الآخر ۱۳۹۱ھ

محترمی
سلام مسنون۔ تین ماہ کے سفر کے بعد کل واپس آیا تو آپ کا خط منتظر ملا۔
مجھے خدا اور رسول کافی معلوم ہوتے ہیں اشخاص اور انسان پرستی سے دلچسپی نہیں۔
ابن اسحاق سے قبل کے مؤرخین اسلام کے ناموں کے لیے دیکھئے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل، اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۹۱۔

الفقیر الی اللہ
محمد حمید اللہ

﴿ ۱۹ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
75 - Paris VI

۱۱؍ذی القعدہ ۱۳۹۱ھ دوشنبہ

محترمی۔ سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

عنایت نامہ آج صبح ملا۔ ممنون ہوا اور اطمینان کہ اس حزنیے (۲۱) میں کم از کم آپ تو خیریت سے ہیں۔ مہر صاحب (۲۲) کی وفات پر صدمہ ہوا۔ خدا مغفرت نصیب فرمائے۔ میرے ان سے کبھی تعلقات نہ رہے۔ کبھی کبھی ان کے مضمون رسالوں میں نکلتے تھے۔ ادبی ہونے کے باعث میں ان کو پڑھتا نہ تھا۔ جب ایک مرتبہ ایک فرنگن (۲۳) نے بال جبریل کا فرانسیسی ترجمہ کیا (جو ابھی چھپا نہیں ہے) اور بعض اشعار کا مطلب پوچھا تو مہر صاحب کی شرح (۲۴) فراہم کی لیکن مشکل مقامات پر وہ عام طور پر گول ہی نکلے۔

مجلس رضا (۲۵) کے کچھ مطبوعات خیال پڑتا ہے کہ مجھے پہنچے تھے۔ اچٹتی نظر ڈالی تھی۔ ارسال کا شکریہ۔ مجھے آپ کی دوسری مصروفیتیں زیادہ عزیز ہیں۔

خادم

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۰ ﴾

بسم اللہ

کراچی ایرپورٹ

۱۴؍ربیع الاٰخر ۱۴۰۰ھ

مکرمی

سلام مسنون

آپ کی خواہش پر اپنی انگریزی کتاب سیرت (۲۶) کا نسخہ علاحدہ ڈاک سے بھیج رہا

ہوں۔ اس کا حصول دشوار ہے۔ ہندوستان سے فرانس کو منگانا اور فرانس سے پاکستان کو بھجوانا ہوتا ہے۔ میں تاجر کتب نہیں ہوں۔

مجھے معلوم نہیں کس نے آپ سے کہا کہ میں قرآن مجید کے بے شمار زبانوں میں خود ترجمہ کر رہا ہوں۔ مضحکہ خیز بات ہے۔

میرا فرانسیسی ترجمہ نو دس مرتبہ چھپ چکا ہے، الحمد للہ۔ ناشر مکرر چھاپ رہا ہے۔ مجھے ان طباعتی انتظامات سے کوئی تعلق نہیں۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۱ ﴾

بسمہ اللہ

4, Rue de Tournon
75006 - Paris / France

۱۹/ ربیع الآخر ۱۴۰۰ھ

مکرمی

سلام مسنون۔ میں دو ہفتے قبل پاکستان میں تھا پھر فرانس جانا پڑا۔ اب مکرر پاکستان آیا ہوں اور ان شاء اللہ ۲۰/ مارچ تک بہاول پور یونیورسٹی میں رہ کر فرانس واپس ہو جاؤ نگا۔

ان مصروفیتوں کے باعث آپ کے خط کا اب تک جواب نہ دے سکا۔ کل کراچی پہنچا تو آپ کے دو خط منتظر ملے۔ شکریہ۔

میں آپ کے کسی سوال سے ناراض بالکل نہیں ہوا۔ صرف جواب دیا مختصر طور پر کہ طویل تحریر کے لیے وقت نہ تھا۔

بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے بعض وقت اہل علم کی باتیں سمجھ نہیں سکتا۔

میری کتاب عہد نبوی کے میدان جنگ (۲۷) کا بعد اضافہ ہائے کثیر انگریزی ترجمہ

"Battlefields of the Prophet" (۲۸) کے نام سے چھپا۔ انگریزی کتاب "Muhammad Rasulullah" جیسا کہ آپ دیکھیں گے ایک الگ چیز ہے۔ وہ میری فرانسیسی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ یا خلاصہ بھی نہیں ہے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اس کا کوئی اردو ترجمہ میرے علم میں نہیں ہوا ہے۔

مغازی ابن اسحاق چند سال ہوئے حکومت مراکش نے رباط شہر میں چھاپ دی ہے۔ وہ فرانس میں دستیاب نہیں ہوتی۔ ناشر خط کا جواب بھی نہیں دیتے اس لیے اس بارے میں افسوس ہے کہ آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ گیوم (۲۹) نے سیرۃ ابن ہشام کے اقتباسات ابن اسحاق کے نام سے چھاپے تھے (ان عبارات کو حذف کر کے جو ابن ہشام کی تھیں)۔

شاید آپ کے کچھ سوال بھی ہیں لیکن سمجھ نہ سکا معاف فرمائیں۔

فقیر حقیر

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۲ ﴾

بسم اللہ

پاریس

۱۹ رجب ۱۴۰۰ھ

مکرمی

سلام مسنون ورحمۃ اللہ

۱۔ بہاول پور یونیورسٹی نے میرے لیکچر، جو زبانی تھے، ٹیپ پر ریکارڈ کیے تھے اور وائس چانسلر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کتابی صورت میں چھپیں گے۔

۲۔ میں نے (''ابن اسحاق پر رسالہ'' مرتب کیا)۔ معلوم نہیں آپ کی کیا مراد ہے؟ میرا ایک طویل مضمون ابن اسحاق پر انگریزی میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل، کراچی میں ۱۹۶۷ء میں چھپا ہے۔ مغازی ابن اسحاق کو حکومت مراکش نے ایڈٹ کرنے

میرے ہی سپرد کیا تھا اس کا نام ہے سیرۃ ابن اسحاق المسمی کتاب المبتدأ و المبعث والمغازی نشر کردہ معهد الدراسات والابحاث للتعریب، پوسٹ بکس (۴۳۰) رباط ۱۹۷۶ء۔ یہ کتاب یہاں بازار میں بالکل نہیں ہے۔

مخلص

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۳ ﴾

بسم اللہ

پاریس

۲۸ ربیع الانور ۱۴۰۲ھ

محترمی دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ پاکستان (بشمول لاہور) سے ابھی ابھی واپسی پر ملا۔ شکریہ۔

میری انگریزی کتاب Muhammad Rasulullah کے جائزہ اڈیشن
(Habib & Co., 5-4-677, Katalmandi,
500001 - Hyderabad - Deccan)
میں مکتوبات نبویہ کے پانچ اصول کے فوٹو ہیں۔

۱۔	مقوقس والا	استانبول میں
۲۔	المنذر بن ساوی	دمشق
۳۔	نجاشی	//
۴۔	کسریٰ	بیروت
۵۔	ہرقل	عمان (اُردن)

ان کی عبارتوں اور تاریخی کتابوں کے دیئے ہوئے متن میں اسی قسم کے فرق ہیں جو عام عربی کتابوں کے مختلف مخطوطات میں ہوتے ہیں۔

حال میں تونس کے ایک اخبار میں جیفر بن الجلندی (۳۰) بن المستکبز کا خط چھپا ہے مگر کوئی تفصیل نہیں کہ وہ اسے کہاں سے ملا۔

میں اسی ہفتے پھر سفر پر جا رہا ہوں۔ فوٹو حاصل کرنا نہ صرف یہاں بہت گراں ہے بلکہ فوٹو گرافر بڑا وقت بھی لیتے ہیں۔ پانچ فوٹوؤں پر پانچ سو روپے سے کم مصارف نہ ہونگے۔

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار محلہ معلات میں، جنۃ المعلیٰ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ محلہ حجون ہی میں ہے۔ معلات کے معنے ہیں بلند حصہ شہر، اور مُسفلہ کے معنے ہیں پست حصہ شہر۔ یہ مکہ معظمہ کی معروف تقسیم ہے۔

فقیر حقیر

محمد حمید اللہ

﴿۲۴﴾

بسم اللہ

4, Rue de Toumon
75 - Paris 6, France

۲۹ رمضان ۱۴۰۳ھ

محترمی

سلام مسنون۔ آپ کا عنایت نامہ اس وقت آیا جب میں ہنوز شفاخانے میں تھا۔ کل ہی گھر واپس آیا ہوں۔ الحمدللہ۔

صحیفہ ہمام (۳۱) بن منبہ کے ہر اڈیشن میں تصحیح و اضافہ ہوتا رہا ہے اس کا جدید ترین اڈیشن انگریزی میں ہے۔ ۱۳۹۹ھ میں حیدر آباد دکن میں چھپا ہے۔ اس میں علاوہ اور معلومات کے اس مخطوطے کا ذکر ہے جو استانبول میں ہے اور جس کا نام سرء الصحائف ہے۔ اس میں صحیفۂ ہمام کے ساتھ تین چار اور صحابہ کے صحیفے بھی ہیں جو تا حال چھپے نہیں ہیں۔

بہر حال اس کی کم توقع ہے کہ آپ لوگ انگریزی چھیقے جام مہیا کریں بلحاظ اردو اڈیشن سے مقابلہ کر کے ضروری اصلاحات اور ترمیمیں کریں۔ میری ۷۷ سالہ عمر میں اس کی کیا توقع کہ میں اسے انجام دے سکوں۔ نقوش (۳۳) والوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی کہ "محمد رسول اللہ" کا ترجمہ مؤلف کو بتا کر چھاپیں۔

عید مبارک۔

مخلص

محمد حمید اللہ

(۲۵)

بسم اللہ

پارلیس - ۲۹ رشوال ۱۴۰۳ھ

محترمی

سلام مسنون۔ عنایت نامے کا شکریہ۔ سوال بظاہر غیر ضروری ہے کہ جدید اور قدیم اڈیشن کا مقابلہ کرالے تو آپ کو خود ہی جواب مل جاتا۔ نئے خطوطے بھی ملے ہیں۔ دیباچے میں نئے معلومات بھی بہ کثرت بڑھائے گئے ہیں۔

کتاب "محمد رسول اللہ" کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا ترجمہ مجھے بتائے بغیر شائع کیا گیا اور کافی غلطیاں ہوئی ہیں۔

سیرت ابن اسحاق پہلے مراکش (رباط) میں چھپی۔ پھر دوسرا اڈیشن ترکی میں نکلا ہے جس کا پتہ ہے:

Hayra Hizmet Vakfi
Nesriyat Mudulugu
Aziziye Cami Yani No.42
Konya / Turkey

والسلام

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۶ ﴾

بسم اللہ

پاریس - ۷/ذی حجہ ۱۴۰۳ھ

مخدوم محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ملا۔ شکرگزار ہوں۔ معلوم نہیں میں اردو بھول گیا ہوں یا کوئی اور سبب، باوجود کئی بار وضاحت کے مکرر آپ کا ارشاد ہوا ہے کہ انگریزی کتاب "محمد رسول اللہ" کے ترجمے کی میں نے آپ کو اجازت دی تھی۔ میرا عریضہ یہ تھا کہ ترجمہ مجھے بتائے بغیر چھاپا گیا جس کے باعث مفہوم بعض جگہ غلط ہو گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کی اجازت الگ چیز ہے، ترجمے کو مجھے بتائے بغیر چھاپنا الگ چیز ہے۔

مجھے بالکل معلوم نہیں کہ سیرت ابن اسحاق کا ہدیہ اور مصارف ڈاک ترکی میں کیا ہیں؟

میری صحت ان دنوں علمی کاموں کی اجازت کم دیتی ہے۔ ایک مہینہ شفاخانے میں رہ کر اب الحمدللہ گھر آیا ہوں لیکن ضعف ہے۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۷ ﴾

بسم اللہ

پاریس - ۲۵/صفر ۱۴۰۴ھ

مخدوم ومحترم زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج آپ کا تازہ کرم نامہ ملا۔ ممنون ہوا اور مسرت بھی کہ سیرت ابن اسحاق نہ صرف آپ کو دستیاب ہو گئی بلکہ آپ کو پسند بھی آئی۔ والحمدللہ۔

فرانس کے اہل مطبع کہتے ہیں کہ اگر فہرست (۳۳) کتاب کے شروع میں ہو تو ابتدائی صفحات کی طباعت ملتوی کرنی پڑتی ہے۔ فہرست آخر میں ہو تو اس میں صفحات کی نشاندہی آخری اوراق کے پروف کی تصحیح کے وقت ہو سکتی ہے۔

افسوس ہوا کہ طباعت میں ایک صفحہ صاف نہیں آیا ہے۔ لیکن آپ کی نشاندہی مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ "میرے نسخے کے ص ۲۶۰ پر حاشیہ طباعت کے وقت مشین سے تیل لگنے کے سبب نصف چھپنے سے رہ گیا"۔ کیا صرف حاشیہ نمبر ۳ اور نمبر ۴ مراد ہے یا کچھ اور؟

حاشیہ نمبر ۳ ہے: (3) المخطوطة شاه۔ والشاء جمع شاة

حاشیہ نمبر ۴ : (4) كذا ههنا النص و كتب الناسخ

فوقه: بينما

کتاب "محمد رسول اللہ" کا میں نے صرف ابتدائی حصہ، دو چار صفحے پڑھے۔ اس میں مؤلف کا مفہوم بعض جگہ بدل گیا ہے۔ یعنی ترجمہ (۳۴) وفادارانہ نہیں معلوم ہوا۔

سیرۃ ابن اسحاق کا ترجمہ ابن اسحاق کو بتانا چاہیے تاکہ وہ کہہ سکے کہ اس کا مفہوم مترجم نے سمجھا ہے یا نہیں۔ نہ کہ غریب حمید اللہ۔

لا مارتین (La-Martain) سے اب تو آپ بھی واقف ہو گئے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔

الفقیر الی اللہ

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۸ ﴾

بسم اللہ

۲۱ ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ

محترمی

سلام مسنون۔ عنایت نامہ ملا۔ ان فضولیات (۳۵) کے لیے آپ کی بھی رقم ضائع،

میری بھی رسید کے لیے رقم ضائع۔ میں نے حکومت کو لکھ دیا ہے کہ انعام کی رقم وہیں کسی کارِ خیر میں لگا دیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ہاں اگر آپ لکھتے کہ سیرت ابن اسحاق کا ترجمہ کس مرحلے میں ہے؟ آیا اس میں ترجمے کے لیے کوئی دشواریاں ملی ہیں؟ —— تو مجھے زیادہ دلچسپی ہوتی۔

حفظکم اللہ وعافاکم۔

فقیر الی اللہ

محمد حمید اللہ

﴿ ۲۹ ﴾

بسم اللہ

پاریس

۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامے کا شکریہ۔ جزاکم اللہ خیرا

صفحہ ید/۱۱ میں یوجان سہو طباعت ہے۔ جرمن نام یوحان Johann (۳۶) ہے۔

نیز کوفان سہو طباعت ہے۔ صحیح کوتان ہے۔

220،209،148 العاص/ العاصی دونوں صحیح ہیں اور ایک ہی چیز ہیں۔

کاتب کبھی کچھ کبھی کچھ لکھتا ہے۔ یہ پرانا رواج ہے۔

12/271 ابو حَیَّة (دِحیہ نہیں)

تازہ جلدوں (۳۷) کو ہوائی ڈاک سے بھیجنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان جلدوں میں ایک صفحہ فہرست مضامین کا بھی ہوتا تو سہولت ہوتی۔

ایک حقیر (۳۸) مشورہ: ایک جغرافیۂ سیرت کی بھی ضرورت ہے۔ جغرافی نقشہ map بھی اور سیرت میں جن مقاموں اور قبیلوں کا ذکر آتا ہے ان کا محل وقوع بھی۔ کاش میری عمر، صحت اور فراغت اجازت دیتیں کہ یہ کام، یہ تمنا میرے ہاتھ پوری ہو۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ وہاں کوئی اس کے لیے تیار ہو جائیں۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

﴿۳۰﴾

بسم اللہ

۲۲ ر رجب ۱۴۰۶ھ۔ بدھ

محترمی دام لطفکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل سہ پہر عنایت نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔

مدینہ منورہ میں دو ثنیۃ (۳۹) الوداع ہیں ایک شمالی سفر (شام وغیرہ) کے لیے اور یہ جبل سَلَع کے دامن میں ہے، اُحد جانے کے راستے پر۔ دوسرا جنوبی سفر (مکہ وغیرہ) کے لیے اور یہ قُبا میں ایک بلند ٹیلے پر اب بھی بتایا جاتا ہے۔ "الوداع کہنے کی ٹیکری" ظاہر ہے کہ دونوں سمتوں میں ہونی چاہیے، اور ہے۔ (اور وہی خوش آمدید کہنے کی ٹیکری" بھی بن جاتی ہے)۔

میں سمجھ نہ سکا آپ قرآن نمبر کے لیے اپنے کس خط کے جواب کے منتظر ہیں۔

خدا آپ کے کاموں میں برکت دے۔

خادم

محمد حمید اللہ

﴿ ۳۱ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۲۸ ر جمادی الاول ۱۴۰۷ھ

محترمی زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

عنایت نامہ ملا، جسے اصولاً نہیں ملنا چاہیے تھا کیونکہ مکان کا پتہ تو ہے مکین کا نام فرنگی حروف میں نہیں ہے۔ ایسی ہی کسی وجہ سے پرانی چیزیں واپس ہوئی ہونگی۔ میں ابھی زندہ ہوں۔

عرصہ ہوا آپ کے ہاں سے ایک خط آیا تھا کہ مجھے انعام دینا تجویز ہوا ہے۔ میں نے فوراً جواب بھیجا تھا کہ شکریہ مگر وہ میں قبول نہیں کرسکتا۔ وہیں کسی کارِ خیر میں لگا لیجیے۔

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

﴿ ۳۲ ﴾

بسم اللہ

۴ ر رجب ۱۴۰۷ھ

محترمی زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

کرم نامہ ملا۔ میں انعام نہیں لیا کرتا، چاہے حکومتوں کے ہوں یا اداروں کے۔ آپ میرا انعام منسوخ کردیں اور کسی اہل تر کو دیدیں۔

میں سوائے رسالہ نقوش کے طفیل صاحب مرحوم و مغفور کے سوانح حیات اور

خدماتِ دینی و معاشرتی سے ناواقف ہوں۔ ان کے لیے جنت کے اعلیٰ درجات کی دعا کرتا ہوں۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

﴿۳۴﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France
۲۰ رشوال ۱۴۱۲ھ

محترمی

سلام مسنون۔ کرم نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔ میں پرسوں سنیچر (۲۵ راپریل) کو سفر پر جا رہا ہوں ان شاء اللہ۔ اسلام آباد کو۔ ۲۸ رکو لاہور روانگی۔ ۳۰ رکو کراچی روانگی۔ پھر پاریس واپسی۔ لاہور میں اور ہر جگہ سرکاری مہمان خانے میں رہنا ہے۔ اس لیے سکوں نہیں ہے کہ آپ کا کام فوراً کرسکوں۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث (۴۰) کہیں پڑھی ہوئی یاد نہیں۔ مصنف عبدالرزاق شاید چھے جلدوں مین چھپی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کی کوئی حدیث مصحح صاحب نے حذف کی ہو۔ یہ کتاب میرے ہاں ہے لیکن فی الحال دسترس سے باہر ہے۔ سفر سے واپسی پر شاید وہ مل سکے۔

سخت مصروفیت کے باعث یہ خط آدھی رات کے قریب لکھ رہا ہوں اور فوراً اتر کر ڈاک کو بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے وہ آپ کو بروقت مل جائے۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

﴿ ۴۴ ﴾

باسمہ تعالیٰ حامداً ومصلیاً

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France

بدھ۔۱۷ ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ

مخدوم ومحترم

سلام مسنون۔آج آپ کا تازہ کرم نامہ ملا۔شکر گزار ہوں۔اسلام آباد (۴۱) میں معلوم ہوا کہ آپ نے وہاں بھی نور محمدی کی تخلیق کے متعلق تلاش کا کام جاری رکھا تھا۔خدا مدد فرمائے۔

میں نے مصنف عبدالرزاق کے کئی مخطوطے دیکھے ہیں لیکن ہماری قدیم کتابوں میں انڈکس نہیں ہوتا اور یہ سوال ذہن میں بھی نہ تھا جب کتاب کے مخطوطے دیکھے۔اگر آئندہ کبھی وہ حدیث ملی تو ان شاء اللہ عرض کرونگا۔زیر بحث الفاظ کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

دیگر آیات واحادیث کافی ووافی ہیں۔

میں نے مذاقاً کہا تھا (۴۲) کہ کتابوں پر دستخط کرانا بدعت ہے۔میرا قصور معاف فرمادیں۔

خادم

محمد حمید اللہ

﴿ ۴۵ ﴾

وصولی کی رسید کا منتظر (۴۳)

﴿ ۳۶ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۶؍ جولائی ۱۹۹۳ء

محترمی زادمجدکم

سلام مسنون۔ کرم نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔

محمود پاشا فلکی (۴۴) کی کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ لاہور میں یونیورسٹی میں تلاش کیجئے مل جائیگی۔

نسیٔ یعنی سال میں ۱۳ مہینے کے متعلق غلطیاں ہیں۔ میں نے اس پر مقالے بھی لکھے ہیں وہ بھی لاہور میں مل جائیں گے۔ میری تحقیق میں ولادت پاک

۲؍ ربیع الاول	مطابق	۷؍ جون ۵۶۹ء	جمعہ
۸؍ ربیع الاول	مطابق	۱۳؍ جون ۵۶۹ء	جمعرات
۱۰؍ ربیع الاول	مطابق	۱۵؍ جون ۵۶۹ء	سنیچر
۱۲؍ ربیع الاول	مطابق	۱۷؍ جون ۵۶۹ء	دوشنبہ

کی روایتیں ہیں۔

میں زیر علاج ہوں۔

نیازمند

محمد حمید اللہ



باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیا

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France
یکم ستمبر ۱۹۹۴ء

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دو چار دن ہوئے کرم نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ ڈاک کی خراب حالت کے باعث رجسٹری سے لکھنا پڑتا ہے۔

آپ کے سوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ "بنیاد پرست" (۴۵) کی جگہ "بنیاد پسند" کہہ لیجیے۔ پرستش صرف خدا کو سزاوار ہے۔ یہ نیا لفظ ہے۔ معلوم نہیں انگلستان سے نکلا، یا فرانس وغیرہ سے ترجمہ کر کے انگلستان و امریکا پہنچا۔

لفظ نیا ہے۔ اس لیے لغت کی کتابوں میں تو نہیں آیا ہے۔ نہ وہاں، نہ یہاں۔ مطلب نرم الفاظ میں مسلمانوں پر چوٹ کرنا، ان کو گالی دینا ہے۔ ان لوگوں کے لیے سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جو محض بے دین، گناہگار ہو۔ اور سب سے بُرا وہ ہے جو اسلام کے احکام کی پوری تعمیل کرتا ہو۔ یہ ایک لفظ نہیں، اور بھی کئی لفظ یہاں مستعمل ہیں اور غالباً روز مزید نت نئے لفظ بنیں گے اور پھیلیں گے۔ خدا ہمیں ہدایت دے کہ ہم اس کے احکام کی اچھی تعمیل کریں اور اس کی پسند کی راہ پر چلیں۔

احباب کو سلام۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

﴿ ۳۸ ﴾

بسم اللہ

4, Rue de Tournon
Paris - 6 / France

۱۰ر رمضان ۱۴۰۶ھ

مخدوم و محترم زاد فیضکم وطول عمرکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۶؍اپریل ۱۹۸۶ء کا عنایت نامہ ملا۔ شرفیاب ہوا۔

سیرت نبویہ پر ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ وہ مغازی موسیٰ بن عُقبہ کا ایک ٹکڑا ہے جو برلن میں ہے۔ اب یہ شاید بعد از وقت ہے۔

قرآن مجید نمبر کے لیے:

(۱) ایک عربی مضمون الگ بک پوسٹ سے بھیج رہا ہوں۔ شاید کارآمد ہو۔

(۲) خطبات بہاولپور کا نیا اڈیشن ابھی ابھی اسلام آباد میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا باب تاریخ قرآن ہی پر اردو میں ہے۔

(۳) مختلف قرآنی کلمات (المسجد الاقصیٰ۔ انا عرضنا الامانۃ۔ خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا۔ کونی بردا وسلاما علیٰ ابراھیم وغیرہ) پر میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن میں مختصر نوٹ ہیں۔ شاید ان کے اردو تراجم آپ کے لیے کارآمد ہو سکیں۔

بہر حال کوئی وقت مقرر فرمائیں کہ آج کل مصروفیت بہت ہے۔

مجھے آپ نے ایک انعام دینا طے کیا ہے۔ اس میں میری قدر افزائی ہے جس پر شکر گزار ہوں۔ لیکن دنیا میں انعام لوں تو آخرت میں محرومی کا ڈر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یہ رقم ''میری طرف سے'' کسی موزوں ادارے کو دیدیں؟ مثلاً صدیقی ٹرسٹ، نسیم

پلازا، نشتر روڈ کراچی نمبر ۵"۔ مگر آپ کو کامل آزادی ہے۔

نیاز مند
محمد حمید اللہ

آپ کے خط اور لفافے پر
دو الگ الگ پتے درج ہیں۔
کونسا صحیح ہے؟

بنام
محمد طفیل (مدیر نقوش)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریر کا عکس

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

4, Rue de Tournon
Paris-5 / France

یکم ستمبر ۱۹۹۹

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ دو چار دن ہوئے کرم نامہ ملا۔ ممنون و شکر گزار ہوں۔ ڈاک کی خراب حالت کے باعث رجسٹری سے لکھنا پڑتا ہے۔

آپ کے سوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ بنیاد پرست کی جگہ "بنیاد پسند" کہہ لیجیے (پرستش صرف خدا کو سزاوار ہے) یہ نیا لفظ ہے۔ معلوم نہیں انگلستان سے نکلا یا فرانس وغیرہ سے ترجمہ ہو کے انگلستان و امریکا پہنچا۔ یہ لفظ نیا ہے۔ اسی لئے لغت کی کتابوں میں وہ نہیں آیا ہے۔ نہ وہاں، نہ یہاں۔ مطلب نیز الفاظ میں مسلمانوں پر چوٹ کرنا اور ان کو گالی دینا ہے۔ ان لوگوں کے لئے سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جو صرف بے دین، گناہگار ہو۔ اور سب سے برا وہ ہے جو اسلام کے احکام کی پوری تعمیل کرتا ہو۔ یہ ایک لفظ نہیں، اور بھی کئی لفظ یہاں مستعمل ہیں اور نئے بنا روز مزید تشدد لفظ بنیں گے اور پھیلیں گے۔ خدا ہمیں ہدایت دے کہ ہم اس کے احکام کی اچھی تعمیل کریں اور اسوۂ حسنہ کی راہ پر چلیں۔

احباب کو سلام

نیازمند

محمد حمید اللہ

حواشی

(۱) یہ مضمون قرآن کریم کے اردو تراجم و تفاسیر کے متعلق تھا جو حکیم اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (متوفی 17-11-1999) کی ترغیب و تشویق سے وجود پذیر ہوا۔ اس موضوع پر راقم کی یہ ابتدائی کوشش تھی۔ مضمون ہٰذا ماہنامہ ''فیض الاسلام'' راولپنڈی کے قرآن کریم نمبر برائے جنوری فروری 1968ء کے مشترک شمارے میں منظرِ عام پر آیا۔ اس وقت اس مضمون میں صرف 196 مکمل و جزوی تراجم و تفاسیر کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مضمون کو مزید آگے بڑھانے کے لیے میں نے علومِ اسلامیہ کے ماہر، مشہور محقق اور عالمِ دین جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) کی طرف رجوع کیا اور موصوف سے تبادلہ معلومات اور دیگر مآخذ سے بھرپور استفادے کے بعد اس مضمون کا نقشِ ثانی ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور کے قرآن نمبر کی جلد دوم و سوم برائے 70-1969 میں اشاعت پذیر ہوا جس میں مکمل و جزوی تراجم و تفاسیر قرآن کی تعداد بحمد للہ 698 تک پہنچ گئی۔

خوانندگانِ گرامی کی معلومات میں اضافہ کی خاطر یہاں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اس موضوع پر جناب مولانا نسیم احمد صدیقی نوری صاحب کا ایک مضمون مزید معلومات اپنے دامن میں سمیٹے مجلّہ حنفیہ عالمگیر، کراچی کے شمارہ مؤرخہ 3/ اگست 2001ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے جس میں 846 تراجم و تفاسیر قرآنی کے کوائف جمع کر دیے گئے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ یہ الگ بات کہ مضمون نگار بعض مقامات پر الفبائی ترتیب کو قائم نہیں رکھ سکے۔

(۲) یہ ایڈیشن یونیسکو کی جانب سے نزولِ قرآن مجید کی چودہ سوویں سالگرہ کے

مبارک موقع پر اشاعت پذیر ہوا۔

(۳) ترجمہ: تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔ (سورہ طلاق: آیت ۱)

(۴) میرزا ابوالفضل: ان کا اردو ترجمہ قرآن غیر حامل المتن الہ آباد سے 1913ء میں چھپا جس کے اصل نام کے متعلق استفسار کیا گیا تھا۔ بعد ازاں شیخ محمد اکرام (المتوفی 17-1-1973) کے کتب خانہ سے ایک ایسا ہی غیر حامل المتن اردو ترجمہ قرآن مجید دستیاب ہوا جس پر مصنف کا نام علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی درج ہے۔ یہ ترجمہ 1921ء میں بار سوم مطبع حکیم برہم واقع گورکھپور سے طبع ہوا۔ دونوں ترجموں کے ناموں میں یکسانیت اور دونوں نسخوں کا بلا متن عربی شائع ہونا اس بات کا غماز ہے کہ یہ ایک ہی مصنف ہے جس کا ایک جگہ پورا نام علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی چھپا ہے جب کہ دوسری جگہ میرزا ابوالفضل۔ یہ صاحب اردو کے بہت بڑے ادیب تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف بھی جو تاریخ، فلسفہ، سیاست اور قانون جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اردو، فارسی کا ایک انتخاب 'نشتر سخن' بھی ان سے یادگار ہے۔ یہ غالباً پہلے شخص ہیں جو قرآن مجید کا اردو ترجمہ بلا متن عربی کے شائع کرنے کی بدعت کے مرتکب ہوئے۔ بعد ازاں بعض دیگر غیر ذمہ دار ناشرانِ قرآن نے بھی اس بدعت کو اپنایا اور ''نور ہدایت'' و ''روشن چراغ'' وغیرہ ناموں سے اردو تراجم شائع ہونا شروع ہو گئے۔ اب حکومتِ پاکستان نے بلا متن اردو ترجموں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی ہے۔ بلا متن ترجمہ قرآن مجید کے مفاسد پر ملاحظہ ہو مضمون از علامہ شمس الحق افغانی مطبوعہ ماہنامہ 'الحق' اکوڑہ خٹک برائے مئی 1966ء۔

(۵) ''ان شاء اللہ'' جملہ شرطیہ ہے بمعنی اگر خدا نے چاہا۔ یہ عربی ترکیب ہے اور اسی طرح مفرد حروف میں لکھنا چاہیے۔ ہمارے اکثر اہل علم اسے مرکب صورت میں (انشاء) کتابت کرتے ہیں جس کے معنی مضمون نویسی کے ہیں اور یہ بڑی

بیہودگی ہے کہ ہم لاعلمی میں قرآنی رسم الخط سے انحراف کر کے 'ان شاء' کو 'انشاء' تحریر کر دیتے ہیں جب کہ دونوں کے معانی میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ یاد رہے کہ سہ ماہی ارمغان کراچی کے مشترکہ شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۶ء میں جناب حمید اللہ صاحب کے 130 خطوط بنام مظہر ممتاز قریشی صاحب شائع ہوئے ہیں جن میں لفظ ان شاء اللہ کو ہر جگہ مرکب صورت میں کمپوز کیا گیا ہے اور یوں پروفیسر مرحوم کے کھاتے میں ناکردہ غلطی ڈال دی گئی ہے۔

(۶) اس مکتوب میں جن 44 نئے ناموں کا اندراج ہے ان میں صرف 17 نئے تھے۔ باقی 27 ناموں کا اندراج مطبوعہ مضمون میں تھا۔ یہ سہو ڈاکٹر صاحب سے اس سبب ہوا کہ میری فہرست الفبائی تھی جب کہ ان کی سنہ وار جیسا کہ انہوں نے اپنے آئندہ مکتوب میں تصریح کی ہے۔

(۷) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی قاموس الکتب (اردو) کی جلد اول مطبوعہ 1961ء میں تراجم و تفاسیر قرآنی کے کوائف درج ہیں۔

(۸) نان پارہ شخص نہیں بلکہ یہ یوپی (ہندوستان) کے ضلع بہرائچ کی ایک ریاست کا نام ہے جس کے نواب نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس نواب کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی مدح میں بہت سے شعراء نے قصائد لکھے اور اعلیحضرت فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ بھی نواب صاحب کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھیں اور انعام و اکرام سے مالا مال ہوں۔ مگر اعلیحضرت کو خدا تعالیٰ نے دولتِ استغنا سے نواز رکھا تھا۔ مال و دولت کا لالچ ان کی چشم کو خیرہ نہ کر سکا۔

تختِ سکندری پر وہ تھوکتے نہیں ہیں
بستر لگا ہوا ہے جن کا تری گلی میں

انہوں نے عمر بھر کبھی کسی 'دنیاد' کی تعریف میں خواہ وہ کتنے ہی بلند مرتبہ پر فائز کیوں نہ ہو اپنے قلم کو ملوث نہیں کیا۔ ان کی شاعری صرف اور صرف مدحت گری پیغمبر کے لیے وقف رہی۔ چنانچہ انہوں نے نواب نانپارہ کی مدح میں قصیدہ تو

کیا لکھنا تھا جواب میں ایک نعت لکھ دی جس کے مقطع میں لفظ نان پارہ کی تقلیب کر کے شعر کی بندش میں جو حسن پیدا کر دیا اس کا جواب نہیں۔ شعر سنیے اور سر دھنیے ۔

کروں مدح اہلِ دول رضاؔ پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

(۹) ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی'' پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ دہلی نے 1944ء میں، دوسری مرتبہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے، جب کہ تیسری مرتبہ اردو اکیڈمی سندھ (کراچی) کی طرف سے 1987ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

(۱۰) اب حافظہ یاوری نہیں کرتا کہ آج سے 35 سال قبل حمید اللہ صاحب کو کیا جواب لکھا تھا۔ بہر حال ظاہر ہے ہم سو سال انگریز کے غلام رہے۔ اس وقت انگریزی ہندسوں کے استعمال کی مجبوری تھی مگر آزادی کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر انگریز ہی کے غلام ہیں۔ یہ المیہ ہے کہ ہم آج تک اردو کو بطور قومی زبان کے اپنا نہیں سکے۔

(۱۱) سیرۃ ابنِ اسحٰق: مراکش کے شہر فاس کے کتب خانہ جامع قرویین سے سیرۃ ابن اسحٰق کے مخطوطہ کی بازیابی کا علم اول اول جناب حسن واصف صاحب عثمانی کے مضمون ''مراکش میں ابن اسحٰق کا رسالہ سیرت دستیاب'' مطبوعہ روزنامہ امروز لاہور مؤرخہ 14 رجنوری 1964ء سے ہوا۔ یہ بات مسلمہ تھی کہ ابن اسحٰق کی سیرۃ ناپید ہو چکی ہے اور اس کا صرف وہی حصہ باقی ہے جو ابن ہشام نے اپنی سیرۃ میں محفوظ کر لیا ہے۔ لہٰذا اس یوسف گم گشتہ کی کنعان واپسی علمی حلقوں میں خوشگوار حیرت کا سبب بنی۔ مزید خوشی کی بات یہ کہ اسے مشہور محقق اور سیرتی لوازمہ کے متخصص جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایڈٹ کر رہے تھے۔ چنانچہ یہ سیرۃ آپ کے بیش قیمت حواشی کے ساتھ معہد الدراسات والابحاث للتعریب رباط (مراکش) سے 1976ء میں بنام سیرۃ ابن اسحٰق المسماۃ بہ کتاب المبتداء والمبعث والمغازی تالیف محمد بن اسحٰق بن یسار (85-151ھ) چھپ گئی۔ اس کا

دوسرا ایڈیشن جمعیت الوقف للخدمات الخیریہ ادارۃ النشر والتوزیع قونیہ ترکیا سے غالباً نئی صدی ہجری کے استقبال کے حوالے سے 1401ھ/1981ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس بازیافتہ سیرتی ارمغان کا اردو ترجمہ مدیر ''نقوش'' جناب طفیل (متوفی 1986-7-5) نے نقوش (رسول نمبر) جلد یازدہم (شمارہ نمبر 130 برائے جنوری 1985) میں پہلی مرتبہ شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا جب کہ اس کے ترجمہ کی سعادت جناب نورالٰہی صاحب ایڈووکیٹ کے حصہ میں آئی۔ راقم نے بھی اردو ترجمہ کے لیے اپنا نسخہ فراہم کر کے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس ترجمہ کو الگ کتابی صورت میں شائع کر کے اس کی فیض رسانی عام کی جائے۔

(۱۲) رسالہ نظام کانپور (ہندوستان) سے نکلتا تھا۔ اس کی مارچ اپریل 1966ء کی مشترکہ اشاعت قرآن نمبر کے لیے مخصوص ہے۔ میں غالباً فراہم نہ کر سکا ہوں گا

(۱۳) ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور کا ماہنامہ۔ اس کے مذکورہ شمارے میں جناب ایم ایس بھٹی صاحب کا مضمون بعنوان ''دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم'' شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ ارسال کر دیا گیا تھا۔

(۱۴) بستہ یعنی پیکٹ جس میں LISTE DES TRADUCTIONS DIR QURAN EN LANGUES EUROPEENNES ''یورپین زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم کی فہرست'' کے آف پرنٹس تھے جو فرانسیسی زبان میں ہیں۔ میں نے اسے تبرکاً سنبھال رکھا ہے اور بمصداق ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم''، اس فہرست سے استفادہ نہ کر سکا۔

(۱۵) 1969ء میں غالب کی صد سالہ برسی عالمی سطح پر منائی گئی۔ اسی سلسلے میں آپ سے استفسار کیا گیا ہوگا۔

(۱۶) اس سے مراد میرا وہ مفصل مضمون ہے جو قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر پر ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور قرآن نمبر کی جلد دوم و سوم برائے 1969-70 میں چھپا۔

(۱۷) ابن الہیثم محمد بن حسن بن ہیثم بصری۔ بہت بڑا عالم طبعیات، بصریات، ریاضی، ہیئت وطب وغیرہ۔ بصرہ میں وزیر رہا۔ کتاب الارصاد کلیہ، کتاب المساقہ، کتاب المناظر، کتاب البصریات سات جلدوں میں اس سے یادگار ہیں۔ اس کے جشن ہزار سالہ کا اہتمام ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ جس کے کرتا دھرتا حکیم محمد سعید (متوفی 17-10-1998) تھے۔ یہ جشن یکم تا 10 رنومبر 1969ء کے عرصہ میں منایا گیا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں سیمینارز کا اہتمام کیا گیا۔ محکمہ ڈاک حکومت پاکستان نے اس موقع پر ایک یادگاری ٹکٹ بھی شائع کیا۔

(۱۸) اس سے مراد غالباً وہ نقشہ ارض القرآن ہے جو سیارہ ڈائجسٹ، لاہور (قرآن نمبر) کی جلدِ دوم کے آخر میں چسپاں کیا گیا ہے۔ راقم کا ذاتی نسخہ جناب مولانا غلام رسول مہر (متوفی 16-11-1971) کے زیر مطالعہ رہا۔ مولانا نے نقشہ میں متعدد ایسے مقامات کی نشاندہی کی ہے جو نقشہ میں غلط دکھائے گئے ہیں۔

(۱۹) محترم جناب محمد طفیل مرحوم مدیر نقوش نے رسول نمبر نکالنا چاہا تو راقم سے بھی اس سلسلہ میں ازرہِ شفقت مشورہ کیا۔ میں نے رسول نمبر کے لیے اردو میں سیرت کی کتابوں کی فہرست سازی اپنے ذمہ لے لی۔ یہ استفسار اسی سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ رسول نمبر کی تیرہ جلدیں چھپ گئیں اور ابھی کام باقی تھا کہ وہ رختِ سفر باندھ کر راہی ملکِ عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے اُٹھ جانے کے بعد میرا کام بھی جہاں تھا وہیں رُک گیا۔

(۲۰) اب ذہن یاوری نہیں کرتا کہ کیا معاملہ زیر بحث تھا جس پر انہیں مفروضہ سے کام لینا پڑا۔

(۲۱) غالباً سقوط ڈھاکا مورخہ 16-12-1971 کی طرف اشارہ ہے۔

(۲۲) مہر یعنی مولانا غلام رسول مہر۔ مشہور صحافی، ادیب، مؤرخ اور محقق، مدیر روزنامہ انقلاب لاہور۔ بیسیوں کتابوں کے مصنف ومترجم۔ سید احمد بریلوی اور ان کی تحریک پر انہوں نے قابل قدر کام کیا۔

(۲۳) ممتاز محقق اور دانشور جناب ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی صاحب سابق ڈائریکٹر جنرل

اردو سائنس بورڈ لاہور نے میرے استفسار پر بتایا کہ: اس فرنگن خاتون کا نام وترے ایوامیرووچ (VITRAY EVA MEYEROVITCH) ہے۔ اس کا فرنچ میں بالِ جبریل کا ترجمہ پیرس سے 1977ء میں طبع ہو چکا ہے۔ اس محترمہ نے بالِ جبریل کے علاوہ علامہ اقبال کی پیامِ مشرق، اسرار و رموز اور RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) کا بھی فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے مولانا رومی کی بعض چیزیں بھی فرانسیسی میں منتقل کیں اور اسلام پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔

(۲۴) مولانا مہر کی بالِ جبریل کی شرح کا نام ''مطالب بالِ جبریل'' ہے جسے کتاب منزل لاہور نے 1956ء میں شائع کیا۔

(۲۵) مرکزی مجلس رضا لاہور جس کے بانی و مؤسس محترم جناب حکیم اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (متوفی 17-11-1999) تھے۔

(۲۶) یہ کتاب انگریزی میں ہے اور نام ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے۔ یہ اسلامی کلچرل سنٹر (پیرس) کی مطبوعات میں سے ہے جو حبیب اینڈ کمپنی کٹل منڈی حیدر آباد دکن سے 1974ء میں شائع ہوئی۔ نقوش کے رسول نمبر کے لیے اس کے اردو ترجمہ کے لیے راقم نے جناب مصنف موصوف سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ یہ اردو ترجمہ نقوش رسول نمبر جلد دوم میں شامل ہے۔ اس کے ترجمہ کا اعزاز جناب نذیر حق صاحب کو حاصل ہوا جو ان دنوں روزنامہ ''مشرق'' لاہور کے چیف نیوز ایڈیٹر تھے۔

(۲۷) یہ کتاب انتظامی پریس حیدر آباد دکن سے تیسری مرتبہ 1364ھ میں اشاعت پذیر ہوئی۔

(۲۸) سیرۃ ابن اسحٰق کا انگریزی ترجمہ بھی حیدر آباد دکن سے طبع ہوا۔

(۲۹) گلیوم (A. GUILLAUME) کا سیرۃ ابن اسحٰق کا انگریزی ترجمہ The Life of Muhammad کے نام سے پاکستان برانچ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

کراچی سے بار چہارم 1974ء میں چھپا۔

(۳۰) مکتوب جیفر بن الجلندی یا جیفر وعبد پسران جلندی (شیوخ عمان) کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی جو ٹیونس میں دستیاب ہوا پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کی اطلاع سے قبل متعارف ہو چکا تھا۔ اس مکتوب گرامی کا عکس پہلے روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 11 رجولائی 1970ء کو چھپا۔ بعدازاں ''قلمدانِ رسالت'' مؤلفہ شمیم الدین احمد مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی (غیر مورخہ) میں بھی اس کا عکس شائع ہوا۔

(۳۱) صحیفہ ہمام بن منبہ (تالیف قبل از ۵۸ھ) کا اصل نام ''الصحیفۃ الصحیحہ'' ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تلمیذ حضرت ابوعقبہ ہمام بن منبہ کو املاء کرایا۔ یہ صحیفہ چوتھی مرتبہ مولوی حبیب اللہ صاحب کے اردو ترجمہ کے ساتھ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن سے ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ دیباچے میں جناب محمد حمید اللہ صاحب نے عہد نبویؐ میں مرتبہ احادیث کے مجموعوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

(۳۲) محترم جناب حمید اللہ صاحب کو ذہول ہوا۔ اردو ترجمہ کی اجازت میں نے مجلہ نقوش کے رسول نمبر کے لیے حاصل کر لی تھی اور یہ اجازت نامہ مدیر رسالہ جناب محمد طفیل صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی بنا پر انہوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کرایا اور نقوش رسول نمبر میں شائع کیا۔ طفیل صاحب ایک ذمہ دار آدمی تھے۔ ان سے اس قسم کی غیر اخلاقی حرکت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جناب حمید اللہ صاحب نے اس کی وضاحت خود بھی اپنے خط نمبر 32 میں کر دی ہے۔

(۳۳) یہ عریضہ ''سیرت ابن اسحٰق'' کے متعلق بعض تصریحات کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

(۳۴) یہ آپ کی انگریزی تصنیف ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے اردو ترجمے کا ذکر ہے جو آپ کو ''وفادارانہ'' معلوم نہیں ہوا۔ اس کا ترجمہ جناب نذیر حق صاحب نے کیا تھا (حاشیہ نمبر 26) انہیں کس مقام کے متعلق شکایت تھی، تصریح نہیں کی گئی۔

(۴۵) ان فضولیات کا پس منظر یہ ہے کہ:

1985ء میں رسول نمبر کے سلسلے میں جن لوگوں کو نقوش ایوارڈ دینے کی کمیٹی نے سفارش کی ان کے نام اور مالیت ایوارڈ اس طرح تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب -/10,000 روپے (سیرۃ ابن اسحٰق پر)

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب -/10,000 روپے

جناب نور الٰہی صاحب (عربی مترجم) -/2,500 روپے

جناب محمود عالم قریشی صاحب (انگریزی مترجم) -/2,500 روپے

محترم جناب حمید اللہ صاحب کو جب اس ایوارڈ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اظہار ناپسندیدگی کیا اور اسے قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ رقم کسی موزوں ادارے کو دے دی جائے۔ اس انعام کی صدائے بازگشت مکتوب نمبر 30 اور نمبر 33 کے علاوہ مکتوب نمبر 39 میں بھی سنائی دیتی ہے جو مدیر نقوش جناب محمد طفیل کے نام ہے۔ جی چاہتا ہے کہ طفیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو جو جوابی مکتوب لکھا اُسے قارئین کرام کی ضیافت طبع اور ان کے منفرد اندازِ تحریر سے روشناسی کے لیے یہاں درج کر دیا جائے:

محترم المقام۔ سلام مسنون!

آپ کا مؤرخہ 10 رشعبان 1406ھ کا خط ملا۔ شکریہ!

ہمیں انعام کے سلسلے میں آپ کی طبیعت اور سوچ کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ "اگر ڈاکٹر صاحب انعام کی رقم کو قبول نہ کریں تو دوسرے سیرت نگاروں اور مترجمین میں بانٹ دی جائے"۔ (ہر چند کہ آپ نے انعام کی تقسیم کا معاملہ ہم پر چھوڑا ہے اس کے باوجود میرا فرض ہے کہ ایک بار آپ کو کمیٹی کے فیصلے سے بھی مطلع کروں۔ اب جیسے حکم فرمائیں)۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو قناعت کی بیش بہا دولت سے نواز رکھا ہے۔ ایسی بڑائی تو مجھے کسی دوسرے میں نظر نہ آئی۔ جزاک اللہ۔

نیاز مند

محمد طفیل (کنوینر نقوش ایوارڈ کمیٹی)

اس کے بعد کیا ہوا۔ سنیے۔ ایوارڈ لینے والے تو دستبردار ہو ہی چکے تھے۔ دینے والے بھی مورخہ 5 رجولائی 1986ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ادھر رسول نمبر سے فارغ.........ادھر دنیا سے فارغ۔

خدا کا شکر کہ یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

بعد میں طفیل صاحب کے خلف الرشید جناب جاوید طفیل (مدیر نقوش) نے مذکورہ رقم کمیٹی کے فیصلے کے مطابق بقیہ تینوں انعام یافتگان میں ان کی انعامی رقم کے تناسب سے تقسیم کر دی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

(۳۶) یہ تصریحات بھی سیرۃ ابن اسحٰق سے متعلق ہیں۔ جن صاحب کے پاس اس کتاب کا نسخہ موجود ہو، وہ اپنے نسخہ میں اس کے مطابق تصحیح کر سکتے ہیں۔

(۳۷) غالباً اس سے مراد ''نقوش'' کے رسول نمبر ہیں مگر ان میں فہرست مضامین تو موجود ہے۔ عقدہ کھلا نہیں۔

(۳۸) یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم۔

(۳۹) ثنیۃ الوداع۔ ایک روایت کے مطابق ہجرت مدینہ منورہ کے وقت جب کہ دوسری روایت کے مطابق جنگ تبوک سے واپسی پر انصار کی بچیوں نے جو خیر مقدمی ترانہ طلع البدر علینا من ثنیۃ الوداع گایا یا اس میں مقام ثنیۃ الوداع کے محل وقوع کے متعلق دریافت کیا تھا۔ آپ نے اس نام کے دو مقامات کی تصریح کی جب کہ ''معجم البلدان'' کے اردو ترجمہ از ڈاکٹر غلام جیلانی برق مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور 1972ء میں ایک مقام کا ذکر ہے۔ اس سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی سیرتی معلومات پر گرفت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴۰) مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے تخلیق نورِ محمدی کی ایک حدیث اوّل ما خلق اللہ نوری ...... کا ذکر اکثر سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے مگر جب مصنف عبدالرزاق چھپ کر آئی تو بعض اہل علم سے معلوم ہوا کہ اس میں مذکورہ حدیث نہیں ہے۔ یہ استفسار اسی سلسلے میں کیا گیا تھا۔

(۴۱) یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے۔ نہ میں اس سلسلے میں اسلام آباد گیا اور نہ ہی نور محمدی کی تخلیق کے مسئلہ کے متعلق کوئی کوشش کی۔ عین ممکن ہے کسی اور صاحب نے بھی اسی قسم کا سوال کیا ہو اور اس قدر مشترک کے سبب ڈاکٹر صاحب کو اشتباہ ہوا ہو۔

(۴۲) محترم جناب حمید اللہ صاحب میاں محمد نواز شریف (معزول وزیر اعظم پاکستان) کی دعوت پر مورخہ 26 / اپریل 1992ء کو پاکستان تشریف لائے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال اکیڈمی والوں نے 30 / اپریل کو الحمرا ہال نمبر 2 شاہراہ قائد اعظم لاہور میں ان کا ایک لیکچر رکھ دیا جس کا موضوع تھا ''سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام'' اس تقریب کی نظامت کے فرائض جناب سہیل عمر صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی (حال ڈائریکٹر) نے انجام دیے۔ حمید اللہ صاحب کی تقریر اور بعد میں سوال و جواب کا دورانیہ کم و بیش اڑھائی گھنٹہ پر محیط تھا۔ اختتام تقریب پر میں نے ان کی مرتبہ ''سیرت ابن اسحٰق'' کا نسخہ برائے دستخط پیش کیا تو فرمانے لگے ''کیا یہ بدعت نہیں ہے؟'' میرا جواب تھا ''میرے عقیدہ میں نہیں ہے'' جواب اسی کی بازگشت ہے۔ آپ کی یہ تقریر بعد ازاں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ماہنامہ ''المعارف'' کے جولائی 1992ء اور اگست ستمبر 1992ء (مشترکہ) کے شماروں میں مع سوال و جواب کے چھپ گئی۔

(۴۳) محترم جناب حمید اللہ صاحب نے میری درخواست اور شوق کے پیش نظر از رہِ شفقت اپنے فرانسیسی ترجمہ ''معانی القرآن الکریم'' (LE SAINT CORAN) مطبوعہ امانا کارپوریشن 1989ء کے اندر ایک چٹ رکھی تھی، یہ اسی کی عبارت ہے۔ اس قرآن مجید کا عربی متن شاہ فہد کمپلیکس مدینہ منورہ کے مطبوعہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ جس کا ہر صفحہ اختتام آیت پر ختم ہوتا ہے اور فرنچ ترجمہ مقابل کے صفحہ پر دیا گیا ہے۔

(۴۴) یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت پاک کے متعلق استفسار تھا کہ مصر کے مشہور ماہر فلکیات محمود پاشا ۹ / ربیع الاول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت مانتے ہیں (کراچی میونسپل ریویو۔ سیرت نمبر۔ نومبر 1958ء) جواباً

آپ نے اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کر دیا جس میں ۹ ربیع الاول کا مطلق ذکر نہیں۔

(۴۵) ان دنوں (1992ء کے اوائل میں) یہ لفظ نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ علمائے کرام کا ایک طبقہ اپنا بنیاد پرست ہونا فخریہ بیان کرتا تھا جب کہ دوسرا طبقہ بنیاد پرست کہلوانے کو اپنی کسر شان سمجھتا اور علی الاعلان بنیاد پرست ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ اس گومگو کے عالم میں راقم نے اس لفظ کے پس منظر اور درست استعمال کے لیے اسلام کے مایہ ناز مفکر و سکالر جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے جواباً جو کچھ لکھا وہ ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تصریح کی ہمیں چاہئے کہ اپنے آپ کو ''بنیاد پرست'' کے بجائے ''بنیاد پسند'' کہلوائیں اور کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہ کریں۔ یہی قرین صواب اور یہی فلاح و فوز کی راہ ہے۔ راقم نے افادۂ عوام کی خاطر مذکورہ مکتوب بعض رسائل و اخبارات کو بغرضِ اشاعت ارسال کر دیا تھا۔ ان میں سے جن جرائد نے اسے پذیرائی بخشی، ان کے کوائف درج ذیل ہیں:

۱۔	ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور	اکتوبر 1994ء
۲۔	ماہنامہ الرشید، لاہور	اکتوبر 1994ء
۳۔	ماہنامہ کنز الایمان، لاہور (مع عکس مکتوب)	اکتوبر 1994ء
۴۔	ماہنامہ السعید، ملتان	یکم دسمبر 1994ء
۵۔	روزنامہ پاکستان، لاہور	۲۸ ستمبر 1994ء

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

بیسویں صدی کے ممتاز ترین محقق

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ مرحوم کی شخصیت کوئی ایسی غیر معروف نہیں کہ ان کے بارے میں ضروری معلومات بتانے یا کسی رسمی تعارفی گفتگو کی ضرورت پیش آئے۔ اسلامی علوم کا ہر سنجیدہ طالبِ علم اجمالی طور پر یہ بات جانتا ہے کہ اُن کے کام کی نوعیت کیا تھی اور وہ دنیائے اسلام کے کتنے بڑے مفکر اور کتنے بڑے مصنف تھے۔ لیکن یہ بات اُن کے خاص قارئین کے علاوہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وسعتِ نظر، تعمق علمی اور اپنی دلچسپیوں کے دائرے کی ہمہ گیری اور تنوع کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا کیا مقام تھا۔ شاید بیسویں صدی کے کسی اور مصنف یا اسلامی اسکالر میں وہ وسعت علمی اور گہرائی نہیں پائی جاتی جو ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ میں پائی جاتی تھی۔ اسلامی علوم و فنون کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا رہا ہو گا جس میں مرحوم ڈاکٹر صاحب نے انتہائی فاضلانہ، عالمانہ اور انتہائی عمیق تحقیق کے نتائج دنیائے اسلام کے سامنے پیش نہ کیے ہوں۔

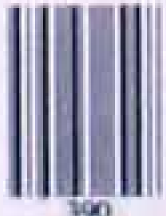
ڈاکٹر محمود احمد غازی



بیکن بکس

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030
• گلگشت کالونی، ملتان فون: 061-6520790-6520791

Info@beaconbooks.com.pk
web: www.beaconbooks.com.pk



ISBN 969534018-0
9789695340189
390